for Fran
with lots of ♡
Satya
31·01·2009

کنز المطالب

شرح

دیوان غالب

مصنفہ
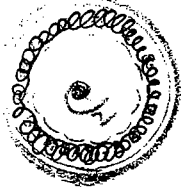
پیرِ خمخانۂ سخن حضرت مولانا ابوالحسن ناطق گلاؤٹھوی

یکے از مطبوعات مکتبہ دین و ادب۔ کچّا احاطہ لکھنؤ

مصنّف .. .. .. مولانا سیّد ابوالحسن ناطق گلاؤٹھوی
مرتّب .. .. .. بابو عبدالحلیم انصاری ناگپوری
ناشر .. .. .. مکتبہ دین و ادب۔ کچّا احاطہ۔ لکھنؤ
بہ اہتمام .. .. .. ساجد صدیقی ★ والی آسی
کتابت .. .. .. محمد نذیر انصاری الہ آبادی
طابع .. .. .. تنویر پریس۔ لکھنؤ
پہلی بار .. .. .. فروری ۱۹۶۸ء
قیمت .. .. .. بارہ روپئے پچاس پیسے (علاوہ ڈاک خرچ)

سول ایجنٹ

عبدالباری آسی اکاڈمی۔ نمبر ۱۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ

محسن علم و ادب عالیجناب مقبول احمد صاحب لاری

انتساب

محسن علم و ادب

عالیجناب مقبول احمد صاحب لاری کے نام

جو غالب کی اس دعا کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ ع

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ناطق گلاؤٹھوی

حرفِ آغاز

غالب بڑا وسیع المشرب، بڑا خود شناس و خود آگاہ شاعر تھا اور فکر و احساس کو چونکا دینے والی ایک ایسی شاعری کا موجد ہوا، جس سے دنیا واقف نہیں تھی۔ غالب کا شمار ایسی مافوق الفطرت ہستیوں میں ہوتا ہے جو وقت سے پہلے پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔ اگر اس کے عہد نے اسے نہیں سمجھا اور اس کی عظمت کا احترام نہیں کیا تو حیرت کی بات نہیں ہے مگر آج یہ جرأت کس میں ہو کہ غالب کی آفاقی شہرت و مقبولیت کا تاج اس سے چھین لے اور کس کے منہ میں زبان ہے جو کہے کہ غالب مستقبل کا شاعر نہیں تھا اور اس کی یہ الہامی پیشین گوئی پوری نہیں ہوئی۔

شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

اردو زبان کے شعرا کی طویل فہرست میں غالب کے علاوہ دوسرا ایسا کوئی شاعر دکھائی نہیں دیتا جس کی تہہ دار شخصیت اور جس کی وسیع کائناتی شاعری کے محاسن، معنی آفرینی اور ندرت تعبیر و خیال پر ارباب فکر و بصیرت نے اتنے مختلف زاویوں سے گفتگو کے لئے اپنے قلم کو جنبش دی ہو ــــ غالب کے جو ۱۸۴۱ء سے اب تک مختلف رنگ و روپ میں تزئین و آرائش اور کتابت و طباعت کی نفاست و پاکیزگی کے ساتھ سیکڑوں بار شائع ہو چکا ہے۔ گفتگو شرح دیوان غالب سے متعلق کیجئے اور دیکھئے کہ کلام غالب کی جتنی شرحیں آج تک لکھی گئی ہیں ان کے مقابلے میں کسی دوسرے شاعر کی دو چار شرحیں بھی لکھی گئی ہیں یا نہیں؟

میرے ذخیرہ غالبیات میں دیوان غالب کی تبتیس ۳۲ شرحیں موجود ہیں ان میں وہ شرحیں شامل نہیں ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں یا نایاب ہیں یا جن کا ہمیں علم نہیں ہے۔ حساب میں ان کو بھی رکھئے تو تعداد پچاس سے اوپر پہنچ جائے گی ــــ "غالب اِن سائکلو پیڈیا" جو زیر ترتیب ہے اس کا ایک باب میں نے "شرح کلام غالب" اور "شارحین کلام غالب" کے لئے مخصوص کر دیا ہے اور شرحوں کے ساتھ ان کے شارحین کی فکر رسا پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ دیوان غالب کی شرحیں اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی لکھی گئی ہیں۔ ہندی میں جو شرحیں چھپی ہیں اُن میں بیڈھب بنارسی کی شرح "غالب کی کویتا" تخلص کی مناسبت سے "بیڈھب" بھی ہے اور "کڈھب" بھی۔ اسی طرح کی مہمل اور گمراہ کن شرحیں اردو میں بھی چھپی ہیں ــــ آپ چاہیں تو پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی کی شرح کے لئے غالب اس شعر کو عنوان بنا سکتے ہیں۔

خامہ انگشت بہ دنداں کہ اِسے کیا لکھئے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اِسے کیا کہئے

بعض شرحیں ایسی بھی چھپی ہیں، جن میں دماغی ورزشوں کے کرتب دکھائے گئے ہیں اور ایک ایک شعر کی سات سات تعبیریں پیش کر کے خواب پریشاں کی کیفیت پیدا کر دی گئی ہیں۔ بعض شارحین نے تو غالب کے کلام پر اصلاح بھی دی ہے اور شرح کے پردے میں غالب سے زیادہ اپنی ذات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ حال ہی میں ایک شرح "روح المطالب فی شرح دیوان غالب" لاہور سے چھپ کر آئی ہے جو سید اولاد حسین شاداں بلگرامی کی فکر و کاوش کی یادگار ہے۔ ایک شرح انگریزی میں اردو اور انگریزی کے ادیب شیخ بدرالزماں علیگ لکھنؤ کے پُرانے ایڈوکیٹ نے لکھی ہے اور پاکیزہ ترجمہ کے ساتھ اس کا عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے جو خاصے کی چیز ہے۔

پیش نظر شرح "کنز المطالب شرح دیوان غالب" مولانا سید ابوالحسن ناطق گلاؤٹھوی کی تصنیف ہے۔ مولانا ناطق، مرزا داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں بڑے صاحب فن استاد مانے جاتے ہیں، جن کی شہرت کے لئے اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ مولانا عبدالباری آسی جیسے فاضل نے ان سے مشورہ سخن کیا تھا۔ انھیں مولانا عبدالباری آسی کے بیٹے والی آسی ہیں جنھوں نے اپنے رفیق کار ساجد صدیقی کی شرکت میں "مکتبہ دین و ادب" قائم کیا ہے اور تصنیف و تالیف کی قابل قدر خدمتیں انجام دے رہے ہیں، اب وہ اسی مکتبہ سے اسی مہینے میں "کنز المطالب شرح دیوان غالب" شائع کر رہے ہیں جس کو غالب کا مہینہ قرار دیا گیا ہے اور ملک و بیرون ملک میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ یوم غالب خصوصیت سے غالب کی صد سالہ برسی کے طور پر منایا جا رہا ہے۔

ساجد صدیقی اور والی آسی مستحق مبارکباد ہیں کہ شخصیت پرستی اور مصلحت بینی کے اس دور میں ان لوگوں نے پوری ادبی دیانت کے ساتھ اس شرح کا انتساب میر و غالب کے قدرشناس علم و ادب کے محسن، مخیر و خوش مذاق رئیس جناب مقبول احمد صاحب لاری کے نام کے ساتھ کیا ہے جن کی علمی و ادبی خدمات کا ملک بھر میں چرچا ہے۔

مکتبہ دین و ادب کا یہ ادبی تحفہ لاری صاحب کی خدمت میں ان کے شاعر و ادیب فرزند مظفر احمد لاری۔ ایم۔ اے کی خانہ آبادی کے مسرت بخش موقع پر یوسف پور میں پیش کیا جا رہا ہے جس کو ملک کی آزادی کے ایک ممتاز رہنما ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے۔

مجھے اُمید ہے یہ مفید شرح جو غالبیات میں ایک قابل قدر اضافہ ہے دیوان غالب ہی کی طرح مقبول ہو گی اور ساجد صدیقی، والی آسی کی محنتیں سوارت ہوں گی۔

لکھنؤ۔ ۱۵ فروری ۱۹۶۸ء

خیر بہوروی
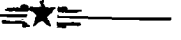
مراطبع زیں نوع خواہاں نہ بود

مجھے اس شرح کے متعلق عرض حال کے طور پر یہی لکھنا ہے کہ ناگپور شہر میں داودی جماعت کے ایک بزرگ بھائی حسین علی نامی رہتے تھے جو کئی سال تک جماعت کے سکریٹری بھی رہے یہ بزرگ صاحب علم اور ادب نواز تھے جو مجھ سے کافی محبت کرتے تھے ـــــ ایک بار یہ نظم طباطبائی کی تصنیف کردہ شرح دیوان غالب لے کر میرے پاس تشریف لائے اور کہا کہ دیکھئے یہ مرزا غالب ـــــ کے دیوان کی کتنی اچھی شرح جس سے غالب کا کلام بہت آسان ہوگیا۔ میں نے اُن سے کتاب لے لی اور کئی دن تک اسے اپنے مطالعے میں رکھا تو مجھے نظر آیا کہ اگرچہ مصنف نے بڑی قابلیت کے ساتھ شرح لکھی ہے لیکن کہیں کہیں کچھ زیادتی سے بھی کام لیا ہے۔ اس بات کا میں نے حسین علی صاحب سے ذکر کیا تو اُنھوں نے کہا کہ میرا مقصد اس کتاب کو پیش کرنے سے یہی تھا کہ غالب کے ساتھ طباطبائی صاحب نے جو ناانصافی کی ہے اس پر آپ کچھ لکھیں۔ اس وقت مجھے بھی یہی خیال ہوا کہ اُن کے حکم کی تعمیل کروں لیکن بعد میں مناسب یہی سمجھا کہ پورے دیوان کی شرح لکھ ڈالوں اور طباطبائی صاحب نے جو کچھ زیادتیاں کی ہیں ان کے جواب بھی دیدوں جس میں طباطبائی صاحب کا ادب بھی ملحوظ رہے چنانچہ میں نے قلم برداشتہ پورے دیوان کی شرح لکھ ڈالی اور جہاں طباطبائی صاحب کی نگارشات کے خلاف لکھا وہاں اس بات کا اشارہ بھی نہیں کیا کہ انھوں نے اس کے متعلق کیا لکھا ہے جب یہ کتاب مکمل ہوگئی تو میرا میرٹھ جانا ہوا، جہاں شریف خاں صاحب آزاد اڈیٹر "جلوۂ یار" سے میرے گہرے دوستانہ روابط تھے اور جب میں نے اُن سے کہا تو انھوں نے فرمایا کہ آپ یہ شرح ہمیں دیدیجئے اس کی شمولیت سے "جلوۂ یار" کی اشاعت بڑھ جائے گی اور ہمیں فائدہ ہوگا۔ میں نے اُن کی یہ بات منظور کر لی اور بالاقساط انھیں شرح بھیجنا شروع کردی جسے وہ مدت تک شائع کرتے رہے۔

چنانچہ "جلوۂ یار" میں یہ شرح "ر" کی ردیف تک ۱۹۲۶ء تک شائع ہو چکی ہے۔ اس کے بعد "جلوۂ یار" آزاد صاحب کی ناسازیٔ طبع کی بدولت بند ہوگیا اور ناظرین کرام کے براہ راست میرے پاس خطوط آنا شروع ہوگئے کہ اب اس شرح کو میں کتابی صورت میں چھپوا دوں۔ ان کے لکھنے والوں میں حضرت اطہر ہاپوڑی مرحوم کی شخصیت خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے ـــــ اسی دوران مولانا عبدالباری صاحب آسی (مرحوم) ناگپور تشریف لائے جو میرے عزیز بھی تھے دوست بھی تھے اور اگرچہ وہ خود مجھ سے بہت زیادہ قابل تھے لیکن خود کو میرا شاگرد بتاتے تھے ان سے جب اس شرح کا ذکر آیا تو اُنھوں نے کہا کہ میں نے خود ایک شرح دیوان غالب مرتب کر کے لکھنؤ میں "صدیق بک ڈپو" کو اشاعت کے لئے دیدی ہے جس میں طباطبائی صاحب سے بھی جگہ جگہ بحث کی ہے۔ اس لئے میرا خیال تو یہ ہے کہ اب یہ شرح شائع ہو چکی اس پر بھی اگر آپ اسے چھپوانا چاہیں تو کتاب میں فن کا اضافہ کر دیجئے کہ اس سے دوسری ہی صورت پیدا ہو جائے گی۔ ان کی تعمیل ارشاد میں جب میں نے شرح کو دوبارہ لکھنے کا ارادہ کیا تو نظر آیا کہ ملک میں شرح دیوان غالب لکھنے کی اُپج عام ہوگئی ہے اور ہر کس و ناکس شرح دیوان غالب لکھ کر چھپوا رہا ہے جس میں عام طور پر یہی دیکھا کہ ہر صاحب نے طباطبائی کی مکھی پر مکھی بٹھائی ہے۔ تو میں نے اُس وقت لکھنا مناسب نہیں سمجھا۔

مولوی عبدالحق صاحب (مرحوم) جو اُس وقت انجمن ترقی اردو کے کرتا دھرتا تھے۔ جب ۱۹۴۰ء میں ناگپور تشریف لائے اور اُن سے شرح کا ذکر ہوا تو تاکید کر گئے کہ کتاب کو مکمل کر کے بھیج دو ہم اسے انجمن سے شائع کرائیں گے۔ جب میں نے اُن کے حکم پر کتاب مکمل کر کے اُن کے پاس بھیج دی تو یہ وہاں جا کر کھٹائی میں پڑ گئی۔ اور جب اس کے متعلق میں نے مولوی عبدالحق صاحب کو لکھا تو اُنھوں نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا اسی دوران میں مولانا اسرار احمد کریوی نے مجھے بتایا کہ مولوی عبدالحق صاحب کے منظور نظر کوئی ہاشمی صاحب ہیں اُنھوں نے کتاب کو دبا رکھا ہے، تو جا کر اُن سے مل لے تو کتاب شائع ہو جائے گی۔ میں نے جواب دیا کہ یہ کام مجھ سے نہ ہو سکے گا اس لئے مولوی صاحب کو لکھ دیجئے کہ کتاب فوراً مجھے واپس بھیج دیں۔ چنانچہ کوئی چھ مہینے کے بعد کتاب مجھے واپس مل گئی یہی وجہ تھی اب تک پڑی رہی۔ اس پر میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اب یہ کتاب کسی کو بغرض اشاعت نہیں دوں گا۔ لیکن اسی سال اپریل کے مہینے میں عزیزم والی آسی صاحب

کے شریک کار مولانا ساجد صدیقی لکھنوی آل انڈیا ریڈیو ناگپور کے مشاعرہ میں تشریف لائے اور اُنھوں نے شرح ذکر کیا تو میں نے جو حال تھا اُنھیں بتا دیا۔ اُنھوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ اس شرح کو غالب کی صد سالہ برسی کے موقعے پر بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کریں گے اس لئے میں نے کتاب اُن کے حوالے کر دی۔ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے اور ناقدین کرام اس پر کیا لے دے مچاتے ہیں کہ میں نے اس کتاب میں کہیں کہیں اہل ملک کی ادبی گم راہ روی پر کچھ سخت الفاظ بھی لکھ دیئے ہیں جس سے کافی ناراضگی پیدا ہو سکتی ہے۔ بہر حال جو صاحب بھی معقولیت کے ساتھ اس پر کچھ لکھیں گے میں کوشش کروں گا کہ ان کے جوابات دوں۔ اور بس!

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں اس موقع پر اپنے عزیز شاگرد ڈاکٹر ممتاز احمد خاں خوشتر کھنڈوی یا ابو عبد الحلیم انصاری نیز لکھنو کے خوش مذاق رئیس جناب مقبول احمد صاحب لاری کا شکریہ نہ ادا کروں کہ جنھوں نے طرح طرح سے اس کتاب کی اشاعت کے لئے امداد فرمائی ہے۔ خدا ان لوگوں کی کوششوں کو کامیاب فرمائے۔

ناچیز ناطق

لشکری باغ۔ ناگپور ۲
۱۳ر جون ۱۹۶۵ء
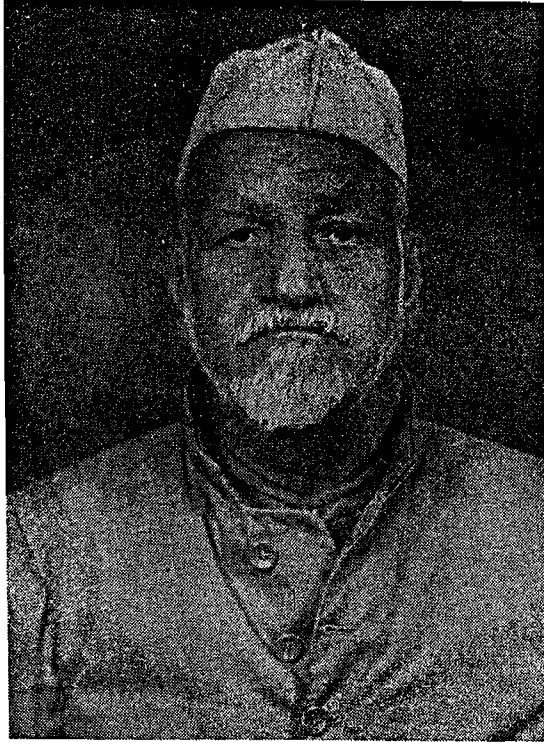
حضرت مولانا سید ابو الحسن ناطق گلاؤٹھوی

لب

مرزا غالب کی عکسی تصویر

جس کے چند ماہ بعد ان کا انتقال ہو گیا

عطیہ مولانا خیر بہوروی صدر کل ہند غالب اکاڈمی

کنز المطالب
شرح
دیوانِ غالب

مولانا ابو الحسن ناطق گلاوٹھوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

نقشِ ہستی اپنے مصور یعنی صانع کی اس شوخ نگاری کا شاکی ہے کہ اس نے میری ہر تصویر کو کاغذی پیراہن پہنایا یعنی بے حقیقت بنایا اس میں جو بیانِ استفسار ہے اُسے طنزیہ لیا جائے اور صانع قدرت مخاطب مانا جائے تو حسن بیاں پیدا ہوتا ہے ؎

گیا حسن خوبانِ دلخواہ کا　　ہمیشہ رہے نام اللہ کا

(ناطق) ثباتِ نقشِ ہستی دیکھکر تحریر ہنستی ہے　　طرب آمادہ تمثال پر تصویر ہنستی ہے

خود مصنف نے اِس شعر کی یوں تشریح کی ہے کہ تصویر چونکہ کاغذ پر ہوتی ہے اس لئے اسے فریادی کہا کیونکہ ولایت ایران میں فریادی کاغذی پیراہن پہن کر عدالت میں جاتے تھے۔ مطلب یہ کہ چونکہ ہستی موجب ملال و آزار ہے اِس لئے تصویر بھی اپنے صانع کی بہ زبانِ حال شکایت کرتی ہے کہ مجھے بنا کر کیوں مبتلائے رنجِ ہستی کیا۔ مرزا کے بیان کردہ مطلب پر لوگوں کا یہ اعتراض کہ ایران میں ایسا رواج ہونے کا ثبوت نہیں ملتا اس لئے اسے مہمل ٹھہراتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا ثبوت اگر نہ بھی ہو تو شعر کو مہمل نہیں کہا جا سکتا کیونکہ کاغذی پیراہن کی اصطلاح کا وجود بمعنی فریادی ایران کی شاعری میں موجود ہے مثلاً ؎

(کلیم کاشانی) کاغذی جامہ بپوشید و بدرگاہ آمد　　زادۂ خاطرِ من تا بدہی دادِ مرا

خود مصنف نے بھی ایک اور شعر اسی اصطلاح کا لکھا ہے جو اگرچہ اس دیوان میں نہیں آیا مگر نسخہ حمیدیہ اور مولانا آسی کے غیر مروجہ دیوانِ غالب میں موجود ہے ؎

(غالب) تیرے بیمار پہ ہیں فریادی وہ جو کاغذ میں دوا باندھتے ہیں

مومن خاں کے دیوان میں بھی یہ شعر موجود ہے ؎

(مومن) تظلّم فرقِ معنیٰ کے سبب تھا لباس کاغذی بے وجہ کب تھا

اس سے معلوم ہوگیا کہ اگر یہ امر واقعہ بھی نہیں تو تخییلِ شعر میں ضرور داخل ہے ایسی حالت میں اگر کوئی خیال غلط واقعہ سے بھی متعلق ہو تو شاعر پر اس کی ذمہ داری نہیں آتی مثلاً اگر آج محلِ لیلیٰ اور ملاقاتِ مجنوں کے واقعہ کو غلط ثابت کر دیا جائے تو معترضینِ غالب خود بھی اس پر آمادہ نہ ہوں گے کہ اِس مضمون کے تمام اشعار کو جواب تک لکھے گئے ہیں مہمل قرار دیدیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فنِ سخن میں بنیادِ تکمیل ہمیشہ واقعاتِ مشہورہ پر ہوتی ہے چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں۔

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

شبِ تنہائی میں زندگی ایک بلائے جاں ہوجاتی ہے جبکہ سخت جانی مرنے بھی نہیں دیتی۔ اس کی بدولت جو اضطراب لاحقِ حال ہوتا ہے اس کی مصیبت کیا بتاؤں کہ میرے لئے شام سے صبح کرنا ایسا ایک کارِ صعب ہوجاتا ہے جیسا کہ جوئے شیر کو کھود کر لانا۔ یہ فرہاد کے مشہور کارنامہ کی طرف اشارہ ہے جو ناممکن سمجھ کر اس کو بتایا گیا تھا۔

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہئے

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

دمِ شمشیر تلوار کی دھار جس کا شمشیر سے باہر ہونا ظاہر ہے دم بمعنی سانس اور دھار لفظِ مشترک ہے جس سے شاعر نے دونوں معنی کا فائدہ اُٹھایا کہ دم کو سینہ کے اندر رہنا چاہئے مگر یہاں باہر ہے اور اسی سے مضمون پیدا کیا ہے کہ یہ میرے شوقِ قتل کی کششِ بے اختیار کا قابلِ دید نتیجہ ہے کہ دمِ شمشیر اس کے سینہ سے کھینچ کر باہر نکل آیا یعنی تلوار کا سانس اس کے سینہ میں نہیں سماتا گویا یہاں ضمناً اردو کے اس محاورہ کو بھی لکھ دیا ہے کہ جب کوئی شخص کہیں سے بیتابانہ دوڑ کر آتا ہے تو اُس وقت اس کے تنفس کی جو حالت ہوتی ہے اس کے لئے بولا جاتا ہے کہ سانس سینہ میں نہیں سماتا یہاں مصنف نے

اپنے کششِ شوق کے اثر سے دمِ شمشیر میں یہ حالت پیدا کر دی۔

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے

مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

عنقا اِک خیالی جانور کا نام جس کا کہیں وجود نہیں۔ کہتے ہیں آگہی یعنی فہم و فراست جس قدر چاہے دامِ شنیدن کو بچھائے میرے عالمِ تقریر کا مدعا عنقا ہے جو دامِ وہم و گمان کی گرفت میں نہیں آسکتا یعنی اہلِ فہم سُن کر لاکھ سمجھنے کی کوشش کریں مگر میری بات کو سمجھ نہیں سکتے۔ اس مضمون کو مصنف نے دوسرے ایک انداز سے حُسنِ بیان کیساتھ یوں نظم کیا ہے۔

(غالب) گر خامشی سے فائدہ اخفاءِ حال ہے خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

ممکن ہے کہ مصنف نے یہ شعر ان لوگوں کے لیے طنزاً لکھا ہو جو ان کے کلام کو مہمل بتایا کرتے تھے کیونکہ اس مضمون سے اس کے سوا کوئی بات پیدا نہیں ہوتی کہ میری تقریر کا مطلب عنقا کی طرح معدوم ہے نتیجہ آپ ہی آپ نکل آیا کہ اشعار مہمل ہیں یا یہ کہ مطالب کا وجودِ موہوم صرف میرے ذہن میں ہے جو کوئی حُسنِ کلام نہیں۔ مصنف کی مراد اس سے یہ بھی ہوسکتی ہے کہ میرا بیان عام فہم نہیں لیکن لفظ "آگہی" اس کے منافی ہوجاتا ہے مگر ممکن ہے کہ اس سے بھی آگاہی اہلِ زمانہ پر طنز کیا ہو۔ شعر کی خوبی تو اس میں ہے کہ الفاظ اور مطلب ایک دوسرے سے پوری مطابقت رکھتے ہوں تو "حشو" کہلاتے ہیں اور الفاظ سے خیال پورا نہ ہو تو شعر چیستاں یا مہمل ہوجاتا ہے۔ اگرچہ کمتر ہی سہی مگر مرزا غالب کے کلام میں بھی دیگر شعرا کی طرح یہ دونوں باتیں موجود ہیں مثلاً

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

اس کی تشریح خود مصنف نے یہ کی ہے کہ تیرا ملنا اگر آسان نہیں تو سہل ہے کیونکہ میں صدمۂ فراق کو برداشت کرلوں گا لیکن دشواری یہ ہے کہ کبھی تو آسانی سے مِل بھی جاتا ہے اس طرح اگر دشمن کو مِل گیا تو صدمۂ رشکِ عدو میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوجائے گا۔

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا

گو اس شعر کے قوافی میں بہت سے استعارات موجود ہیں جن سے حُسنِ بیان کو مدد پہونچتی لیکن ہیں دونوں کچھ حشو ہی سے اور دوسری ردیف بھی بیکار سی ہے۔

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرپا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

آتش زیرپا بے چین مضطرب موئے آتش دیدہ کی شکل راکھ ہو کر حلقہ کی جیسی بن جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ اسیری میرے لئے مانعِ وحشت نہیں کیونکہ میری گرمیٔ رفتار کے مقابلہ میں حلقۂ زنجیر موئے آتش دیدہ کی طرح بے حقیقت ہے۔

(ناطق) رہے گی ناکش سرگرمِ جولانِ جنوں ہو کر شرارِ آتش آہن سے کیا زنجیر ملتی ہے

بسکہ اور ازبسکہ کا استعمال حشو کی جگہ بھرنے کے لئے کہئے یا زورِ سخن بڑھانے کے لئے مصنف نے بیشتر کیا ہے لیکن ان کے معاصرین کے کلام میں شاذ و نادر آتے ہیں اور اب تو قطعی متروک ہیں۔

(۲)

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردنِ صد دل پسند آیا

شمارِ سبحہ تسبیح کے دانوں کی گنتی جو ایک دھاگے میں نثر مربوط ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں بت مشکل پسند کو شمارِ سبحہ مرغوب ہے کیونکہ ایک دم سو دلوں کو مٹھی میں کر لینا جو ایک تماشہ بھی ہے اور مشکل کام بھی اسے پسند ہے۔

بہ فیضِ بے دلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

جب آدمی کسی کام کے متعلق بے دل ہو جاتا ہے تو پھر کبھی اس کے لئے کوشش نہیں کرتا۔ مطلب یہ کہ کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آ گیا ہے کہ اب اُسے یہاں کوئی زحمت باقی نہیں رہی کیونکہ ہم بے دلی کے فیض سے بہت آسانی کے ساتھ حصولِ مدعا سے ہمیشہ کے لئے ناامید ہو کر بیٹھ گئے ہیں اور جب ہماری یہ حالت ہے تو کشائش کشمکش سے بے نیاز ہو گئی یعنی اب ناخنِ تدبیر مطمئن ہے کہ اسے یہاں گرہ کشائی کی ضرورت

ہی باقی نہیں رہی۔

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل
کہ اندازِ بہ خوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

چونکہ گل برنگِ سرخ و باندازِ چیدنِ بسملِ بہ خوں غلطاں کا نظارہ پیش کرتا ہے اس لئے سیرِ گل کا شوق بے مہریٔ قاتل کا آئینہ ہے یعنی بین ثبوت ہے کہ اسے سامانِ تفریح بھی وہی مرغوب ہے جس میں خونی منظر ہو۔ دوسری جگہ اسی مضمون کو یوں لکھتے ہیں۔

(غالب) انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا اُٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھئے شوخی بہانے کی

جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغِ جگر ہدیہ
مبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

غالبؔ پہلے اسدؔ تخلص کرتے تھے بعد میں ایک بے مایہ شخص کو اس میں اپنا ہم لقب پاکر جس کا ایک مقطع یہ ہے۔

اسد اس جفا بر بتوں سے وفا کی مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

انھیں اسدؔ سے نفرت ہو گئی اور اسد اللہ الغالب کی رعایت سے غالبؔ تخلص اختیار کر لیا مگر پہلی لکھی ہوئی غزلوں کو جن میں بہ لحاظِ مضمون مقطع بدلنے کی ضرورت نہ سمجھی بدستور باقی رکھا جس سے آج ہمیں اسدؔ والی غزلوں کی اولیت معلوم ہو سکتی ہے مگر جہاں مقطع کو بھی بدل دیا ہے ایسی مثالیں بھی موجود ہیں چنانچہ ان کی پہلی ہی غزل کا مقطع پہلے یوں تھا۔

وحشتِ خوابِ عدم شورِ تماشہ ہے اسدؔ جو مزا جوہر نہیں آئینۂ تعبیر کا

شعر کا مطلب یہ کہ اے غالبؔ مبارک ہو کہ غمخوارِ جانِ دردمند یعنی عشق آیا اور اہلِ درد کے مرغوبِ طبع سارے تحائف بطور تحفہ ارمغاں و ہدیہ لایا۔ یا اربابِ زمانہ کے طرزِ غمخواری کا طنزاً اظہار کر رہے ہیں۔

---

(١2)

(٣)

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا

بروئے کار نہ آیا کامیاب نہ ہوا کارآئی نہ کرسکا یا کارآمد ثابت نہ ہوا۔ یعنی صحرانوردی میں جو قیس کے سوا کوئی شخص شہرت نہ حاصل کرسکا یا دخل نہ پاسکا یا کامیاب نہ ہوا تو اس سے پتہ چلا کہ صحرا میں بھی با ایں ہمہ وسعت دیدۂ حاسد کی سی تنگی تھی کہ لے دیکر سارے جہاں میں صرف ایک قیس ہی کو بروئے کار آنا نصیب ہوا۔

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

سویدا جوفِ قلب کے سیاہ نقطہ کو کہتے ہیں جسے اصطلاح اہلِ تصوف میں " انا " یعنی مقامِ ذات کہا جاتا ہے اس کی درستگی سے روشنیٔ قلب ہوتی ہے سویدا داغ سے اور آشفتگی دھوئیں سے مشابہ ہے مطلب یہ کہ پریشانیٔ عشق سے نقشِ سویدائے دل درست ہوگیا یعنی عشق نے اس میں تاب پیدا کردی اس سے یہ پتہ چلا کہ ضرور یہ دھواں ہی اس داغ کا سرمایہ تھا یعنی آشفتگیٔ عشق ہی میں سویدائے دل کو چمکانے کا راز ہے۔

پڑھتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

مجھے غمِ دل کی درس گاہ میں پڑھتے ہوئے ایک عمر گذر گئی لیکن اب تک اس کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا کہ رفت یعنی گیا اور بود یعنی تھا۔ اس میں لفظِ رفت سے مراد ہے نقصان خواہ اسے زر و مال سے سمجھئے یا دل یا عیش اور بود سے مراد ہے وہ حسرت جو رفتہ کے لئے ہے۔ یعنی یہ کہ مکتبِ غمِ عشق کا جو سبق مجھے ملا اور یاد رہ گیا ہے وہ ذکرِ نقصان اور حسرتِ رفتہ کے سوا کچھ نہیں۔

(ناطقؔ) یہ جہان کیا یہ نمود کیا سرِ حسرت کیا غمِ بود کیا — یہیں ہم بھی تھے جو اُجڑ گئے یہیں گھر بھی تھا جو لُٹا دیا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

میری زندگی بہرحال ننگِ وجود تھی کہ کسی اور ملبوس میں عمر بھر داغِ برہنگی چھپایا نہ جاسکا جسے بالآخر کفن نے ڈھانکا کہ اس سے میرے سارے ننگے عیوب پر پردہ پڑ گیا یعنی ان کا خاتمہ ہوا۔ اب ڈھانپا کی جگہ ڈھانکا مستعمل ہے۔

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

فرہاد کو خودکشی کے لئے بسولہ کی ضرورت پڑی جس سے اپنا سر پھوڑ کر وہ مرحوم ہوا۔ اس سے پتہ چلا کہ رسوم اور قیود کے خمار میں اس کا سر گھوما ہوا تھا۔ یعنی فرہاد کو با ایں ہمہ کمالِ عشق و بے نیازیٔ عالم اسبابِ ظاہری کی محتاجی تادمِ مرگ رہی۔ اگر یہ اس سے بالاتر ہوجاتا تو موت اس کے لئے ایک فعل ارادی ہوتا اور تیشہ کی ضرورت نہ پڑتی ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را — ہر دمے از غیب جانے دیگر است

فارسی کے اس شعر پر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوگیا تھا چنانچہ اسی کے ساتھ کچھ قصہ بھی ہے!

(٤)

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

کسی کی کوئی چیز اگر کسی بے تکلف دوست کو کہیں پڑی ہوئی مل جائے تو ایسی رسم ہے کہ گم کرنے والے سے کہا جاتا ہے کہ اگر ہمیں تمہاری کوئی چیز پڑی ہوئی مل جائے تو ہم نہ دیں گے۔ اردو کا ایک محاورہ بھی ہے کہ "پائی چیز پرائی چیز" یہ اس طرز بیان سے اپنے ساتھ معشوق کی بے تکلفی کا بیان کرتے ہیں جو ان سے یہ کہتا ہے کہ اگر ہم نے

کہیں تمہارا دل پڑا پایا تو ہم نہ دیں گے اور یہ جواب میں کہتے ہیں کہ اب دل یہاں کس کے پاس رکھا ہے جو گم کرنے کا سوال آئے وہ تو گم ہو چکا اب جو آپ یہ کہتے ہیں کہ اگر ہمیں مل گیا تو نہ دیں گے اس کا مطلب ہم سمجھ گئے یعنی یہ کہ ہمارا گم شدہ دل آپ ہی کے پاس موجود ہے۔ مصرعہ ادھر لا ہاتھ مٹھی کھول یہ چوری یہیں نکلی (داغ)

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

دردِ عشق کے مقابلہ میں مصائبِ زندگی کو بھول گئے اِس طرح غمِ عشق آلام زیست کی دوا ہو گیا۔

(اطہر ہاپوڑی) ایک آفت دوسری آفت کا ہو جائے علاج — دردِ سر کو بھول جاؤں دردِ دل اتنا تو ہو
(ناطق) شدتِ درد ہی ہوتی کہیں غارت گرِ ہوش — بخت اتنا تو نہ برہمزنِ ساماں ہوتا

اور چونکہ یہ درد خود لا دوا تھا اس لئے فکرِ مداوا سے بھی مستغنی ہو گئے یہی لطفِ زیست ہے۔ یا یہ کہ دردِ عشق ایک مزے کا اندوہ ربا غم ہے۔

دوستدارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

اصطلاحِ شعراء کے مطابق نیز عام خیال میں آہ بھی دل سے نکلتی ہے اور نالہ بھی چونکہ یہ دونوں بے اثر اور نارسا ثابت ہوئے اِس لئے دل پر اعتماد نہیں رہا کہ یہ جان بوجھ کر ایسے وار کرتا ہے جو بیکار ہوں۔ یہ تو دشمن کا دوستدار معلوم ہوتا ہے اب دل پر کیا بھروسہ کیا جائے۔

سادگی و پرکاری بیخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

اہلِ حسن کی سادگی پُرکاری اور بیخودی ہشیاری ہے۔ یہ لوگ اپنے اندازِ تغافل سے جس کا نام سادگی و بیخودی ہے جرأت عشاق کی آزمائش کرتے ہیں کہ کسی کو ایسی حالت

میں دست درازی کی تو ہمت نہیں ہوتی۔

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

آج ہم نے اپنے دلِ خوں کردہ و گم گشتہ کو ڈھونڈھ کر پا لیا اس سے غنچۂ آرزو پھر کھلنے لگا کیونکہ مقامِ آرزو دل ہے۔ یا یہ کہ آج ہم نے اپنے دلِ گم گشتہ کو خوں گشتہ پایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غنچہ پھر کھلنے لگا یعنی فصلِ خزاں گئی اور موسمِ بہار آیا کیونکہ دل کا خوں ہونا اور گم کرنا علامتِ جنون ہے اور جنون علامتِ بہار۔

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈھا تم نے بارہا پایا

جنس دل کا حال کہ یہ کیا ہے کیسی ہے کتنی ہے کس کی ہے اس سے زیادہ معلوم نہیں کہ ہم اسے بار بار گم کر کے ڈھونڈھتے رہے اور تمہیں بے طلب ملتا رہا۔ حاصل یہ کہ خدا جانے دل کیا بلا ہے کہ جب ہمارے پاس آتا ہے تو گم ہو جاتا ہے اور جب ہمارے پاس سے گم ہوتا ہے تو تمہیں مل جاتا ہے اس میں کیا راز ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

میرے زخمِ دل پر ناصح نے اپنے پندِ شور سے نمک چھڑکا تو اِن بزرگ سے کوئی یہ پوچھے کہ مجھے بے وجہ تکلیف دیکر آپ کو کیا مزا ملا دوسرے مصرعہ میں ایک ہی شخص کے لئے "آپ" اور "تم" کا استعمال کیا ہے جس پر بظاہر شترگربہ کا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن یہاں طرزِ بیان مختلف ہے لفظ آپ جو استعمال کیا ہے وہ طنزاً ہے اور جو عزت کا لفظ طنزاً استعمال کیا جاتا ہے اس کی حالت پست ہو جاتی ہے اس لئے یہ شترگربہ نہیں۔

———— ⁂ ————

(۵)

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

مرا دل سوزِ نہاں کی بدولت آتشِ خاموش کی مانند بے دھڑک خاموشی کے ساتھ اندر ہی اندر جل کر رہ گیا۔

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اِس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

یہاں آگ سے مراد ہے آتشِ رشکِ عدو یہ خانۂ دل میں ایسی لگی کہ ذوقِ وصل اور یادِ یار تک کو جلا کر خاک کر دیا۔ یہ تقاضائے غیرت ہے کہ جب معشوق دوسرے کی طرف التفات کرے تو عاشق کا دل ایسا جل جاتا ہے کہ نہ اسے لطفِ وصل پسند آتا ہے اور نہ یادِ یار کی پرواہ رہ جاتی ہے بلکہ یہاں تک ہوتا ہے کہ محبت نفرت سے بدل جاتی ہے۔

(ناطق) ملتے ہیں وہ عدو سے تو پروا نہ کیجئے ۔۔۔ اے دل اب آپ ترکِ تمنا نہ کیجئے

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

منازلِ تصوف میں فنا کے بعد بقا باللہ کا مرتبہ آتا ہے جو اِس بقارِ ہستی سے وراء الورا ہے۔ عنقا ایک طائرِ وہمی کا نام ہے جس کا وجود معدوم ہے اس کے خیال وجودِ معدوم سے فائدہ اُٹھا کر مصنف نے عنقا کا وجود ملکِ عدم میں قائم کر دیا۔ کہتے ہیں میرا مرتبہ اب فنا یعنی عدم سے بھی بالاتر ہے ورنہ جب تک میں مقامِ عدم میں تھا تو میری آہِ آتشیں سے بارہا بالِ عنقا جل جاتا رہا ہے یعنی مقامِ فنا میں بھی میری آہِ سوزاں نے آگ لگا رکھی تھی حاصل یہ کہ جب تک میں مقامِ عدم میں تھا اس وقت تک اہلِ عدم میری آہِ سوزاں سے مامون نہیں تھے اب چونکہ میں اس سے پرے ہو گیا

ہوں اس لئے عنقا کو پر پرزے نکالنے کا موقع مل گیا لفظ "پرے" متقدمین نے کثرت سے نظم کیا ہے اور اب تک دہلی اور اس کی نواح میں زبان زدِ عام ہے اضلاع میرٹھ، بلند شہر اور علی گڑھ کے اہلِ علم اور شرفا اسے بکثرت بولتے ہیں۔ اندریں اضلاع قصبہ سردھنا سے لے کر شہر علی گڑھ تک آج بھی دہلی کی قدیم اردو کے مرکز ہیں یہاں کے قصبات میں ان اثرات نے دخل نہیں کیا جو بعد میں دہلی پر چھا گئے اس لئے آپ کو یہ سن کر تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ آج تک اس نواح کے لوگ میر و سودا کی زبان کے بہت سے الفاظ اور محاورے بلا ردو بدل استعمال کرتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ قصبات دہلی سے زیادہ فصیح سمجھے جانے کے مستحق ہیں کیونکہ اگر آج دہلی اور لکھنؤ کے پاس شعرائے حال کی سند ہے تو اس علاقے کے پاس جو نواحِ دہلی کہلاتا ہے میر، سودا، درد، غالب، مومن اور ذوق کے الفاظ کی سند موجود ہے اس لئے جن لوگوں نے اپنی زبان بدل ڈالی انھیں یہ حق نہیں کہ ان لوگوں پر اعتراض کریں جو اپنی آبائی زبان کو ہنوز قائم رکھے ہوئے ہیں اور وہی بولتے ہیں۔ آخر عرب میں بھی تو یہی ہوا تھا کہ جب شہروں کی زبان میں عجمی الفاظ نے آکر دخل کر لیا تو پھر شہروں کی سند نہیں رہی اور قصبات و دیہات کی زبان مستند ہو گئی مگر ان قصبات ہی سے بحث نہیں لفظ "پرے" تو اب تک دہلی اور اکبرآباد میں بھی بے تکلف بولا جاتا ہے مرزا داغ نے دہلوی ہوتے ہوئے جو اب سے پچاس برس پہلے اسے ترک کر دیا تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ قیامِ رامپور کے زمانہ میں اہلِ لکھنؤ سے گھرے ہوئے تھے اس لئے لکھنؤ والوں میں رہ کر اُن کے متروکات کو خود تنہا استعمال کرنا پہلے تو نامناسب سمجھا اور بالآخر یہ لفظ ان کی زبان سے اٹھ گیا اس طرح داغ مرحوم نے اسے متروکات میں شامل کر کے دہلی کی زبان کے ساتھ بے انصافی کی مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت داغ اس لفظ کو اخیر تک نہایت فصیح سمجھتے تھے چنانچہ سُنا ہے کہ اس لفظ سے بحث کرتے ہوئے آپ نے حیدر آباد میں ایک لکھنوی اہلِ ادب کو یہ شعر سُنایا ؎

(مومن) چل پرے ہٹ مجھے نہ دکھلا منہ ۔۔۔ اے شبِ ہجر تیرا کالا منہ

اور فرمایا کہ اگر یہاں "پرے ہٹ" کی جگہ "اُدھر ہٹ" پڑھا جائے تو نہ وہ خوبی باقی رہے گی نہ زورِ بیان مولانا داغ دہلوی نے اس لفظ کو اپنی غزلوں میں کثرت سے استعمال کیا ہے۔

(داغ) چل سرک لمبی ہو میرے گھر سے ٹل فرقت کی رات
ہٹ پرے جادو ر کالا منہ نکل فرقت کی رات

حضرتِ بیان یزدانی نے بھی اس لفظ کو نظم اور نثر دونوں میں استعمال کیا ہے۔
حضرتِ داغ مرحوم نے اہلِ لکھنؤ کے پاس ملاقات سے کہئے یا فضول اعتراضوں سے بچنے کے لئے دہلی کے کئی الفاظ کو بلا ذاتی وجہ کے ترک کر دیا اور کئی الفاظ میں تذکیر و تانیث کا بھی تصرف کیا ہے جسے میں درست نہیں سمجھتا اور حضرتِ اطہر ہاپوڑی بھی اس معاملہ میں مرے ہمخیال تھے۔ یہاں ایک واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ مولوی عبدالباری صاحب آسی متوطن قصبہ الدن ضلع میرٹھ جو ایک عالم بھی تھے کثیر التصانیف بھی اور لکھنؤ کے بڑے اساتذہ میں بھی جن کا شمار تھا جن کی تحقیق بھی قابلِ قدر ہے۔ میرے شاگرد اور دوست ہی نہیں عزیز بھی ہیں آپ میرے اشعار کو عقیدت سے سُنتے تھے اور میرے لئے سراپا دادِ سخن تھے۔ آپ نے میرے اشعار کو سُن کر ایک مرتبہ نہایت خلوص کے ساتھ فرمایا کہ یہ بہ لفظ اور یہ یہ محاورے لکھنؤ میں نہیں اور لکھنؤ والے انھیں پسند نہیں کرتے اس لئے اگر آپ انھیں درست فرما لیجئے تو بہتر ہوگا۔ میں نے جواب دیا بھائی لکھنؤ کی سند نہیں تم یہ کہو کہ تمہارے گھر کی زبان کے بھی یہ الفاظ اور محاورات ہیں یا نہیں تو فرمایا کہ ہاں ہیں اور نہایت فصیح ہیں اس پر میں نے کہا۔ تو پھر آپ لکھنؤ کے اثر سے اپنی زبان کو بدل لیجئے اور مجھے اپنے اثر سے دکن کی زبان بدلنے کے لئے چھوڑ دیجئے۔ لکھنؤ کی زبان تو یہ ہے کہ یہاں تعالیٰ اللہ کے محل استعمال میں معاذ اللہ بے تکلف بولا جاتا ہے تم ایسا بولتے ہو۔ اس کے بیان سے مقصد یہ ہے کہ جب حضرتِ آسی کی جیسی ہستی پر ماحول کا اثر ہوئے بغیر نہ رہا جو نہایت سخت اور جھگڑالو مشہور تھے تو حضرتِ داغ کا متاثر ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں جو خاموش اور صلح پسند تھے۔ میں اپنے برادرانِ خواجہ تاش سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ایسے الفاظ کے متعلق اپنی ذاتی تحقیق سے بھی کام لیا کریں۔ حضرتِ فدا گلاؤٹھوی بھی جو داغ کے ایک قدیم اور مایۂ ناز شاگرد تھے اس معاملہ میں میرے ہم خیال تھے۔ اور حضرت رسا گلاؤٹھوی ثم الرامپوری بھی ہم سے متفق تھے۔

عرض کیجئے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

میرے جوہرِ فکر کی گرمی کہاں بیان ہو سکتی ہے کہ جس میں وحشت کا ذرا سا خیال آنے پر صحرا جل گیا یعنی میدانِ خیال میں آگ لگ گئی جب محض خیال سے ایسا غضب ہو گزرا تو خدا جانے اس کے بیان سے کیسی آگ لگے۔ جس طرح فلسفی اصطلاح میں صورت ہیولیٰ کے ساتھ کا لفظ ہے اسی طرح اہلِ کلام کے وہاں عرض جوہر کے ساتھ مربوط ہے جو بفتح را ہے یہاں عرض اور جوہر کو مصنف نے بالقصد بلا قصد جمع کر دیا ہے جس سے عرض و جوہر کا خیال بھی حسنِ بیان ضرور ہے اور مطلب سے بھی کچھ وابستہ ہو جاتا ہے مگر اسے زبردستی علمِ کلام والا عرض سمجھنا اور اس پر سکونِ را کا اعتراض کرنا بے انصافی ہے کیونکہ جوہرِ علم کلام سے قطع نظر سکونِ رائے عرض سے مطلب بدرجہ اتم پیدا ہوتا ہے۔

دل نہیں تجھکو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

جس کام کا کرنے والا نہ رہے اس کی حالت نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے آپ ہی آپ ابتر ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں میرے سینہ کے گلہائے داغ کی بہار اور تابانی دیکھنے کے قابل تھی مگر اب کیا بتاؤں کہ جس ہستی کی حسنِ کارگزاری سے اس میں چراغاں کا عالم پیدا ہو گیا تھا اب وہی باقی نہیں یعنی دل غریب اپنی آگ میں جل کر ختم ہو گیا تو داغوں کی بہار کس کے بھروسہ پر باقی رہتی۔ یہاں ایک لطیفہ یاد آیا جس کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ برطانیہ میں جب گھڑی کی ابتدا ہوئی تو ایک دیہاتی انگریز نے بڑی دیوار گھڑی لا کر اپنے یہاں لگائی جو سال دو سال چلنے کے بعد بند ہو گئی میم صاحبہ نے صاحب سے شکایت کی کہ گھڑی چلتی نہیں تو صاحب نے گھڑی کو اُتار کر کھولا اور اسے غور سے دیکھا تو اتفاقاً ایک چوہا مرا ہوا ڈائل کے نیچے انھیں نظر آیا یہ دیکھ کر صاحب بہادر میم صاحبہ سے بولے کہ گھڑی چلے کیونکر اس کا تو انجینیر ہی مر گیا۔

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

اہلِ دنیا کا منافقانہ طرزِ تپاک دیکھ کر میرا دل جل کر کباب ہو گیا ہے اس لئے اے غالب مجھے اب ان لوگوں سے گرمجوشی کے عوض افسردگی یعنی لاپرواہی کی آرزو ہے یعنی یہ کہ میں اہلِ دنیا کی جھوٹی دوستی سے ایسا بیزار ہو گیا ہوں اور میرا دل اس قدر جل گیا ہے کہ مجھے اب یہ آرزو ہے کہ لوگ میرے ساتھ افسردگی برتیں۔ یعنی مجھ سے نہ ملیں مجھے اہلِ دنیا سے نفرت ہو گئی ہے کہ یہ لوگ منافق ہیں۔ توالیٔ اضافات میں متقدمین کے نزدیک ہرج نہ تھا انھوں نے بے تکلف تین چار اضافتیں تک نظم کی ہیں مگر متاخرین نے دو سے زیادہ اضافتوں کا متواتر استعمال معیوب قرار دیا ہے کہ ان کے نزدیک اس سے اردو کا بیان قائم نہیں رہتا۔ میں بھی گو حتی الوسع اس سے اجتناب کرتا ہوں لیکن اگر بندش میں مفر نہ ہو تو کسی اچھے خیال کو محض اس پابندی کے لئے چھوڑ دینا بھی میرے نزدیک بہتر نہیں۔ یہ وہیں تک جائز ہے جبکہ اضافت بالکسر دو فارسی کے الفاظ میں ہو جیسا کہ یہاں "طرز" "تپاک" اہل اور "دنیا" میں ہے۔ اردو کے الفاظ کے ساتھ بھی بعض متقدمین نے ایسی اضافت کو نظم کیا ہے جس کی مثالیں بیشتر آتش کے کلام پائی جاتی ہیں مگر متاخرین کے نزدیک یہ سخت معیوب ہے اور اب اس پر سب کا اتفاق ہے۔

(۶)

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

شوق عشق۔ رقیب مہند بالمعنی یعنی دشمن۔ عربی میں جہاں سے یہ لفظ آیا ہے نگراں و محافظ کے معنی رکھتا ہے اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں بھی آیا ہے اور ذات باری کے ننانوے ۹۹ اسمار حسنیٰ میں سے ایک نام یہ بھی ہے حضرت شیخ عبد الحق صاحب محدث دہلوی نے اس کی خاصیت یہ لکھی ہے کہ جو کوئی سات سو بار پڑھ کر اپنے مال و عیال پر بوقت سفر دم کرے تو خدا ان کی حفاظت کرتا ہے لفظ رقیب بمعنی دشمن عربی نہیں فارسی

شعرائے پہلے اسے نگہبان ہی کے معنیٰ میں استعمال کیا مثلاً

(حافظ) خدا را اے رقیب امشب زمانے دیدہ برہم نہ
کہ من بالعلِ خاموشش نہانی مکِ سخن دارم

مگر چونکہ نگہبانِ دوست جو مانعِ دیدار و ملاقات ہو ایک دشمن ہی کی شان رکھتا ہے اس لئے پہلے تو رقیب کہہ کر فارسی شعراء نگہبان ہی مراد لیتے رہے لیکن بالآخر اپنے معشوق کے دوسرے متوازی چاہنے والے کو بھی انھوں نے رقیب بنا دیا اور وجہ تسمیہ اس کا بھی محافظ ہونا ہی باقی رہا۔ یہ لفظ اردو میں آکر قطعی مہند ہو گیا اور دشمن ہی کے معنیٰ میں اہل زبان اس کو استعمال کرتے ہیں اس لئے اب ترکیب اردو میں آکر رقیب کا عربی معنیٰ استعمال نادرست ہوگا اور جب اردو میں بولا جائے گا تو اس سے دشمن ہی مراد ہوگا۔ قیس کی تصویر کو عریاں بتایا جاتا ہے یہ رسم یہاں بنیاد خیال ہے۔ مطلب یہ کہ عشق بہر حال سر و سامان کا دشمن ہے چنانچہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ قیس اگر تصویر کے پردے میں بھی ہو تو عریاں ہی آنکلتا ہے۔ یا تصویر کے پردے میں بھی قیس عریاں نکالا جاتا ہے۔ یا قیس کی تصویر عریاں نکالی جاتی ہے پردے میں عریاں حسن بیان ہے۔

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا

پرندوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب کسی مقام سے دب کر نکلتے ہیں تو پر جھاڑتے ہوئے نکلتے ہیں۔ یہاں تیر کو بلحاظ پروں کے پرندے سے تعبیر کیا ہے۔ افسوس کرتے ہیں کہ زخمِ ناوک نے بھی تنگیِ دل کی داد نہ دی یعنی جو دل تنگی ہماری مصیبت تھی وہ اس سے رفع نہ ہوئی جس کا ثبوت یہ ہے کہ خود تیر بھی جس کے آر پار نکل جانے سے دل کشائی کی امید تھی تنگیِ دل سے گھبرا کر پر جھاڑتا ہوا نکل بھاگا اسی مضمون کو ذرا وضاحت کے ساتھ مصنف نے یوں لکھا ہے۔

(غالب) نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

بوئے گل۔ نالۂ دل۔ دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

تیری محفل سے نکلنا ہی وجہ پریشانی ہے اِس میں کچھ خصوصیت نہیں اور جانداروں ہی پر منحصر نہیں غیر ذوی العقول کا بھی تیری محفل سے نکلتے وقت یہی حال دیکھنے میں آیا ہے۔ " لفظِ سو" کا استعمال برائے بیان مصنف کے زمانہ میں عام تھا لیکن اب متروک ہے آج کل اس کی جگہ صلہ اور موصول کی ترکیب میں " لفظِ وہ" استعمال ہوتا ہے لیکن بہت سے بے معنی اور غیر مرتبِ نام نہاد نیچرل نظمیں لکھنے والے نیز بعض غزل گو جو پابندیِ فن کو اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کے لئے برا سمجھتے ہیں نہ صرف اِس لفظ کا بلکہ اور بھی بہت سے متروک الفاظ کا استعمال پھر سے کرنے لگے ہیں۔

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا بہ قدرِ لب و دنداں نکلا

میرا دلِ حسرت زدہ لذتِ درد کا دسترخوان تھا جس سے یاروں یعنی لوگوں نے اپنے لب و دنداں کی استعداد کے مطابق فائدہ حاصل کیا یعنی لطف اُٹھایا کہ جن دوست اپنی اپنی قابلیت یا ذوق کے مطابق میرے دلِ حسرت زدہ سے جو دسترخوانِ درد تھا اور جہاں سے تلقین درد ہوتی تھی مستفید ہوئے۔ اس شعر کا یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ یہ ایک تبرک تھا اور فارسی کا مشہور مقولہ ہے کہ " تبرک اَنست کہ از حلق فرو نمی رود"۔ یہاں لفظِ کام کو جس کے عربی معنیٰ حلق ہوتے ہیں مصنف نے معنی اردو ہی سہی لب و دنداں کی مناسبت سے استعمال کیا ہے۔ ایسے مراعات النظیر کہتے ہیں اور حسنِ بیان ہے۔ بشرطیکہ بے تکلف آجائے ایسے الفاظ کا استعمال اُنھوں نے بہت کیا ہے۔ زمانۂ حاضرہ کے بعض خام کاران سخن اسے عیب قرار دیتے ہیں اور ثبوت میں خواجہ وزیر و امانت کے نارو اتکلفات کی غیر متعلق مثالیں پیش کرتے ہیں۔

اے نوآموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

اِن کی ہمت دشوار پسند نوآموزِ فنا ہے یعنی یہ نیا خیال پیدا ہوا ہے کہ فنا ہو جائیے یہی بہت مشکل کام ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ دیکھا تو یہ کام بھی کوئی مشکل نہیں نکلا کہ انسان ذرا سی دیر میں خود کو فنا کرسکتا ہے اِس لئے ہنوز وہی مشکل باقی رہی کہ اور کوئی مشکل کام جو اپنی علوئے ہمت کے لائق ہو تلاش کرکے نکالئے۔

(ناطق) کارِ ہمت جان دینا عشق میں اے دل نہیں
زندگی مشکل ہے مرجانا تو کچھ مشکل نہیں

دل میں پھر گریہ نے طوفان اُٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا وہ طوفان نکلا

جو قطرۂ اشک کہ گریہ سابق میں نہ نکل سکا تھا وہ اب بڑے زور شور سے آمادۂ کار ہے یعنی طوفان بن کر اُمنڈ رہا ہے۔

(غالب) پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

(۷)

دھمکی میں مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا

عاشقی کے لئے مردِ میدان کی ضرورت تھی اس لئے جو شخص نبردِ عشق میں مردانہ مقابلہ کرنے کے قابل نہ تھا یعنی مصائب و حوادثِ عشق کو برداشت نہ کرسکتا تھا اُس کا تو دھمکی ہی میں دم نکل گیا۔ عشق نبرد پیشہ کی اضافت کو توصیفی مانئے یا بیانی مطلب میں زیادہ فرق نہیں پڑتا۔

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر بھی مِرا رنگ زرد تھا

یہاں مصنف نے رنگِ زرد کو مائلِ پرواز کے معنیٰ میں استعمال کیا۔ خوف سے آدمی کا رنگ زرد پڑجاتا ہے۔ مطلب یہ کہ میری زندگی کا ہر لمحہ ایسا سخت مصیبت ناک تھا کہ مجھے ہر سانس دمِ واپسیں معلوم ہوتا تھا یا یہ کہ میں موت کے خوف سے ساری عمر قریب المرگ رہا۔ جب انسان کو موت کا کھٹکا لگا رہتا ہے تو وہ دنیا کی کم پرواہ کرتا ہے اس لئے اس شعر کا یہ بھی مطلب ہوگا کہ باغِ ہستی سے اڑ جانے سے پہلے بھی میرا رنگ اہلِ زیست سے ملا ہوا نہ تھا جو بیان ہے اس حدیث کا اُذْکُرُوْا ہَادِمَ اللَّذَّاتِ۔

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

تصنیف و تالیف درجہ ہے اہلِ علم و کمال کا یہ کہتے ہیں فنِ وفا میں مجھے اس وقت سے درجۂ تالیف حاصل ہے جبکہ میرا شیرازۂ خیال خود منتشر تھا یعنی ہنوز میں نے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ مجھے فنِ وفا میں درجۂ کمال حاصل ہوگیا تھا۔ تصنیف اور تالیف میں یہ فرق ہے کہ تصنیف مصنف کے اپنے خیالات کو جمع کر دینے کا نام ہے اور تالیف اسے کہتے ہیں کہ کوئی شخص مختلف لوگوں کے خیالات کامیابی سے مرتب کرے یہاں مصنف نے لفظِ تالیف کو "مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا" مناسبت سے استعمال کیا یعنی مجھ سے پہلے یہ خیالات پریشان ہوکر پڑے تھے جنھیں میں عمر بھر جمع کرتا رہا اور ایک جگہ کرکے پیش کردیا۔

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہگذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

دل سے جگر تک جو راستہ ہے پہلے یہ اس قدر شاداب تھا کہ جس کی رنگ آمیزیوں

کے مقابلہ میں موسمِ بہار کی بھی کوئی حقیقت نہ تھی مگر اسی کا یہ عالم ہے کہ دریائے خون کا کنارا بنا ہوا ہے یعنے رنگین ارمانوں کی بدولت میرا سینہ جو شگفتگی سے بلغ باغ ہو رہا تھا آرزوؤں کا قتلِ عام ہوجانے پر اب یہ عالم ہے کہ وہاں خون کی ندی بہ رہی ہے۔

جاتی ہے کش مکش کوئی اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

اندوہِ عشق کی کش مکش جا نہیں سکتی میرا دل چلا بھی گیا تو دل کا درد وہی کا وہی باقی رہا یعنے دل کے چھنے جانے پر دردِ دل جو حاصلِ دل یا متاعِ دل ہوچکا تھا بدستور باقی رہا۔ اہلِ تصوف کے نزدیک ذکر و مراقبہ کا اثر دل میں راسخ ہوجانے کے بعد دل ہی کی طرح جوارح میں بھی پھیل جاتا ہے چنانچہ مردِ کامل ہمہ تن روح و ہمہ تن دل ہوجاتا ہے ؎

مرغِ الٰہی زِقفس بر شدہ　　قالبش از قلب سبک تر شدہ

عشقِ مجازی میں بھی یہی کیفیت مجنوں کی فصد کے متعلق جو افسانہ مشہور ہے اس سے ظاہر ہوتی ہے۔

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

احباب سے وحشت کی چارہ سازی نہ ہوسکی کیونکہ جب انھوں نے مجھے قید خانہ میں بند کردیا تو بھی خیال بیاباں نوردی سے باز نہ آیا یعنے ان سے میری پریشاں خیالی کا علاج نہ ہوسکا۔ جنون کا علاج یہی ہے کہ کسی طرح دیوانہ کے خیالات کو مجتمع کیا جائے جب اسی کا علاج نہ ہوسکا تو پھر چارہ سازیِ وحشت کیونکر ہوجاتی قید و زنجیر سے تو کچھ علاج نہیں ہوتا یہ تو صرف اس لئے ہوتی ہیں کہ دیوانہ کہیں جاکر چوٹ نہ کھائے مر نہ جائے یا کسی کو ایذا نہ پہونچائے۔

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اللہ مغفرت کرے غالب بھی عجب آزاد مرد تھا کہ اس کی لاش تک کفن سے بے نیاز ہے۔ مطلب ذرا سا ہے لیکن شعر کیفیات میں ڈوبا ہوا ہے یہی ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے کہ چھوٹا سا دیوان چھپوا کر چھوڑ گئے ہیں اِس پر بھی موقع کے لحاظ سے پڑھ دینے کے لئے جتنے کام کے شعر ان کے دیوان میں ملتے ہیں شاید اور کہیں ملتے ہوں۔

(۸)

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

نقش وفا کیا ہے تین حرف یعنی و۔ ف۔ ا۔ لفظِ وفا کا مفہوم دنیا سے معدوم ہے یعنی کوئی وفا نہیں کرتا اس لئے یہ وجہ تسلی بھی نہیں کسی کے ادعائے وفا پر بھروسہ نہیں ہوتا اور یہ نقشِ وفا نقش برآب ہو کر وجہ تسلی نہیں رہتا۔

(ناطق) دل بے وفا نہیں مگر اے جان بے وفا
آخر وفا کروں بھی تو کس سے وفا کروں

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

افعی ناگ سانپ۔ دم افعی سانپ کی پھنکار۔ زمرد ایک قیمتی پتھر کو کہتے ہیں جو سبز ہوتا ہے اس کی چمک کے متعلق مشہور ہے کہ ناگ سانپ اسے دیکھ کر ایسا مبہوت ہو جاتا ہے کہ پھنکارنے اور کاٹنے کا ہوش باقی نہیں رہتا خطِ نو آغاز کو سبزہ سے تشبیہ دیتے ہیں چنانچہ نوجوان کے لئے سبزہ آغاز بولا جاتا ہے زلف کو افعی بھی کہتے ہیں اور اسی کا ترجمہ ہو کر ناگن یا ناگ بھی آتا ہے۔ زمرد سے سبزے کا بیان بھی عام ہے۔ کہتے ہیں تعجب کی بات ہے کہ اِس زمرد کے سامنے

ہوتے ہوئے بھی افعیِ زلف کے دم خم نہ گئے اور اس کی وہی سرکشی اور پھنکار باقی ہے حالانکہ چہرۂ معشوق پر خط کے نکل آنے کے بعد زلف کو بد رونق ہو جانا چاہئے مثل مشہور ہے کہ "ریش بر آمد یا جی شد" آج کل اردو شاعری سبزۂ خط کے ساتھ معشوق کو باندھنا پسند نہیں کرتی اور بہت سے شعرا کو یہ بھی گوارا نہیں کہ طرزِ بیان میں کسی طرح بھی معشوق کی تذکیر آ جائے یہ اور بات ہے کہ اردو شاعری ہمیشہ حروفِ تذکیر کے ساتھ معشوق کا بیان کرتی ہے لیکن اس سے مراد تذکیر نہیں ہوتی۔ اردو شاعری میں معشوق کے بیان کے لئے حروفِ تانیث کا استعمال ہنوز نہیں مگر میرے نزدیک یہ بھی مستحسن نہیں کہ جہاں طرزِ بیان میں معشوق کی کھلی ہوئی تانیث نکل آئے وہاں بھی تذکیر ہی کے الفاظ لائے جائیں مثلاً

(امیر مینائیؔ) گونج بالی کی جو اُلجھی تو یہ جل کر بولے
ہاتھ ٹوٹیں ترے مشاطہ میرے کان گئے

اِس شعر میں مشاطہ اور بالی کے بیان سے معشوق کی تانیث صاف نکل آئی اس لئے حضرتِ امیر نے جو لفظ "بولے" یہاں استعمال کیا ہے وہ اچھا نہیں معلوم ہوتا ایسے موقع پر وہ صیغہ استعمال کرنا چاہئے جس سے تذکیر و تانیث کچھ نہ نکلے اس لئے اگر حضرتِ امیر یہ "جل کر بولے" کی جگہ یہ "جھنجھلا کے کہا" لکھ دیتے تو بہتر ہوتا۔ مولانا آسیؔ نے میری اِس تنقید سے بحث کرتے ہوئے رسالہ نگار میں لکھا تھا کہ "دیگر اساتذہ کے یہاں بھی ایسا استعمال پایا جاتا ہے۔ گویا میں حضرتِ امیر کے اُستاد سمجھتا ہی نہیں میں نے تو ایک اصولی بات کہی تھی اب اس کی زد میں اگر کوئی دوسرا بھی آ جاتا ہے تو اس سے میری تنقید کا جواب نہیں ہو سکتا۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

وفا وہ بھی کسی بے مروت ستمگر کے ساتھ کرنا باعث اندوہ ہے جس سے نجات حاصل کرنے کے لئے میں نے چاہا تھا کہ مر جاؤں مگر افسوس کہ وہ اس پر بھی راضی نہ ہوا اور اب یہ مجبوری آ پڑی ہے کہ بے اجازت مر جانا شرط وفا نہیں۔

(۲۵)

دل گزرگاہِ خیالِ مئے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا

نفَس سانس کو کہتے ہیں مگر کہیں کہیں عوام میں اور خصوصاً اصطلاحِ صوفیا میں بمعنی کلام بھی آجاتا ہے۔ شعراء کے یہاں بھی حضرت مسیح کے لفظ قم کو دمِ عیسیٰ بولا جاتا ہے۔ کہتے ہیں اگر میرا نفس سرمنزل تقوی کا راستہ نہ بن سکا یعنی لوگ میرے طرزِ کلام سے میرے دل کی تہ تک نہ پہنچ سکے اور میرا غلط اندازہ کیا گیا تو اچھا پھر بھی الزام منظور کہ میرا دل جو فی الحقیقت سرمنزلِ تقویٰ ہے سرمنزلِ تقویٰ نہیں بلکہ مئے و ساغر کی گزرگاہ ہے یعنی میں زاہد حق پرست نہ سہی رندِ مئے پرست سہی آخر کسی سے کچھ لینا تو نہیں پھر اپنی صفائی کیوں کرتا پھروں میں جو کچھ ہوں ہوں لوگ مجھے جو کچھ سمجھتے ہیں سمجھتے رہیں۔ یا یہ کہ بقولِ مصنف

(غالب) جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اگر دل تقویٰ و زہد کی طرف راغب نہیں ہوتا تو بہر رندی و مے پرستی کرکے دنیا کی زندگی تو آرام سے گزاروں اگر وہ بھی نہ ہوا اور یہ بھی نہ کیا تو دونوں جہان سے گئے "خسر الدنیا و الاخرۃ" یہاں مصنف نے لفظ نفس کا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے جس کے دونوں معانی کا فائدہ حاصل ہو گیا۔ لفظِ تقویٰ کی کتابت گو "ی" سے ہے الف سے نہیں لیکن اردو میں اس کا تلفظ عام طور پر الف سے ہوتا ہے اس لئے حضرتِ طہر یا پوڑی کا خیال ہے کہ اسے "یے" کے قوافی میں لکھا جائے اور میں ان سے اتفاق کرتا ہوں۔

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا

اگر تو وعدہ کر لیتا تو بھی میں خوش ہوتا اور نہیں کیا تو بھی راضی ہوں کیونکہ اس طرح کانوں کو تسلی کے خوش آئند الفاظ کا رہینِ منت نہ ہونا پڑا کیونکہ وفا کی تو بہر صورت تجھ سے کوئی امید نہیں۔

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مصائب زندگی سے گھبرا کر ہم نے یہ چاہا تھا کہ مر جائیں لیکن اس محرومی قسمت کی کہاں جا کر شکایت کیجیے کہ موت بھی نہ آئی یا مرنا بھی نہ ہو سکا۔ یا ہم ایسے محروم تمنا ہیں کہ اور کوئی مراد بر آنا تو درکنار مرجانے کی آرزو بھی پوری نہ ہوئی مثل مشہور ہے منہ مانگی موت بھی نہیں آتی۔ ع

ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

حضرتِ عیسیٰ کے لب کو دم کرنے کے لئے جنبش نہ ہوئی اور اس حرکت سے جو ہوا میں تموج پیدا ہوا تو اس کی چوٹ سے غالبِ ناتواں کا دم نکل گیا ایسا کمزور آدمی ایک پھونک کا صدمہ کیونکر برداشت کر لیتا۔ کمزوری کا ایسا ہی ایک مضمون مصنف نے یوں لکھا ہے۔

(غالب) ضعف سے نقشِ پے مور ہے طوقِ گردن
تیرے کوچہ سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو

لفظِ عیسیٰ کی کتابت اردو میں الف اور "ی" دونوں طرح سے ہوتی ہے لیکن آواز ہمیشہ الف ہی کی نکلتی ہے فارسی میں اس کی دونوں آوازیں ہیں غالب نے یہاں اسے ترکیب فارسی کے ساتھ نظم کیا ہے ایسی حالت میں "یے" کا تلفظ اب بھی اردو میں جائز ہے۔

(۹)

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

کسی شے کو طاقِ نسیاں پر رکھ دینا اسے دل سے بھلا دینا یا لاپرواہ ہو جانا۔

باغِ رضواں باغِ جنت جس کا داروغہ رضواں نامی فرشتہ ہے۔ کہتے ہیں واعظ جس باغِ جنت کی بہاروں کی ایسی لمبی چوڑی تعریفیں کرتا ہے اس کا حال ہمیں کبھی معلوم ہے لیکن وہ باغ مختصر ہو کر ہم بیخودانِ شوق کا ایک ایسا گلدستہ بن گیا ہے جو زیبِ طاقِ نسیاں ہو کر رہتا ہے یعنی ہماری بیخودی ایسی دلکش پربہار اور وسیع ہے کہ اس کی سیر میں باغِ خلد کی کبھی یاد بھی نہیں آتی۔

بیاں کیا کیجیے بیداد کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

دانۂ مرجاں سرخ ہوتا ہے جو خون کا ہمرنگ ہوا۔ کہتے ہیں مژگانِ یار نے رسمِ بیداد میں کاوش یعنی کوشش کی حد کر دی کہ میرے خون کے ایک قطرے کو چھید کر تسبیح مرجاں کا دانہ بنا ڈالا۔

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

سطوت دبدبہ جس کا لازمہ خوف ہوتا ہے۔ کسی کے سامنے اظہارِ عجز کے لئے تنکا لینے کی رسم کبھی رہی ہو گی جو بیانِ شعر میں چلی آتی ہے مگر اتنا تو اب بھی ہے کہ تکلیف کے وقت منہ سے بے ساختہ چیخ کی آواز کو نکلنے سے روکنے کے لئے دانتوں میں چھالیہ کی ڈلی یا کوئی چیز دبا لیتے ہیں۔ نے شاخ کے ذریعہ بوئی جاتی ہے جس کو ریشہ نے کہتے ہیں اصطلاحِ شعر میں صدائے نے کو نالۂ نے کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ قاتل جو میرے نالوں کے شور سے بیزار ہو کر مجھے قتل کرنے آیا تو میں نے اظہارِ عجز کے لئے یا اس خیال سے کہ جبڑا بند کر لیا جائے گا تو آواز نہیں نکلے گی دانتوں میں تنکا دبا لیا لیکن نالوں کی راہ اتنا بڑا بند لگا دینے سے بھی نہ رکی چنانچہ ان کے اثر سے جو تنکا دبا لیا تھا وہ ریشۂ نیستاں ثابت ہو گیا اس سے ہزاروں نے اور لاکھوں نالے نکلنے لگے۔

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

ہر داغِ غم جس کو میں نے خاکِ دل میں دفن کر رکھا ہے سروِ چراغاں یعنی شررہائے آتش کا اک بیج ہے جو فی الحال بویا جا چکا ہے۔ اب اگر زمانہ نے فرصت دی یعنی میں اس کشتِ آتش بیز کی آبیاری کرنے کے لئے زندہ رہا تو تماشا دکھا دوں گا جبکہ ہزاروں سروِ چراغاں کے درخت میرے سینہ سے پیدا ہوں گے یعنی ابھی تو اپنے داغہائے دل پر صبر کرتا جاتا ہوں جب نالہ کشی کا وقت آئے گا تو ہر طرف آگ لگ جائے گی۔

(ناطق) ابھی تو تلخیِ ایام پر ہم صبر کرتے ہیں
یہ کڑوے گھونٹ دیکھیں حلق سے کب تک اترتے ہیں

(غالب) میں بھی بتاؤں گا تمہیں مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ ہستی سے گر ملے

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

جس طرح پرتوِ خورشید سے شبنم اڑ جاتی ہے اسی طرح تیرے جلوے نے آئینوں کی آب اُڑا دی۔

(ناطق) جوہر کو چشمِ شوخ کا عکس آ کے لے اُڑا آئینے بزمِ ناز میں پتھر کے ہو گئے

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرمِ دہقاں کا

خونِ گرم سرگرمی محنت یا محنت کے بعد جو دوران ہوتا ہے۔ کثرتِ محنت کے لئے خون کو جلانے کا محاورہ بھی ہے۔ ہیولیٰ مادّہ صورت کو ہیولیٰ کی مناسبت سے لائے اور طرزِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کھینچ کر لائے جس ہیولیٰ و صورت کا حسنِ بیان پیدا ہو گیا گو ہیولیٰ اور صورت کی یہاں بحث نہیں۔ اسی کو اکثر نااہل مدعیانِ تقلیدِ غالب ہوتے ہوئے بھی نقصِ کلام ٹھہراتے ہیں حالانکہ علمِ بیان میں بھی حسنِ بیان ہے مگر وہ غریب کیا جانیں کہ علمِ بیان کس چیز کا نام ہے۔ مطلب یہ کہ جس طرح دہقاں کی محنت جو وہ کلبہ رانی سے لے کر خرمن اندوزی تک مہینوں کرتا ہے برقِ خرمن سوز کا مادہ بن جاتی ہے یعنی خرمن اندوزی سے خرمن سوزی کی شکل

22

پیدا ہوتی ہے کہ اگر خرمن ہی نہ ہو تو برق جلائے کس کو اور خرمن سوز کیونکر بنے اسی طرح میرے صانع کی تکلیفِ وجود یعنی میرا پیدا کرنا ہی میری بربادی یا ہلاکت کا سبب ہے اگر یہ وجود ہی نہ ہوتا تو معرضِ خرابی یا موت کون ہوتا خود مصنف نے اس شعر کی جو اسی کا دوسرا خاکہ ہے ایسی ہی شرح کی ہے۔

(غالب) کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت خونِ گرم دہقاں ہے

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

خاموشی پسند کو بے زبان کہتے ہیں شعلہ شمع کی زبان کہلاتا ہے۔ چراغِ کشتہ کو شمع خاموش کہتے ہیں۔ چراغِ گورِ غریباں یعنی سوگوار و بیانِ حسرت آتا ہے جس میں مردہ ہونے سے مزید افسردگی پیدا ہو گئی۔ مطلب یہ کہ لاکھوں خون گشتہ آرزوؤں پر میری بے زبانی اور خاموشی کی مثال ایسی ہے جیسا کہ گورِ غریباں کا چراغِ کشتہ یعنی میں سراپا بیان ملالِ بیکسی ہوں۔

(ناطق) اے دلِ تکیہ وارِ شوق حاصلِ سوز کیا کہوں
جی ہی پگھل کے رہ گیا شمع مزار دیکھ کر

اب دیکھئے شعر میں ذم کا پہلو کس طرح پیدا ہو جاتا ہے یا یار لوگ کس طرح پیدا کر لیتے ہیں آپ سارے ہندوستان سے قطع نظر کر کے صرف لکھنؤ کی موجودہ زبان میں اس شعر پر غور فرمایئے۔ الفاظ یہ ہیں "خموشی میں" وہ بھی "نہاں" اس پر "خوں گشتہ" مع آرزو پھر "چراغ" اس کے بعد "مردہ" اور "گور" سقاہت اجازت نہیں دیتی کہ مزید تشریح کی جائے۔ وہی مثل ہے کہ کہیں کی گالی اور کہیں کی بات یہ تو ایک بدمستی ہوئی کہ کسی شعر پر کہیں کے محاورے کے مطابق ذم کا پہلو چسپاں کر دیا جائے لیکن شعر ایسے خیالی میں اکثر ایسے الفاظ لکھ جاتے ہیں کہ زبانِ عام کے لحاظ سے بھی ذم کا پہلو پیدا ہو جاتا ہے اور محویتِ فکر میں غریب شاعر کا اس طرف خیال نہیں جاتا جسے نکتہ چیں لے اڑتے ہیں میرے خیال کے مطابق اس عیب سے کسی شاعر کا کلام پاک نہیں اور ایسے اعتراضات کرنا صرف عجیب جو کی تنگ خیالی کی دلیل ہے۔ اس کی مثال ایک اور ملاحظہ کیجئے۔

خیال زلف نے چھوڑا نہ بعد مردن بھی ہماری قبر میں مارِ عذاب ہو کے پھری

جب یہ شعر لکھنؤ میں پڑھا گیا تو مشاعرہ کشت زعفران بن گیا اور شاعر نے دوسرا مصرع عذاب چھوڑ کر دہرانے والوں کو ہزاروں گالیاں دیں۔

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھانس کے ہے میرے درباں کا

ویرانی تماشا کر فارسی کا ترجمہ اور مصنف کا خاص طرزِ بیان ہے جو انھیں کے لئے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کہتے ہیں دیکھئے خانہ ویرانی کا یہ عالم ہے کہ گھر میں جس طرف نظر اٹھائیے سبزہ ہی سبزہ اُگا ہوا دکھائی دیتا ہے اس بے سرو سامانی کی حالت میں چونکہ درباں کا درماہہ دے نہیں سکتے اس لئے وہ بیچارہ گھانس کھود کر گزر کرتا ہے۔ یا یہ کہ درباں کا درماہہ دینے کے لائق کبھی نہ تھے اس لئے ویرانی سے یہ فائدہ ہوا کہ گھر میں کثرت سے گھانس اُگ آئی اور درباں کے گزارہ کی سبیل نکل آئی۔

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

حجرۂ زنداں تنگ و تاریک ہوتا ہے۔ دل میں افسردگی سے تنگی پیدا ہو گئی جس کے لئے اسے حجرۂ زنداں سے تشبیہہ دی۔

(ناطق) کلفتیں بڑھ کے حریفِ غمِ ہستی ہو جائیں
دل کو اتنا تو کریں تنگ کہ زنداں کر دیں

افسردگی ترکِ آرزو کا بھی سبب ہوتی ہے۔ حضرتِ یوسف کے زنداں کے متعلق مشہور ہے کہ جب زلیخا انھیں قید خانہ میں بھیج کر نادم ہوئی تو زنداں میں نقش و نگار اور ان کی دلبستگی کے سامان فراہم کرا دیئے تھے۔ کہتے ہیں کہ افسردگی پر بھی چونکہ ہنوز تمنا باقی ہے یعنی آرزو کو ترک نہیں کیا اس لئے دل میں نقشِ خیالِ یار کی رنگینی و حسن موجود ہے تو اس کی تنگی و رنگینی کی بدولت دل کی حالت زندانِ یوسف کے حجرہ سے مشابہ ہوئی۔

(23)

بغل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا

آپ جو میرے خواب میں آ کر تبسمِ پنہاں کا نظارہ دکھا رہے ہیں اس کا سبب معلوم ہوتا ہے کہ آج آپ کہیں غیر کے آغوش میں محوِ خواب ہیں کہ یہ سونا در پردہ میری قسمت پر ہنسنا ہے جس کا نظارہ میں خواب میں دیکھ رہا ہوں۔ اِس قسم کے مضامین لکھنے سے آج کل اجتناب کیا جاتا ہے اور میں تو غیر کے تفوق کو اپنی شاعری کے لئے ننگ سمجھتا ہوں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ غالب نے اس شعر میں خوبی بیان کو چھوڑ دیا ہے خیال جیسا بھی ہے اور اس زمانہ کے لائق مگر طرزِ بیان نہایت اچھا ہے۔

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا
قیامت ہے سرشک آلود ہونا تیری مژگاں کا

لہو پانی ہونا کمالِ رنج و محنت کے مقام پر بولا جاتا ہے مگر زیادہ فصیح محاورہ خون پانی ہونا ہے اور محاورہ میں تصرف جائز نہیں ممکن ہے کہ ان کے زمانہ میں یہ محاورہ یوں ہی بولا جاتا ہو چنانچہ لفظ پیر بمعنی پاؤں جہاں تک مجھے علم ہے کسی نے نہیں لکھا لیکن اردو میں بے سر و پا محاورہ کا ترجمہ بے سر پیر ہی درست محاورہ ہو گا یہاں کوئی پیر کی جگہ پاؤں استعمال نہیں کر سکتا چنانچہ حضرت داغ نے اسے بجنسہ نظم کیا ہے کیونکہ شعر کہتے وقت محاورہ کا خیال تھا پاؤں کی فصاحت کا سوال نہ تھا۔

(داغ) کیوں دعوئے سراپا نہ ہو غلط جب اُس کی بات کا کوئی سر ہو نہ پیر ہو

کہتے ہیں تیرے مژگاں اور اشک آلودہ ہوں کیسے غضب کی بات ہے خدا جانے یہ نظارہ دیکھ کر کس کس کا خون پانی ہو گیا ہو گا کیونکہ یہ تیرے غمگین ہونے کا ثبوت ہے اور عالم کی خوشی اس میں ہے کہ تو ہمیشہ خوش نظر آئے تجھے غم سے واسطہ کیا اسی سے ملتا ہوا ان کا یہ شعر ہے۔

(غالب) غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموز بتاں
کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

عالم کے اجزائے پریشاں کی جادۂ راہِ فنا سے شیرازہ بندی ہوتی ہے یعنی معاملۂ فنا میں سارے اجزائے عالم ایک دوسرے سے مربوط ہیں کہ سب فنا ہوتے ہیں اور فنا ہو کر سب کی ایک حیثیت ہو جاتی ہے اس لئے ہماری ہمہ گیر نگاہ عالمِ وجود کی پریشانی سے ہٹ کر صرف ایک جادۂ فنا پر پڑتی ہے کہ یہی ساری پریشانیوں کا انجام یا علاج ہے۔ حاصل یہ کہ نگارستانِ عالم کی منتشر دلفریبیاں ہماری نظر کو پریشان نہیں کر سکتیں کیونکہ ان سب کی بے ثباتی کو ہم دیکھ رہے ہیں۔

(۱۰)

نہ ہو گا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

ماندگی تھکن یک بیاباں ماندگی شدتِ ماندگی زورِ ماندگی۔ یہ مصنف کی خاص ترکیب ہے جس کو شاید انھوں نے اس سے نکالا ہے کہ سارا بیاباں گھوم لینے کی تھکن۔ موجِ رفتار کو آبِ رواں سے تشبیہ دی کہ یہ بھی اپنی رفتار میں تھکتا نہیں روانیِ آب میں حباب اسی وقت پیدا ہوتے ہیں جبکہ اس میں جوشِ تموج ہو۔ مطلب یہ کہ جس طرح حباب سے روانیِ آب میں جوشِ تموج کا پتہ چلتا ہے اس طرح میرے نقشِ قدم کا اندازِ پا اپنی ہمہ ماندگی ذوق و زورِ رفتار کا نشان ہے جو کسی طرح کم ہونے والا نہیں۔ اس قافیہ میں مجھے استاد حضرت داغ دہلوی کا شعر یاد آیا جس میں ایک محاورہ کو بڑی خوبی سے نظم کیا اور جو سادگی کی راہ چلا جا رہا ہے۔

(داغ) سلامت منزلِ مقصود تک اللہ پہنچا دے
مجھے آنکھیں دکھاتا ہے ہر اک نقشِ قدم میرا

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بد دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

ناک میں دم آنا گھبرانا پریشان ہونا متنفر ہوجانا۔ بد دماغی بمعنی مغرور آتا ہے یہاں مصنف نے بمعنی نفرت استعمال کیا جو ان کے لئے جائز ہے کہتے ہیں مجھے پہلے چمن سے محبت تھی لیکن اب تو کچھ ایسی نفرت ہوگئی ہے کہ موجِ بوئے گل سے بھی ناک میں دم آتا ہے یہاں چمن سے مراد ہے باغ عالم گل سے عشرت اور موج بوئے گل سے خیال عشرت

(۱۱)

سراپا رہنِ عشق و ناگزیر الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

مجھ سے عشق کبھی نہیں چھوٹتا اور الفتِ ہستی سے بھی مفر نہیں گویا میں اپنی خرمنِ وجود پر بجلی کو بھی دعوت دیتا ہوں اور اس کے جل جانے کا بھی مجھے افسوس ہے یعنی یہ کہ میں زندگی کی متضاد کشمکش میں مبتلا ہوں۔

بہ قدر ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

ساحل کی قدرتی مڑی ہوئی شکل خمیازہ کش سے مشابہ ہوتی ہے۔ ساحل کو تشنہ بھی باندھتے ہیں اور اس کا خمیازہ دائمی سمجھا جاتا ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ خمار کا لازمہ ہے خمیازہ یعنی انگڑائی علامت ہے خمار کی۔ کہتے ہیں اے دریا دل ساقی میرا خمارِ تشنہ کامی تری عالی ظرفی کا جواب ہے یعنے اگر تیرا دریائے فیض ہر وقت جاری ہے تو یہاں کب ہل من مزید کا عالم نہیں۔

(۱۲)

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

حجاب سے مراد ہے حجابِ ذات یعنی وجودِ موجودات جنھیں غیرِ ذات سمجھا جاتا ہے اور جن کی تعبیر حجابات سے ہوتی ہے۔ حجاب کے لفظی معنیٰ ہیں پردہ جس سے کسی چیز کی آڑ ہو یا چھپائی جائے اور پردہ ساز موسیقی کے سُر کو بھی کہتے ہیں مطلب یہ کہ ہر پردہِ ظاہر سے ایک نغمۂ حقیقت بلند ہو رہا ہے مگر تو اس سے کچھ سمجھ اور پہچان نہیں سکتا تو یہ خود تیری اجنبیت ہے کہ تو ان تال سروں سے آشنا نہیں۔ آیۃ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

نظارۂ معشوق بہارِ زندگی اور حیرتِ نظارہ سے عاشق کا رنگ فق ہو کر سفید پڑ جانا صبحِ بہار۔ موسم بہار کی صبح پھولوں کے کھِلنے کا وقت ہے مطلب یہ کہ جس طرح صبحِ بہار کا عالم دیکھکر پھول کھلتے ہیں اسی طرح وہ گلزارِ ناز دمِ نظارہ مجھے محوِ حیرت دیکھ کر باغ باغ ہوجاتا ہے اور ہزاروں انداز سے ناز آفرینی کرتا ہے۔ یا رنگِ شکستہ وہ ہلکا رنگ جو مجاہدے سے اہلِ ذکر کے چہرے پر پیدا ہوتا ہے یا رنگِ شکستہ سے مراد ہے سالک کی نظر میں دنیا کا ہیچ اور بے رونق ہوجانا۔ کہتے ہیں ایسی حالت کا پیدا ہوجانا صبحِ بہارِ نظارہ ہے کہ جب نگاہِ حق بیں میں دنیا کا رنگ شکست ہوجاتا ہے تو اس وقت اس کے سامنے گلہائے نازِ معرفت شگفتہ ہوتے ہیں۔

تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

افسوس! کے ساتھ معشوق سے کہتے ہیں کہ میں تو تیرے عشقِ مژگاں کے صدمے اٹھاؤں اور تیری نظرِ عنایت دشمن پر تیز رہے۔

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں
طُعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جانگداز کا

مصنف نے یہاں صرفہ بمعنی فائدہ استعمال کیا ہے اور اسی طرح اس مصرعہ میں بھی انھوں نے اس لفظ کو اس معنیٰ میں لیا ہے۔ ع
"بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر"۔ مگر اس معنیٰ میں یہ لفظ اردو کے استعمال کا نہیں ہماری زبان میں صرفہ بمعنی خرچہ بولا جاتا ہے۔ متاخرین کے نزدیک فارسی کے ایسے الفاظ کا مفرد استعمال جو اردو کے روزمرہ میں داخل نہیں ہوئے ہیں درست نہیں اور ایسے لفظ تو اور بھی قابلِ اجتناب ہیں جن کے کہ زبان اردو میں دوسرے معنیٰ پیدا ہو گئے ہیں کہ ان سے دھوکہ ہوتا ہے۔ شعر کا مطلب یہ کہ ضبطِ آہ میں خود میرا فائدہ ہے ورنہ اگر رخصتِ آہ مل جائے .... تو ایک ہی نفسِ گرم سے یہاں کام تمام ہے۔ اس طرح معشوق نے جو حکم ضبط دے رکھا ہے وہ گویا مجھ پہ ایک احسان ہے۔

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اوچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

شیشہ بازی ایک فنِ رقص ہے جس کا وجود مدراس کے علاقہ میں ہنوز باقی ہے۔ مولانا آسی نے مجھے بتایا کہ نواحِ دہلی میں بھی اس کے جاننے والے موجود ہیں مگر میں نے یہ کھیل وہاں نہیں دیکھا۔ شیشہ بازی کے ماہر شیشوں مٹکیوں بلکہ گھڑوں کو سر پر رکھ کر رقص کرتے ہیں جس میں ہاتھ کی امداد کے بغیر ناچتے ہوئے شیشہ یا گھڑا اسی سطح سر پہ گھمایا جاتا ہے اوچھالا جاتا ہے اور پھر بدستور سر پہ آ کر گھومنے لگتا ہے اور گرتا نہیں۔ مطلب یہ کہ بادۂ سرجوش جو بھرا ہوا رکھا ہے اس اثر سے شیشے اس طرح اوچھل رہے ہیں کہ محفل میں رقص القوا دیر کا عالم نظر آتا ہے گویا ہر گوشۂ بساط شیشہ باز کا سر بنا ہوا ہے۔

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہِ نیمباز کا

کاوش یعنی کوشش وتدبیر کو بہ لحاظ گرہ کشائی ناخون سے تعبیر کیا۔ دل کو اہلِ تصوف بستہ گرہ سے تعبیر کرتے ہیں جس میں کاوش یعنی مجاہدے سے رفتہ رفتہ کشادگی پیدا ہوتی ہے۔ قرض بمعنی حق۔ رسوم شادی وغیرہ میں بہنیں اور لڑکیاں نیز اہلِ خدمت اپنے مروجہ حقوق کو قرض کہہ کر طلب کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ سابقہ کاوش کی بدولت جو ناتمام تھی دل میں نیمباز گرہ کی صورت پیدا ہو کر رہ گئی ہے اس لئے اب دل ناخنِ تدبیر سے کاوش یعنی حقِ باقی ماندہ کا متقاضی ہے۔ "کرے ہے" بمعنی کرتا ہے اب اردو کے عام استعمال کا لفظ نہیں لیکن نواحِ دہلی میں بولا جاتا ہے۔

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

غمِ ہجراں کی کاوش نے میرے سینہ کو جو گہر ہائے راز کا دفینہ تھا کھود کر برباد کر دیا یعنی اضطرابِ ہجر میں مجھے طاقتِ ضبط نہ رہی اور سب راز افشا ہو گئے۔

(۱۳)

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

شاہنشاہ، شاہ شاہاں جسے انگریزی میں "امپرر" کہتے ہیں یہ لفظ فارسی ہے لیکن چونکہ ایک زمانہ میں ایران کا عرب پر بھی اثر رہا ہے اس لئے عرب بھی اسے بولتے تھے اقوالِ رسول میں بھی موجود ہے یعنی حدیثِ نبوی ہے کہ خدا کے نزدیک بدترین شخص وہ ہے جسے شاہنشاہ کہا جائے پیغمبر اسلام نے لفظ شاہنشاہ استعمال کیا حالانکہ اس معنیٰ میں عربی کا لفظ ملک الملوک ہوگا اس سے یہ بھی معلوم ہوتا

ہے کہ بانیِ اسلام ملوکیت کو کیسی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ گنجینۂ گوہر اشعار کے دفتر کو بنایا جو بزمِ شاہی میں پہونچ کر تابِ سخن سے ہو گیا کمال جب ہی چمکتا ہے جب اہلِ کمال کی قدر افزائی ہو یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ موجد ہے اور ہندوستان ہیچ۔ بزمِ شاہی میں شاعری کی قدر ہوئی تو گوہرِ مضمون کے برآمد ہونے کا راستہ کھلا کہ خریداری ہی کے بھروسہ پر کان کنی ہوتی ہے۔ یہ دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ یہ دروازہ ہمیشہ کھلا ہی رہے کہیں درباری تلون کی نذر نہ ہو جائے جیسا کہ اسی صدی کی ابتدا میں رام پور کے دربار میں شاعری کے بہ شور اشوری آنے اور بے نمکی نکالے جانے کا تماشا ہو کر رہ گیا ہے۔ یا یہ کہ مصنف نے اس شعر میں دربارِ شاہی کے لئے دعائے خیر کی ہے کہ خدا اسے قائم رکھے جہاں اہلِ سخن کی قدر ہونے لگی ہے۔ فارسی میں شاہنشاہ اور شہنشاہ برابر کے لفظ ہیں لیکن اردو میں شہنشاہ مستعمل ہے۔

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بت کدہ کا در کھلا

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انجمِ رخشندہ کے سہانے منظر کو بزمِ بتاں کے دلفریب نظارہ سے تشبیہ دے رہے ہیں لیکن فی الحقیقت بتکدہ کے منظرِ تاباں کو تاروں بھری سہانی رات سے تشبیہ دینا منظور ہے۔ یا بت کدہ سے مراد ہے بزمِ حسن۔ کہتے ہیں انجمِ رخشندہ کا منظر جو کھلا ہے وہ ایسا پیارا معلوم ہوتا ہے گویا پرستان کا دروازہ کھل گیا۔ شب ہوئی کی ترکیب اب اچھی نہیں سمجھی جاتی کہ غیر مانوس فارسی لفظ کا استعمال اردو ترکیب سے نامرغوب ہے۔

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

نشتر برائے فصد جو جنون کا علاج ہے۔ کہتے ہیں گو میں دیوانہ ہوں لیکن ایسے دغاباز دوست کے فریب میں نہیں آ سکتا جو چارہ سازی کے بہانہ سے میری جان لینا چاہتا ہے۔ "گرچہ" اردو کا لفظ نہیں اس کی جگہ اگرچہ لکھنا چاہئے اور ترکیب ہوں کیساتھ ایسی ہی ہوئی جیسی کہ پچھلے شعر میں شب کی ہوئی کیساتھ۔ لفظ پر بھی متروک ہو چکا

گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

پری حسن کے لئے مشہور ہے اسی لحاظ سے معشوق کو پری رو اور پری پیکر لکھتے ہیں۔ کھلا بے تکلف ہوا۔ کہتے ہیں گو معشوق کے داؤں پیچ کو میں نہیں سمجھ سکتا تو بھی میرے لئے کیا یہ کچھ کم خوشی کی بات ہے کہ وہ مجھ سے بے تکلف ہو کر ملتا ہے اب اگر اس میں کوئی چال ہے تو ہوا کرے میری تو مطلب برآری ہوتی ہے۔ اس شعر کے مفہوم سے کچھ ملتی ہوئی اردو کی یہ مثل ہے۔ "یار کی یاری سے کام اس کے فعلوں سے کیا کام"

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

حسنِ عمل کا ثمرہ یہ ہے کہ بقولِ مشہور نیک بندوں کی قبر میں جنت کا ایک دروازہ کھل جاتا ہے۔ کہتے ہیں میرا خیالِ حسن بھی خیالِ حسنِ عمل کا جواب ہے کہ ایک نوبہارِ حسن کی یاد میں گویا باغِ خلد کی بہاریں میرے پیشِ نظر ہیں جسے یوں سمجھنا چاہیے کہ جنت کا ایک دروازہ میری قبر کے اندر کھلا ہوا ہے۔

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

کھلا یعنی زینت دی۔ منہ نہ کھلنے پر نقاب کھلا اور وہ بھی زلف سے بڑھ کر اس پر عالمِ حسن یہ کہ کبھی نظر سے گزرا ہی نہ تھا۔ مضمون کچھ بہت بلند نہیں لیکن الفاظ کی ترکیب نے عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے جو ایک اہلِ زبان کے لئے سمجھانے سے زیادہ سمجھنے سے تعلق ایسے ہی رکھتی ہے اشعار نے غالب کو غالب بنایا ہے اور یہی وہ بات ہے جو ہر کسی کو میسر نہیں۔

کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول
آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

میری شبِ غم اندھیری کیوں ہے اس لئے کہ آسمان سے نئی نئی بلائیں نازل ہو رہی ہیں جن کا تماشا دیکھنے کے لئے ستاروں کی چمکیلی نگاہیں ادھر یعنی اوپر کی طرف لگی ہوئی ہیں اور جب ستاروں نے اِدھر سے اُدھر رُخ پھیر لیا ہے تو ادھر روشنی کیونکر رہتی۔ یا یہ کہ مجھ پر نزولِ بلایات کا منظر ایسا خوفناک ہے اور میں ایسی مصیبت میں ہوں کہ ستاروں سے دیکھا نہیں جاتا اس لئے انھوں نے رخ بدل لیا ہے۔ یا یہ کہ دورِ کواکب کو نزولِ رنج و راحت کا سبب سمجھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں شبِ غم کے تاریک ہونے کا سبب یہ ہے کہ ستاروں کو بے مروت ہو کر مجھ پر بلائیں نازل کرنا ہے اس لئے انھوں نے آنکھ پلٹا لی۔ بے مروتی کرنے کے لئے اردو میں آنکھ بدل لینے اور آنکھ پھیر لینے کا محاورہ ہے۔ اُدھر کو بمعنی اس طرف اس ترکیب سے اب نہیں لکھا جاتا۔

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

رہنے کی اجازت بھی دے دی اور جب تک میں نے بستر کھولا مکر بھی گئے۔ ع "اللہ رے تلون ابھی کیا تھے ابھی کیا ہو" یا یہ کہ اس نے مجھے بستر کی کھول باندھ میں لگانے کے لئے مذاق کیا۔

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

انگریز خبرِ مرگ کو موٹے سیاہ خطوط میں لکھتے ہیں اور ہمارے تو تعلیم یافتہ بھی ایسا ہی کرنے لگے ہیں مگر اس ملک میں پہلے یہ رواج تھا کہ ایسے خطوط کھلے لفافہ میں روانہ کئے جاتے تھے اور اب یہ ہے کہ خط کا کونا پھاڑ دیا جاتا ہے۔ آج کل کھلے لفافے میں سستا ٹکٹ لگانے کے لئے چھپے ہوئے مضامین یا خط بھیجے جاتے ہیں چاہے ان میں شادی کی دعوت ہی کیوں نہ ہو۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ جب وطن میں حوادث کی یہ کثرت ہو کہ نامہ بر وہاں سے اکثر کسی نہ کسی کی خبرِ مرگ ہی لے کر آتا ہے تو میں غربت میں کیونکر خوش رہ سکتا ہوں اور کیا اطمینان نصیب ہو سکتا ہے۔ انسان تو غریب الوطنی اسی لئے اختیار کرتا ہے کہ حصولِ زر ہو اور متعلقین کی مدد

کر سکے جب متعلقین ہی مرتے جائیں تو غربت میں رہنے کی کیا خوشی ہو سکتی ہے۔

اس کی اُمت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا

گنبدِ بے در آسمان۔ یہ خیال اہلِ حکمت نہ صرف یہ کہ آسمان بے دروازہ ہے بلکہ اس میں خرق والتیام محال بھی ہے۔ گنبدِ بے در کھلا کا اشارہ ہے معراجِ سید المرسلین کی طرف یعنی وہ ایسی ذاتِ والا تھی جس کے لئے محال بھی ممکن ہو گیا۔ کہتے ہیں جب میں اس شاہ امم کی امت میں ہوں تو میرے لئے ممکناتِ عالم کا حصول کیوں کر محال و ممتنع ہو جائے گا اور میرے کام کیوں بند رہیں گے۔

(۱۴)

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوّالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

شعلۂ جوالہ گھومتا ہوا شعلہ جس سے آتشیں حلقے کی شکل پیدا ہو جاتی ہے حلقۂ گرداب بھنور کا چکّر۔ یہ مطلع مع اشعارِ مابعد کے ایک قطعہ ہے جس میں شبِ ہجر کا بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں آج رات کو جبکہ میری برقِ سوزِ دل کے اثر سے ابر کا پتّہ پانی ہو رہا تھا اور ہر حلقۂ گردابِ آب ایک شعلۂ جوالہ بنا ہوا تھا یعنی پانی میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ آگے چلئے

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناگیرِ خرام
گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

بالش تکیہ۔ عناگیر باگ پکڑنے والا روکنے والا مانعِ خرام۔ کہتے ہیں وہاں تو تکلیفِ کرم فرمائی کرنے یعنی میرے گھر تک آنے کے لئے عذرِ بارش مانعِ رفتار تھا اور یہاں بارشِ گریہ کی یہ شدت تھی کہ اس کے جوش میں تکیہ کی روئی سیلاب کا جھاگ معلوم ہوتی تھی۔ آگے چلئے۔

وَاں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

موتی جب کس کر پرو دئے جائیں تو پھر دھاگہ نظر نہیں آتا۔ مطلب یہ کہ وہاں تو ذوقِ خود آرائی میں موتی پرونے کی دُھن لگی ہوئی تھی اور یہاں گریہ فراق میں اشکوں کا وہ ہجوم تھا کہ ان کے سلسلۂ اتصال میں تارِ نگہ بھی گم ہو گیا تھا یعنی وہاں تو خود آرائی کے شوق میں کسی کی پرواہ نہ تھی اور یہاں رونے کے آگے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ آگے چلیے۔

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبِ جو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

وہاں یعنی گلزارِ ناز میں یا معشوق کی چمن آرائی کی بدولت تابِ گل کے عکس سے آبِ جو چراغاں ہو رہا تھا اور یہاں آنکھوں سے ڈھلکتے ہوئے خون کی ندی بہہ رہی تھی۔ آگے چلیے۔

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

یہاں نفس بزمِ بیخودی کی شمع روشن کرتا تھا اور وہاں خبر داری کی رنگ رلیوں کا یہ عالم تھا کہ فرشِ گل پر سلیقہ کے ساتھ بزمِ صحبتِ احباب گرم تھی۔ پڑھے جایئے۔

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

کسی مصدر کا باب اس کی گردان یعنی ماضی حال مستقبل واحد جمع غائب حاضر متکلم۔ مطلب یہ کہ وہاں تو بڑی گرم جوشی کے ساتھ ہر طرف رنگ آرائیاں کی جا رہی تھیں اور یہاں گویا سارے جہان کو آگ لگی ہوئی تھی۔ واں اور یاں کا استعمال اب متروک ہے۔ وہاں اور یہاں لکھتے اور بولتے ہیں۔

ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

اس فضائے مذکورۂ بالا میں دل جو ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا یعنی مجروح ناخنِ غم تھا اور ذوقِ درد حاصل تھا ناگہاں اس طرح خونابہ ٹپکانے لگا یعنی اثرِ ماحول سے زخم پھٹ گئے اور ذیل کے اشعارِ خوں آگیں بہہ نکلے۔ گو بیانِ غزل کا یہ طریقہ نہیں کہ درمیان میں مطلع لایا جائے مگر مصنف نے اپنے نہجِ بیان میں مندرجہ ذیل شعر لکھ کر مطلع لکھ دیا جو قصیدے یا قطعہ کا طرزِ بیان ہے۔ اصل غزل جو ان کے اسدؔ تخلص والے زمانہ کی ہے اس میں یہ طرزِ بیان نہیں بلکہ بیچ میں مقطع لکھ کر انھوں نے دو غزلیں علیحدہ کر دی تھیں وہ مقطع یہ ہے۔

(غالب) واں ہجومِ نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسدؔ
ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا

سپند کالا دانہ جو نظر بد کے دفعِ اثر کے لئے جلایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سوز سے دانہ کو کچھ حاصل نہیں بلکہ کوئی غیر اس سے مستفید ہوتا ہے کہ اس کی نظر اتر جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ شبِ وصلِ غیر میں گو ہمارا دل بیتاب ہو کر صرف نالۂ سوزاں رہا لیکن نالہ کی بے اثری سے دشمن فائدہ اٹھاتا رہا کہ اس کا کچھ نہ بگڑ سکا اس لئے دلِ سوزاں گویا سپندِ بزمِ وصلِ غیر تھا یہاں تشبیہ بادنیٰ الملابست ہے کہ مصنف نے کچھ نہ بگاڑ سکنے کو فائدہ پہونچانے سے تعبیر کیا ہے۔

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

سازِ صدائے آب جلترنگ جو سات عدد پیالوں میں کم زیادہ پانی بھر کر بجایا جاتا ہے۔ اور جس سے حسبِ مقدارِ آب ہلکی بھاری آوازیں پیدا ہو کر دلفریب

(29)

باجہ ہو جاتا ہے اس کا موجد افلاطون تھا۔ مطلب یہ کہ عاشق کے لئے اس کا مکان گویا سامانِ جلترنگ کہ یہاں آکر شورِ سیلاب آہنگِ نشاط ثابت ہوا۔

نازشِ ایامِ خاکسترنشینی کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

بسترِ سنجاب ایک چھوٹے جانور کے پوست کا خاکستری نرم بچھونا جو قیمتی ہونے کی وجہ سے صرف اہلِ دولت کو نصیب ہوتا ہے۔ تعلقاتِ دنیاوی جس قدر کم ہوتے ہیں اسی قدر انسان کو عیشِ بےفکری حاصل ہوتا ہے۔ خاکستر راکھ جو مٹی سے نرم ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ اُن ایامِ قناعت کی یاد بھی کس قدر انسان کو فخر و ناز ہے جبکہ میں بسترِ خاکستر پر دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر آرام کرتا تھا اور مجھے وہاں بسترِ سنجاب کا لطف آ رہا تھا۔

(ناطق) ہوا نہ خاک نشینی سے عار ناطق کو
شکستہ دل بسر بو تراب ہو نہ سکا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا

جنون سے مراد ہے انہماک کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص فلاں شخص کی تلاش میں دیوانہ ہو رہا ہے۔ جنونِ نارسا سعیِ ناشکور۔ کہتے ہیں عالمِ وجود کا تو ہر ذرہ روکشِ خورشید درخشاں تھا مگر افسوس! میرا وجودِ ناقابل سعیِ نارسا کی بدولت کسبِ ضیا نہ کر سکا ہائے اس نے کچھ نہ کیا یعنی انوارِ حقیقت عالمِ مجاز کے ہر ذرہ سے ہویدا ہیں اگر کوئی انھیں یہاں نہیں پا سکتا تو یہ خود اس کا قصور ہے میں نے اس مضمون کو ذرا اچھا کر یوں لکھا ہے۔

(ناطق) کھڑی ہے سعیِ ناشکور بہر عذرِ ناکامی
تمہارے کام تے ہم تھے ہمارا کام مشکل تھا

"کچھ نہ کی" کا طرزِ بیان یوں درست نہیں سمجھا جاتا ایسے محلِ استعمال میں "کچھ نہ کیا" ہونا چاہئے ممکن ہے مصنف کا خیال کسبِ ضیا کی طرف گیا ہو اس لئے

کچھ نہ کی لکھ دیا۔

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

کل تک تو تیرا دل بھی محبت اور وفا کا دروازہ تھا کہ تو ہر طرح لوگوں کی دلجوئی کر کے اپنے دام میں لاتا تھا پھر آج یہ کیسا انقلاب آ گیا ہے اور کیا بات ہو گئی کہ تجھے اپنے اسیروں کی پروا نہیں۔ "تلک" کو اب بھی لوگ لکھتے ہیں مگر فصحا کے نزدیک یہ لفظ عرصہ سے متروک ہے۔

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

حلقۂ دام دیدۂ بے خواب کی طرح کھلا رہتا ہے۔ کہتے ہیں وہ دن بھی یاد ہیں جب تجھے لوگوں کو اپنے دامِ عشق میں پھانسنے کی فکر رہتی تھی اور تو اسی تگ و دو میں بےچین رہتا تھا۔ یہ شعر بھی مع ماقبل کے قطعہ ہے۔

میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے
اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

آج رات اگر میں غالب کو منا سمجھا کر روک نہ دیتا اور اسے رونے دیا جاتا تو دنیا دیکھ لیتی کہ اس کی بارشِ گریہ میں آسمان سیلاب کے بے حقیقت جھاگ کی طرح بہا بہا پھرتا۔ ایسے محل میں بیان مستقبل ہوتا ہے لیکن مصنف نے کوب تھا کہہ کر ماضی کے ساتھ بیان کیا بعض لوگ اچھا نہیں سمجھتے لیکن میرے نزدیک زورِ بیان کے لئے یہی موزوں ہے۔ متاخرین نے "وگرنہ" کو ترک کر دیا ہے اس کی جگہ ورنہ لکھتے ہیں۔

---

(۱۵)

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

ودیعت امانت۔ کہتے ہیں خونِ جگر گویا مژگانِ یار کی امانت تھی جس نے ایک ایک قطرے کا مجھ سے حساب لے لیا یعنی مژگانِ یار نے اپنی کاوش سے اس طرح میرے خونِ جگر کا قطرہ قطرہ حساب کر کے نکال لیا جس طرح کوئی امانت دار سے اپنی امانت گن گن کر پائی پائی کے ساتھ واپس لیتا ہے۔ اسی مضمون کو پہلے یوں لکھ آئے ہیں۔

(غالب) بیاں کیا کیجئے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

آئینہ سے مراد ہے آئینۂ دل جو شہرِ آرزو تھا۔ آئینہ توڑا دلشکنی کی تمثال دار تھا تصویروں کا آئینہ تھا یعنی اس میں ہزاروں نقشِ آرزو تھے۔ کہتے ہیں تو نے میری دلشکنی کر کے جس آئینہ کو توڑا ہے وہ تمثال دارِ آرزو تھا۔ اس لئے اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو یعنی آرزوؤں کے بھرے ہوئے شہر کے اجڑ جانے کا مجھے ماتم کرنا پڑ رہا ہے۔ دوسری جگہ اسے یوں لکھا ہے۔

(غالب) دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی
اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا

چونکہ میں جیتے جی راستوں کی ہوا کھاتے پھرے یعنی کوچہ گردی کا دلدادہ تھا شہر بہ شہر خستہ اور زمانہ بھر نے کا عادی تھا اس لئے اب نعش کو گلیوں میں کھینچے

پھرو کہ رسمِ زیست پس مردن بھی کچھ ادا ہو جائے۔ "کھینچے پھرو" اب متروک ہے۔ کھینچے پھرو لایا جاتا ہے گھسیٹتے پھرو ایسے موقع کے لئے زیادہ مستعمل ہے۔

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا

سراب وہ ریت جس پر دور سے پانی کا دھوکہ ہو۔ فریبِ وفا مشہور ہے اس لحاظ سے وفا کو سراب لکھا۔ کہتے ہیں سرابِ وفا کا ذرّہ ذرّہ تیغ جوہردار کی طرح قاتل اہلِ وفا تھا جو اس کے دھوکہ میں آ کر مارے گئے۔

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

جس غمِ عشق کو ہم کم جانتے تھے اسے جو غور سے دیکھا تو اب بھی باہمہ قلتِ دنیا بھر کا غم نکلا یعنی غمِ عشق جسے ہماری عالی حوصلگی کم سمجھتی رہی ہے اور جس کی فراوانی کی ہمیشہ تمنا تھی اسے ہم بھی اور لوگوں کی طرح کم ہی سمجھتے تھے لیکن اس قلت پر بھی جب دیکھا اور غور کیا تو بہت پایا۔

(۱۶)

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

پہلے مصرعہ میں دعویٰ ہے کہ ہر کام کو کما حقہٗ کر لینا آسان نہیں۔ یوں کام چلا لیا تو اس کی سند نہیں۔ دوسرے مصرعہ میں دلیل ہے کہ گو لفظ انسان ہر آدمی پر صادق آتا ہے لیکن اس پر بھی جس کا نام انسان ہے وہ ہونا ہر کسی کو میسر ہے۔

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

در و دیوار کی صورت سے ٹپک رہا ہے کہ گریۂ غم میرے خانہ بربادی کے درپے ہے۔ گھر کاواک ہو چکا ہے اور چند سے یہی حالت رہی تو اس کا ویران ہو کر بیابان ہو جانا کچھ دور نہیں۔ "چاہے ہے اور ٹپکے ہے" کا استعمال گو اب بھی نواحِ دہلی میں موجود ہے لیکن اہلِ دہلی ترک کر چکے ہیں وہ اس کی جگہ چاہتا ہے اور ٹپکتا ہے بولتے ہیں "چاہے ہے" میں تنافر کی شکل بھی موجود ہے جس سے روانی پسند شعرا اجتناب کرتے ہیں۔

(ناطق) پست ہمت نہ کبھی دیدۂ گریاں ہونا
اب بہت دور نہیں گھر سے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

اُدھر جلوہ گاہِ یار میں جو سبب حیرت ہے کہتے ہیں ہائے میری دیوانگیِ شوق کہ بار بار جلوہ گاہِ ناز میں جا کر خود اپنی حیرانی کا سبب ہوتا ہوں۔

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

دیدبازی کام ہے نگہ یعنی آنکھ کا مژگاں جس کے لوازمات سے ہے۔ آئینۂ فولاد کے جوہر مژگاں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں چونکہ جلوۂ یار متقاضیِ نظر یعنی قابلِ دید ہے اس لئے دمِ آرائش آئینہ کی صورتِ نظارہ کو نگاہِ کامل بنانے کے لئے جوہرِ آئینہ کی بھی تمنا ہے کہ مژگاں ہو جائے، "چاہے ہے" میں تنافر ہے اور روانی میں بھی جھول پڑ جاتا ہے۔

عشرتِ قتل گہہ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

دمِ قتل اہلِ تمنا کے سامانِ عشرت کا کیا بیان کروں کہ انھیں تیغِ عریاں کا نظارہ ہلالِ عید کی طرح وجہِ مسرت ہے۔

(ناطق) سرفروشی خیالِ عیشِ غوری ہیں تمنا کو بہارِ جانفزا جوبنِ عروسِ تیغِ عریاں کا

یہی ایک جوبن ہے جسے میں نے اپنی ساری شاعری میں لکھا اسی معنی میں جوبن کا استعمال میرے نزدیک جائز ہے۔ پستاں کے معنی میں نہ میں جائز سمجھتا ہوں نہ حضرتِ داغ نے جائز سمجھا نہ نواحِ دہلی میں اس لفظ کا بمعنی پستان استعمال ہے۔

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

بصد رنگ گلستاں انواع طرب سے باغ باغ ہونا۔ کہتے ہیں تیرے ساتھ عیش کرنے کی جو خوشی تھی اس کا داغ تو ہم اپنے ساتھ خاک میں لے گئے یعنی نامراد مر گئے خدا کرے کہ اب تو خود ہی پھلے پھولے۔

عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

زخمِ تمنا کھانا دل کے لئے وجہِ راحت ہے اور جگر کے زخم کو نمکداں میں ڈوبنے سے مزا آتا ہے یعنی اہلِ درد کو یا مجھے مصیبت ہی میں راحت ہے اس شعر میں ردیفین کا عیب موجود ہے۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

معشوق نے جفا سے توبہ بھی کی تو کب جب مجھے قتل کر چکا واہ کیا جلدی پشیمان ہوا۔ یہ بیانِ طنز ہے۔

(ناطق) کام آیا جب عاشق تو آپ کو رحم آیا
کیا وقت پہ کام آئے کام آئے تو کیا کہئے

(ولہ) نہ آنا تھا انھیں میرا انجام ہونا تھا
اب آ کر کیا کریں گے ہو چکا جو کام ہونا تھا

یا یہ کہ معشوق نے رسمِ جفا کی ابتدا کرتے ہی انھیں قتل کر دیا اور پھر فوراً ہی پشیمان ہو کر توبہ کر لی جس سے اہلِ ہوس کے امتحان تک نوبت نہ آئی اس پر یہ افسوس

کرتے ہیں۔

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قیمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

اس کپڑے کی قسمت پر افسوس اکرتے ہیں جو دیوانے عاشق کا گریباں بنے کیونکہ اسے بنتے ہی صد چاک ہونا ہے۔

(۱۷)

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

رستخیز اندازہ تھا قیامت کا تھا بے حد تھا۔ محیطِ بادہ جامِ شراب کا وہ خطِ منحنی جہاں تک شراب بھری جاتی ہے۔ خمیازہ انگڑائی جو علامت ہے خمار کی۔ مصنف نے خطِ ساغر کے انحنا یعنی غیر مستقیم ہونے سے مضمون اختراع کیا ہے۔ کہتے ہیں رات کو شوقِ ساقی کا خمار بھی کس قیامت کا تھا کہ محیطِ بادہ بھی خمیازہ کش نظر آتا تھا یعنی اسمیں بھی بوجہ خمار موجود تھی یا یہ کہ میرے لئے محیطِ بادہ صورت خانۂ [illegible] خمیازہ تھا کہ میں جس حد تک شراب کو بڑھاتا جاتا تھا خمار ہی خمار پیدا ہوتا تھا یعنی شوقِ ساقی میں شراب سے کوئی سرور حاصل نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ عالمِ فراق مے نوشی سرور کی جگہ میرے خمار کی تکلیف کو بڑھاتی جاتی تھی۔ بیشتر شعرا خمار کو بھی بمعنی سرور استعمال کر جاتے ہیں جو غلط ہے۔

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

یک قدم وحشت ادنیٰ وحشت۔ دفترِ امکاں فہرست موجودات یا وجودِ ممکنات یعنی ماسوا اللہ۔ دو عالم دشت دو ویران عالم یعنی دنیا و عقبیٰ۔ کہتے ہیں ممکنات نے جو مبداء ذات سے ذرا سی علیحدگی اختیار کی تو ان کے لئے دفترِ امکان

کا سبق کھل گیا یعنی بچوں کا شغل بن گئے بس یہی یک قدم دوری کا راستہ گویا دونوں عالم کا شیرازہ تھا یعنی اسی میں دنیا و عقبیٰ جو دو ویران عالم ہیں منسلک ہو گئے۔ وحدت الوجود والوں کا خیال ہے کہ ماسوا اللہ کی کوئی ہستی نہیں جو کچھ ہے وجودِ ذات ہے اور ممکنات کی ذات سے اس ذرا سی ظاہری دوری کا تام عالم امکان ہے۔ یا یہ کہ درس کھلا سبق سمجھ میں آ گیا حال معلوم ہوا۔ یعنی دفترِ امکان سے جو میں نے ذرا سی وحشت کی تو اس کی ساری حقیقت منکشف ہو گئی اور سمجھ میں آ گیا کہ دنیا و عقبیٰ میں کچھ نہیں رکھا اس لئے یہی یک جادہ قدم جو میں نے ان سے دوری اختیار کرنے میں طے کیا اس سارے دفتر کا شیرازہ تھا جس کے توڑتے ہی تمام ممکنات کا وجود میرے سامنے پریشان ہو کر بکھر گیا۔

مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے
خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

لیلیٰ کے لئے روک ٹوک کا کوئی بہانہ نہیں اب یہ دیوانی ہو کر پہونچ کیوں نہیں جاتی۔

(ناطق) مجنوں سے بھی کیا وحشت لیلیٰ کو ہے یا وحشت
گھبراتی ہے صحرا سے کیسی ہے یہ دیوانی

یہاں مصنف نے "ہے" کی جگہ تھا استعمال کیا جو نہایت فصیح محاورہ ہے فصحا خوبیِ بیان کے لئے ایسے موقع پر اسی طرح بولتے ہیں۔

پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن
دست مرہونِ حنا رخسار رہن غازہ تھا

حسن مستغنی کی رسوائیاں کیا بتاؤں کہ ہاتھ حنا کے گھر گروِ تھے اور رخسار غازہ کے پاس رہن۔ یہ اہلِ حسن کی پابندی آرائش ہر بیانِ طنز ہے اور نہایت خوب۔ یہاں بھی "تھا" بمعنی "ہے" لائے ہیں مگر اوپر والے شعر کا طرزِ بیان یہاں نہیں آتا۔

نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بہ باد
یادگارِ نالہ اِک دیوانِ بے شیرازہ تھا

دل بوجہ یادِ حسن کے اِک دیوانِ حسن و عشق تھا جس کے ٹکڑے اس کے اوراق تھے جن کو نالہ منتشر کر گیا اور اس کی بدولت اِک دیوانِ بے شیرازہ کی حالت پیدا ہو گئی چونکہ یہ انتشار نالہ سے ہوا تھا اس لئے اوراقِ دل کا غیر مربوط دیوان نالہ کی یادگار ہو کر رہ گیا۔ ایک تکلف ہے۔

(۱۸)

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

یارانِ غمگسار میرے ناخن اس لئے کاٹتے ہیں کہ میں کھجاتا ہوں جس کی بدولت زخم بھرنے نہیں پاتے میں کہتا ہوں یہ سعیِ لاحاصل ہے کیونکہ جب تک زخم بھرے گا ناخن پھر سے بڑھ آئیں گے۔ عاشقِ دیوانہ کا زخم تو بندر کا زخم ہے یہ کیونکر اچھا ہو گا جب بھرنے آئے گا خارش ہو گی خارش ہو گی تو کھجائے گا۔ تلک ایک عرصہ تک متروک رہا اور اب بھی خواص اس سے اجتناب کرتے ہیں لیکن بعض شعراء نے اسے پھر سے شروع کر دیا ہے جو حسنِ بندش کی فکر نہ کر کے بحر میں بہہ جاتے ہوئے اسے لکھ مارتے ہیں۔

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

لاپروائی کی بھی حد ہو گئی کہ میں بار بار حالِ دل کہتا ہوں اور آپ ہر مرتبہ کہہ دیتے ہیں کیا گویا سُنا ہی نہیں آخر یہ کب تک اور اس طرح تابہ کے کبھی تو آپ کو ہماری سُننا ہی پڑے گا۔ مصنف کا یہ شعر بہت ہی مشہور ہے اور اہلِ زبان میں نثر سے زیادہ مقبول و مروج۔

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھکو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

حضرتِ ناصح اگر تشریف لاتے ہیں تو سر آنکھوں پر لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مجھے کیا سمجھائیں گے اور میرے معاملہ میں کونسی سمجھانے کی بات ہے۔ آج کل کی زبان میں "کوئی کے ساتھ سمجھا دے بولا جائے گا" "سمجھا دو" کا استعمال درست نہیں۔

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

قتل کرنے میں یہی دو عذر تھے کہ تلوار موجود نہیں ہے یا کفن کا انتظام نہیں ہو سکتا یا کہہ دیتے تھے کہ "مرنے کو جی چاہے کفن کا ٹوٹا" آج میں یہ دونوں چیزیں ساتھ لئے جاتا ہوں اب وہ کیا بہانہ کر سکتے ہیں۔ یا دیکھیں اب وہ کیا بہانہ کرتے ہیں۔

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے

جنونِ عشق کے انداز چھڑانے کے لئے اگر ناصح نے ہم کو قید کر دیا ہے تو خیر اس کی خوشی (یا صبر حوالہ) لیکن پوچھنا یہ ہے کہ کیا اس معاملہ میں یہ تدبیر کارگر ہو سکتی ہے۔
(غالب) احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

خانہ زاد پرورده تابعدار غلام۔ کہتے ہیں ہم تو زلف کے خانہ زاد ہیں اِس طرح پابندِ زلف ہو کر عادتِ اسیری میں مبتلا ہونے کے بعد زنجیر سے ڈرنے اور بھاگنے کا کوئی سبب نہیں کہ یہ تو ہمارا بچپن کا شغل ہے اور جب پہلے ہی گرفتارِ وفا ہیں تو قید و بند سے کیا گھبرائیں گے یہ بھی سہی۔ یہ شعر شعرِ ماسبق کے ساتھ مل کر قطعہ بھی ہو سکتا ہے۔

(۳۴)

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

بہ عالم بیکاری ترکِ وطن کرنے والے کہا کرتے ہیں کہ اب یہاں رہیں تو کیا کھائیں یا کھانے کو کہاں سے لائیں۔ چاہتے تو سیدھا لکھ جاتے لیکن چونکہ رنگِ تغزل کی پابندی ضروری تھی اس لئے غمِ الفت لکھنا پڑا کہ غم کے لئے بھی کھانا مستعمل ہے۔ کہتے ہیں اب دہلی میں میرے یارانِ غمگسار نہیں رہے اس لئے اگر با ایں بے کاری و کسمپرسی یہاں رہوں تو کھانے کو کہاں سے آئے اس شعر سے یہ مطلب نکالنا کہ دہلی میں کوئی معشوق ہی نہیں جس سے محبت کریں نہ صرف یہ کہ نہایت کوتاہ خیالی بلکہ غالبؔ کی معنیٰ آفرینی سے انکار ہوگا۔

(۱۹)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

اگر اور بھی زندہ رہتے تو انتظار ہی انتظار رہتا کیونکہ وصال تو ہماری قسمت میں تھا ہی نہیں اس لئے جلدی مر جانے کا کوئی افسوس بھی نہیں مر کر انتظار سے تو چھوٹ گئے جو جان کے لئے ایک مصیبت تھا۔

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار نہ ہوتا

تیرے منہ سے حرفِ وعدہ بھی سن کر زندہ ہیں تو سمجھ لے اسے ہم نے جھوٹ سمجھا ورنہ اگر اسے سچ سمجھے ہوتے تو خوشی سے مر نہ جاتے یہ تو ایسی بات تھی کہ ہمیں شادی مرگ ہو جانا چاہئے تھا۔

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ وفا بہت کمزور بندھا ہوا تھا ورنہ اگر مضبوط ہوتا تو تجھ سا نازنیں معشوق اسے کبھی نہ توڑ سکتا با ایں ہمہ نازکی تیرا توڑ ڈالنا عہدِ وفا کے کچے دھاگے سے بندھا ہوا ہونے کا ثبوت ہے۔ بودا بمعنی کمزور اب بھی استعمال تو ہوتا ہے مگر کم البتہ پست ہمت کے لئے اس کا بہت استعمال ہے۔

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

تو نے آدھی کمان کھینچ کر جو تیر کو چھوڑ دیا تو وہ پار ہونے کی جگہ جگر میں پیوست ہو کر رہ گیا اور مستقل خلش کا باعث ہوا کہ اب یہ ہمیشہ کھٹکتا ہے اور مانع اندمال ہے اگر پار ہو جاتا تو خلش بھی باقی نہ رہتی اور زخم کے بھر جانے کی بھی اُمید ہوتی اس لئے یہ کمی ایسا کمالِ جفا ہے جسے میرا دل ہی جانتا ہے۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

دوستوں کا تو یہ کام تھا کہ کوئی میرے ساتھ رہ کر غم گساری کرتا اور کوئی چارہ سازئ غم و درد کے لئے بھاگ دوڑ کرتا یہ کہاں کی نئی وضع دوستی نکالی ہے کہ سارے دوست میرے لئے ناصحِ مشفق بنے ہوئے ہیں اور کچھ کرنا نہیں چاہتے۔ یعنی یہ سب باتیں بنانا ہی جانتے ہیں تو یہ کیسے دوست اور کہاں کی دوستی۔

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

شرارِ سنگ گو پتھر کے رگ و ریشہ میں بھرے ہوئے ہوتے ہیں لیکن پتھر پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں کہ سوزِ غم کو سوزِ شرار سے کوئی نسبت نہیں آتشِ غم

وہ بری بلا ہے کہ جو پتھر کے جگر کو بھی خون کر دیتا ہے اِس لئے اگر شرارِ غم ہوتا تو پتھر سب کا سب خون ہو کر بہ جاتا لیکن چونکہ پتھر پر اس کا کوئی اثر نہیں تو ثابت ہو گیا کہ سوزِ غم شرار نہیں۔ غم سے مراد ہے غمِ عشق جس کا دوسرا نام ہے بارِ امانت اور جس کے اُٹھانے سے پہاڑوں نے انکار کر دیا تھا۔

غم اگرچہ جاں گُسِل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

یہ مانا کہ غمِ عشق جاں گُسِل ہے لیکن جہاں دل ہے وہاں غم سے مفر کہاں اگر یہ نہ ہوتا تو غمِ دنیا ہوتا جس سے غمِ عشق ہزار درجہ بہتر ہے "پہ" بمعنی "مگر" اب متروک ہے اور "اگر" کی جگہ "گر" لکھنا بھی۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

شبِ غم کا حال زار کس سے کہوں یہ ظالم ایسی بری بلا ہے کہ مجھے مَر مَر کے جینا پڑتا ہے اگر ایک ہی بار مر کر رہ جاتا تو وہ اس سے ہزار درجہ بہتر ہوتا۔

خدا کے گھر سے پھر پھر آئے روزِ ہجرِ دلبر میں
خدا شاہد کہ سو چکر کئے ہیں ہم نے دن بھر میں (ناطق)

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

جنازہ اُٹھنے میں تشہیر ہے اور قبر انگشت نمائی کے لئے نشان اگر ہم یوں نہ مرتے اور کہیں بحرِ ظلمات میں جا کر ڈوب رہتے تو یہ رسوائیاں کیوں ہوتیں لارڈ کچنر کی طرح سب باتوں سے بے نیاز ہو کر نہ سوتے۔

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

دوچار ہونا سامنے آنا مڈبھیڑ ہونا۔ اُسے یعنی ذاتِ واجب کو۔ اس کا کہیں دوچار نہ ہونا یگانگی کی دلیل ہے کیونکہ نظر آنے کے لئے جسم کی ضرورت ہے مجسم ہو تو دوئی کی شان پیدا ہو جاتی ہے جو یکتائی کے منافی ہے اور چونکہ وہاں یہ سب کچھ نہیں محض ایک جوہرِ فرد ہے اس لئے اُسے کوئی کیونکر دیکھ سکتا اور وہ کہیں کیوں دوچار ہوتا۔

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اگر بادہ خواری کی بُری لت تجھے لگی ہوئی نہ ہوتی تو اے غالب تیرے بیان میں جو مسائلِ تصوف ہوتے ہیں وہ ایسے ہیں کہ ہم تجھے ولی سمجھتے۔ بعض اصحاب غالب اشعار کی مسائلِ تصوف سے تشریح کرتے ہیں جو اکثر میں نے بھی کی ہے اور بالکل اس بیان کے مطابق ہے لیکن یار لوگ اِس پر خواہ مخواہ کی نکتہ آرائی کا الزام بھی لگا دیتے ہیں۔ غالب مسائل تصوف لکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں تو بھی تصوف سے ان کے کلام کی شرح کرنے پر اعتراض ہوتا ہے لیکن انھوں نے اہلِ سیاست ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا اس پر بھی ڈاکٹر سید محمود صاحب نے ان کے بہت سے اشعار پر سیاستِ حاضرہ کے معانی کا جامہ پہنا دیا ہے مگر ایسا کوئی کچھ نہیں کہتا۔

(۲۰)

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

ہوس کو برائے ہوسناکی۔ نشاطِ کار راحتِ زندگی۔ مرنا عشق و عاشقی کرنا۔ مطلب یہ کہ ہوسناکی کے لئے تو لطفِ زندگی کے ہزاروں سامان ہیں لیکن سچ پوچھئے تو یہ سب کچھ نہیں محض عشق و محبت ہی زندگی کے مزے کا سامان ہے یہ نہ ہوں تو زندگی بے مزا ہے۔ یہی مضمون مصنف نے پہلے یوں لکھا ہے۔

(غالب) عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا
مولانا حالی نے اس کی شرح یوں کی ہے کہ جو کچھ چہل پہل ہے وہ اِس یقین کی بدولت
ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے یہ انسان کی ایک طبعی خصلت ہے کہ
جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے اسی قدر سرگرمی سے کام کرتا ہے۔ مگر یہ کچھ لگتی
ہوئی بات نہیں معلوم ہوتی یہ تو درست کہ کم وقت میں انسان سرگرمی سے کام کرتا ہے
مگر یہ زندگی کا معاملہ ہے جو کام اس طرح کیا جاتا ہے وہ فائدۂ زیست کے لئے
ہوتا ہے موت کے بعد تو کارِ دنیاوی کی سرگرمی کام آنے والی بات نہیں یہ بھی مسلمہ
امر ہے کہ انسان کی سرگرمیِ حیات اس کے موت سے غافل ہونے کا نتیجہ ہے نہ کہ اس
کی یاد کا جو دنیا کے کاروبار کو مختصر کر دیتی ہے حدیثِ نبوی ہے اُذْکُرُوا ھادم
اللذات اس کا یہی مطلب ہے کہ موت کی یاد انہماکِ دنیاوی کو ختم کر دیتی ہے
البتہ اگر یہاں نشاطِ کار سے مراد شغل عبادت لیا جائے تو حالی کا مطلب درست ہو جاتا
ہے اگرچہ لفظ "ہوس" پھر بھی اس کے منافی رہتا ہے۔ اس شعر میں اور نیز
بعض دیگر اشعار میں جو مصنف نے لفظِ ہوس استعمال کیا ہے اس کے معنی غالب
کا اختراع بتاتے ہوئے بعض لوگوں نے رقیب کے لئے ہیں۔ جو درست نہیں۔

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا
کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

اے سراپا ناز معشوق تو جو میری عرضِ مدعا پر بار بار کیا کہہ دیتا ہے تو اس تجاہل
پیشگی سے تیری غرض کیا ہے کہاں تک یوں انجان بن کر تو میرے مطلب کو خبط کرتا
رہے گا۔ اس سے بہتر انداز میں اس شعر کو پہلے لکھ آئے ہیں۔

(غالب) بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

نوازش ہائے بیجا سے مطلب ہے ظلمِ ناروا۔ کسی کی زیادتیوں پر طنزاً کہا جاتا

ہے کہ فلاں صاحب کی ہم پر بڑی نوازشیں ہیں شکایت ہائے رنگیں طنز آمیز
شکریہ جیسے ظلم کو نوازش کہا جائے۔ کہتے ہیں میں دیکھ رہا ہوں کہ برابر مجھ پر
ظلم ناروا ہو رہے ہیں تو پھر اگر میں ان کا رنگ آمیز شکریہ ادا کرتا ہوں تو تمہیں
اس کی شکایت کیوں ہے یا یہ کہ تم جو غیروں پر بیجا نوازشیں کر رہے ہو انھیں
میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں تو اگر کبھی کوئی جلی کٹی بات کہہ جاتا ہوں تو
یہ کوئی شکایت کی بات نہیں۔

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

آپ تغافل سے میری تمکین کی آزمائش کرتے ہیں یعنی دیکھنا چاہتے ہیں کہ میں
اس برتاؤ کو کیونکر برداشت کرتا ہوں۔ یہ کوئی بات نہیں اور اس کی سند
نہیں میں تو یہ چاہتا ہوں کہ نگاہِ بے محابا سے یہ امتحان لیا جائے۔

فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

ہوس کاری میں ناموسِ وفا کا خیال اور اس کی پاسداری کہاں جس طرح گھاس
کا شعلہ بھک سے ایک بار جل کر بلند ہوا اور پھر کچھ نہیں اسی طرح اہلِ ہوس
کی محبت کو قیام نہیں ہوتا اور وہ ایسی بدنامیوں کی پرواہ نہیں کرتے۔

نفس موجِ محیطِ بے خودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا

یہاں تو موجِ نفس ہی یا خود اپنی ذات ہی بے خودی کے چکر میں ہے یعنی ہم تو خود
ہی غرقاب و مدہوش ہیں ایسی حالتیں ہاتھ پھیلانے کا کسے ہوش اور اس کی شکایت
کیسی کہ ساقی لاپروائی کرتا ہے۔

37

دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا کیا

ہمیں عطرِ پیراہن کا خیال ہی نہیں یعنی خود پیراہن کو عطر آلود کرنے سے نفرت ہے تو ایسی حالت میں صبا کی آوارگی کا کیا غم کیونکہ جب یہاں پیراہن عطر آلود ہی نہیں تو کس کی بوئے پیرہن کو صبا اڑا لے جائے گی اور آوارہ گرد کی ہمدمی کا الزام کیوں آئے گا۔ حاصل یہ کہ ہمیں عیشِ دنیا کی طرف رغبت ہی نہیں تو اس کی بے وفائی کا کیا غم۔ شعر تکلف سے خالی نہیں۔

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ہر قطرہ کا دل سازِ انا البحر ہے یعنی ہر جُزو اپنے کُل کے ساتھ وحدت کا مدعی ہوتا ہے تو پھر ہم جس قدر بھی ناز کریں کم ہے کیونکہ ہمارا امیدہ ذاتِ واجب ہے یا جس کے ہم ہیں وہ ایک بڑی ہستی ہے اس لئے جب قطرہ دریا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو پھر کچھ نہ پوچھو کہ ہمارا کیا دعویٰ ہے۔ اِس مضمون کو خاموشی سے یوں بھی لکھا ہے۔

(غالب)　قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

محابا کیا ہے میں ضامن اِدھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

مجھے شہیدِ نگہ کرنے میں تامل کیوں ہے اِدھر دیکھ جو تجھے کوئی آنکھ بھر کر بھی دیکھے تو میرا ذمہ کیونکہ شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کچھ نہیں ہوتا یعنی مجھے شہیدِ نگہ کرنے سے نہ ڈر اس صنفِ قتل میں باز پرس کا خوف نہیں اور ایسا قاتل کسی قانون کی گرفت میں نہیں آتا۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ یوں لکھا ہے۔

(غالب)　شرع و آئین پر مدار سہی　ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

شکستِ قیمت فارسی کا محاورہ ہے جس کے معنیٰ ہیں قیمت کا گر جانا یا کسی چیز کا بیکار و بے قیمت ہو جانا۔ شکست ٹوٹنے کو بھی کہتے ہیں اور ٹوٹنے میں اکثر آواز ہوتی ہے۔ دل کی قیمت محض جنسِ وفا کی بدولت تھی جب تو نے اسی جوہر کو غارت کر دیا تو دل کی قیمت خواہ مخواہ شکست ہو گئی اب جو تو یہ کہتا ہے کہ ہم نے تو اس شکست کی آواز نہیں سنی تو سُن لے کہ ایسی شکست کی کوئی آواز نہیں ہوتی۔ یا یہ کہ کوئی چیز جب ٹوٹ جاتی ہے تو اس کی قیمت بھی کچھ نہیں رہتی۔ یہاں شاعر نے شکستِ دل کو اسی لئے شکستِ قیمتِ دل کہا جس سے کامیابی کے ساتھ حشو کی جگہ کو پُر کر لیا ہے۔ کہتے ہیں اے غارت گرِ جنسِ وفا اپنی غارت گری سے میری دل شکنی کئے جا اور اس شکست کی آواز سُنے جا کیونکہ ایسی آواز کا تجھ پر کوئی اثر تو ہوتا ہی نہیں یا یہ کہ سُنے جا کیسی مزے کی آواز آتی ہے۔ بہر حال شعر تکلف سے خالی نہیں۔

کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ
شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

جگر داری استقلال۔ کہتے ہیں ہماری جگر داری کی فضول کیوں آزمائش کرتے ہو تم ہی سمجھو کہ عاشق کے دل کو بھی کہیں شکیبائی ہوئی ہے۔

(سعدی)　قرار در کفِ آزادگاں نگیرد مال
نہ صبر در دلِ عاشق نہ آب در غربال

یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں
یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا

فتنۂ آزمائش یہ عربی کا لفظ ہے اور مصنف نے عربی لفظ کے ساتھ بالاضافت لکھا ہے جو بالکل درست ہے۔ اردو میں یہ لفظ جب مفرد بولا جاتا ہے تو فساد کا مرادف ہوتا ہے۔ قاتل وعدۂ صبر آزما کی صفت ہے اور کافر فتنۂ طاقت ربا

کی اور پھر اسی وعدۂ صبر آزما کو فتنۂ طاقت ربا قرار دیا ہے۔ معشوق سے کہتے ہیں کہ تیرا ایسا کبھی وعدۂ صبر آزما کیا اور کیوں جس میں میری طاقتِ انتظار کو معدوم کردینے والی کافر آزمائش ہے۔

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

باتیں ہوں اشارہ ہو یا ادائیں اے غالبؔ اس کی تو ہر بات اک بلائے جاں ہے۔ غالبؔ نے یہاں عبارت اشارت اور ادا تینوں کو علیحدہ علیحدہ استعمال کیا ہے جن میں سے دو یعنے عبارت اور ادا اردو استعمال کے لفظ ہیں جو بلا ترکیب فارسی لائے جاسکتے ہیں لیکن اشارت اردو کا لفظ نہیں اس معنی میں اشارہ یا اشارہ کرنا بولا جاتا ہے اس لئے اشارت اور ایسے دیگر الفاظ کا استعمال جو عربی یا فارسی ہوں اور اردو کے استعمال میں نہیں بغیر ترکیب فارسی کے اب مستحسن نہیں سمجھا جاتا۔

(۲۱)

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

یہ بات مسلماتِ شعر سے ہے کہ وجودِ انسان موردِ آلام ہے اور کربلائے رنج و فکر انسان ہی کے ساتھ خاص ہے۔ کہتے ہیں جب زمانے نے ہمارے برابر کسی کو قہر و غضب کے لائق نہ سمجھا اور ہمیں پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے تو ہم اس لازمۂ زیست میں سب سے ممتاز ہوئے ایسی حالت میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا۔ یا یہ کہ جب نگاہِ یار نے ہمی کو قہر و غضب کی برداشت کرنے کے لئے چن کر خاص کرلیا تو اب ہمارے لاثانی ہونے میں کیا شبہ رہ گیا۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

بندوں کی پرواہ کرنا کیسا ہم تو خدا کی بندگی میں بھی ایسے آزاد منش اور خود دار ہیں کہ اگر کبھی وہاں گئے اور کعبے کے دروازے کو کھلا نہ پایا تو کسی سے التجا نہ کی اور راستے طولِ سفر کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے گھر واپس چلے آئے۔ حاصل یہ کہ ہمیں عبادتِ خداوندی میں بھی بندوں کا احسان اٹھانا گوارا نہیں۔ مصنف نے اس کے برعکس بھی لکھا ہے ؎

یار کا دروازہ پائیں گر کھلا — ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے

سب کو مقبول ہے دعویٰ تیری یکتائی کا
روبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا

چونکہ آئینہ میں بعینہٖ دیکھنے والے یا مقابل کی صورت نظر آتی ہے جو دلیلِ مثلیت ہے اور یکتائی کے منافی اس لئے کسی بتِ آئینہ سیما کو تیرے سامنے آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ یا یہ کہ کسی حسین کو تیری ہمسری کرنے کا خیال نہیں سب تیری یکتائی کو مانے ہوئے ہیں۔

کم نہیں نازشِ ہمتائیِ چشمِ خوباں
تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

معشوق کی آنکھ کو بیمار باندھتے ہیں۔ کہتے ہیں تیرا بیمارِ محبت اگر صحت یاب نہ ہوا تو اس میں کیا برائی ہے کیونکہ بیمار کہلاکر معشوقوں کی آنکھ کے ساتھ ایک صفت میں مشترک ہے جو کچھ کم باعثِ فخر و ناز نہیں۔ بعض نسخوں میں ہمتائی کی جگہ ہمائی لکھا ہے اب سیدھے معنی یہ ہوں گے کہ بیمار کہلانا وجہِ ناز ہے کیونکہ چشمِ خوباں بھی بیمار کہلاتی ہے۔

سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا

سینہ کا داغ بوجہ غم ہوتا ہے یا بوجہ حسرت۔ قطرہ کے لئے خاک کا رزق ہو جانا نوعِ اسفل میں فنا ہونا ہے۔ نالہ سے چونکہ اثر مقصود ہوتا ہے اس لئے نالہ سعی ہوا مطلب یہ کہ آدمی کے لئے انسانِ کامل بننے کی ناتمام کوشش وجہ حسرت و اندوہ ہے کیونکہ اس طرح اسے صفات بہیمیہ کھا جاتی ہیں یعنی نوعِ اسفل میں جو حیوانِ مطلق ہے شامل ہو جاتا ہے۔ یا یہ کہ دوسرا مصرعہ پہلے مصرعہ کے لئے بطور مثال ہے مطلب یہ کہ جس طرح وہ قطرہ جو دریا تک نہ پہونچے خاک کا رزق ہو جاتا ہے اسی طرح وہ نالہ بھی جو سعیِ طلب میں لب تک نہ آئے ننگِ سینہ بن کر رہ جاتا ہے۔ یا دونوں مصرعوں کا بیان جدا جدا لیا جائے گا یعنی جو نالہ لب تک نہ آسکا وہ ننگِ سینہ ہے اور وہ قطرہ جو دریا تک نہ پہونچ سکا بے حقیقت ہے حاصل یہ کہ زبوں ہمتی ہمیشہ باعثِ ننگ و فنا ہوتی ہے۔

نام کا ہے مرے وہ دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام کا ہے مرے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

مجھ پر نئی نئی مصیبتیں آتی ہیں اور نئی نئی بلاؤں میں مبتلا کیا جاتا ہوں۔ یا یہ کہ میں مصائب میں جدت پسند ہوں اس لئے وہ تکلیف جو کسی کو نہ ملی میرے نام کی سمجھو اور وہ فتنہ جو برپا نہیں ہوا خاص میرے کام کا ہے۔ اب ایسے موقع پر "کہ" کی جگہ "جو" بولا جاتا ہے۔

ہر بُنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوں ناب
حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

کسی خبرِ وحشت اثر کے سننے پر کہا جاتا ہے کہ ہر بُنِ مو سے پسینہ نکل آیا شاعر نے یہاں بیانِ عشق کے ساتھ خوں ناب اور ٹپکنے کا اضافہ کر کے مضمون کو بلند کر دیا ہے کہتے ہیں قصۂ عشق بھی کیا داستانِ امیر حمزہ کی طرح فرضی اور بے اثر

ہے کہ دمِ ذکر ہر بُنِ مو سے خوں ناب نہ ٹپکے۔

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

دجلہ عراق کی وہ بڑی ندی جس کے کنارے پر شہر بغداد آباد ہے یہاں شاعر کی مراد صرف دریا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر قطرہ میں دریا کو نہ دیکھا اور جزو میں کُل نظر نہ آیا تو دیدۂ بینا نہ ہوا لڑکوں کا کھیل ہو گیا جو ہمیشہ بے نتیجہ ہوتا ہے یعنی ہماری نظر وہ نہیں جو ماہیتِ اشیا پر نہ پڑے ہم چیز میں اس کی حقیقت اور اصلیت کو دیکھتے ہیں یا یہ کہ دیدۂ بینا کو ہر چیز میں اس کی حقیقت یعنی وجودِ ذات نظر آتا ہے۔ دکھائی نہ دے کا طرزِ بیان ذوق کے اس شعر سے مزید واضح ہوتا ہے۔

(ذوق) نالہ اس زور سے کیوں میرا دہائی دیتا
اے فلک گر تجھے اونچا نہ سنائی دیتا

یہ "دکھائی" دینا اور "سنائی" دینا اردو کے قدیم الفاظ ہیں جو اب بھی نواحِ دہلی میں بے تکلف اور بکثرت بولے جاتے ہیں لیکن دیگر نواح میں اب ان کا استعمال بہت کم ہوتا جاتا ہے۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

ہم پر جب ظلم ہوتا ہے تو اس کی پہلے سے ایسی تشہیر ہوتی ہے جیسی کسی نظر فریب تماشہ کی جس کے دیکھنے کے لئے لوگ جوق جوق آتے ہیں اگر کسی اچھے تماشہ کا اعلان ہو اور پھر کسی وجہ سے وہ نہ ہو سکے تو تماشائیوں کو حسرت رہ جاتی ہے۔ کہتے ہیں غالب کے پرزے اڑنے کی بڑی گرم خبر تھی اس تماشہ کو دیکھنے کے لئے ہم بھی چلے گئے تھے مگر نہ ہوا اور مایوس ہو کر آنا پڑا۔ الحاصل اہلِ زمانہ کی سنگدلی کی شکایت ہے کہ کسی کی مصیبت کے نظارے کو کھیل تماشہ سمجھتے ہیں۔

(۲۲)

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سرپنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

مژگاں کو پنجہ سے مشابہ کیا اور پنجہ کو پشت خار بنایا جو آزاد گر لوگوں کے پاس پیٹ کھجانے کے لئے تیار رہتا ہوگا کہ ایسے لوگ نہانے کی تکلیف کم کرتے ہیں اور جسم پر میل جمع ہوکر خارش پیدا کرتا ہے ۔ سرپنجۂ مژگانِ آہو کو پشت خار قرار دینے سے دونوں باتوں کا پتہ چلا جنوں جولانی کا بھی کیونکہ دمِ رم ہرن جب پیچھے رہ جائے گا اور ان سے ملنے کی کوشش میں پیٹ تک پہونچ جائے گا اسی وقت اس کی مژگاں سے پشت خاری ہوگی اور بے سروسامانی کا بھی کیونکہ فقیروں کے پاس پشت خار رہتا ہے ان کی جنوں جولانی میں وہ یہی نہیں ۔ تکلف ہی تکلف ہے ۔ مرزا یاس یگانہ چنگیزی نے اس پر لالہ بھیروں پرشاد کے شعر کی پھبتی اُڑائی ہے ۔

(۲۳)

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

دعویٰ پارسائی کا جس کا سو طرح خون ہو چکا ہے یعنی جو ہر طرح گناہوں سے مجروح و ملوث ہے یہی دربارِ کریم میں پیش کرنے کے لئے ایک تحفہ ہے جیسے شرمِ نارسائی لائی ہے ۔ یا دوسرا مصرعہ طنزاً ہے اور مطلب یہ کہ پارسائی کا دعویٰ کیسا اس وقت تو نذرِ کریم کے لئے اگر کوئی تحفہ ہے تو صرف ایک شرمِ نارسائی یعنی گناہوں سے ندامت اور عذرِ تقصیر دوسری جگہ لکھتے ہیں ۔

کس پردہ میں ہے آئینہ پرداز اے خدا (غالب)
رحمت کہ عذرِ خواہِ لبِ بے سوال ہے

نہ ہو حسنِ تماشا دوست، رسوا بیوفائی کا
بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

رسوا بیوفائی کا رسوائے بیوفائی ۔ یہ مصنف کی خاص ترکیب ہے جو کسی دوسرے کے لئے موزوں نہیں ۔ یہاں بیوفائی سے مصنف کی مراد ہرجائی ہونا معلوم ہوتی ہے ۔ حسن تماشا دوست وہ حسن جو یہ چاہے کہ مجھے دیکھیں ۔ مطلب یہ کہ جو حسن یہ چاہتا ہے کہ تماشا بنے اور لوگ کثرت سے اسے دیکھیں اسے بیوفائی نہیں کہہ سکتے کیونکہ سو نگاہیں جو ایک ساتھ پڑتی ہیں وہ گویا سو سند کی مہریں ہیں جو پارسائی کا دعویٰ ثابت کرنے کے لئے کتابِ حسن پر لگائی جاتی ہیں اب رہی یہ بات کہ سو نگاہیں دعویٰ پارسائی کا ثبوت کیونکر ہوئیں وہ اس لئے کہ نظارۂ عام جو بہر طرز تماشا ہو آوارگی کا موقع نہیں دیتا بلکہ سادگی و سادہ نظری کا ثبوت ہے ۔ یا یہ کہ شعر طنزاً ہو گا کہ تم سے تماشا دوست حسین کو کون آوارہ اور بیوفا کہہ سکتا ہے کہ جس کی پارسائی کا دعویٰ سو گھورنے والی نگاہوں سے ثابت ہے اور جسے اچھے برے کی تمیز نہیں ۔ لفظِ "نہ ہو" کا اس طرح طرزِ بیان اب درست نہیں سمجھا جاتا ۔

زکوٰۃ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

آسمان کو گداگر اور خورشید کو اس کا کاسہ بنایا ہے جیسے لے کر آسمان پھیری لگاتا ہے ۔ جلوۂ بینش نورِ معرفت ۔ کاسۂ گدائی ظرفِ طالب ۔ مطلب یہ کہ اے جلوۂ بینش اپنی زکوٰۃ حسن دے جس کے پرتو سے کسبِ ضیا کر کے میرا دل بھی خانۂ تن میں اسی طرح روشن ہو جائے گا جس طرح خورشید خانۂ فلک میں ۔ یا اے جلوۂ عقل افروز اپنی زکوٰۃ دے جس کے پرتو سے میرا دل بھی جو کاسۂ گدائی ہے خانۂ تن میں اسی طرح روشن ہو جائے جس طرح کاسۂ خورشید خانۂ فلک میں ہے ۔

نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر
رہا مانندِ خونِ بے گنہ حقِ آشنائی کا

حقِ آشنائی تو یہ تھا کہ میری تمنائے قتل کو بر لاتا لیکن سمجھ کر نہ مارا کہ کون خونِ بے گناہ یا خونِ ناحق اپنے سر لے تو اے غافل اس طرح میرا خونِ تمنا جو حقِ آشنائی تھا خونِ ناحق کی طرح تیری گردن پر رہا کہ ناحق تو نے میری تمنا کا خون کیا۔

تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا

بے دست و پائی کا تقاضا یہ تھا کہ میں اپنی بے بسی کی شکایت کرتا لیکن چونکہ زبان بھی نہیں تھی اس لئے وہ خیال بھی آیا گیا ہوا اور بالآخر حالات پر غور کرنے کے بعد تمنائے زباں جو شکوۂ بے دست و پائی کے لئے تھی خود بھی بے زبانی کی سپاس گزار ہے جس کی بدولت شکایت کا موقع نہ آیا اور جادۂ تسلیم و رضا سے قدم باہر نہ نکلا۔

وہی اِک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

نفس، بات۔ جلوۂ چمن استعارہ ہے موسمِ بہار سے۔ رنگیں نوائی بلحاظ رنگینی گل سے مشابہ ہے اور بلحاظ بروح پرور ہونے کے نکہت سے۔ مطلب یہ کہ موسمِ بہار میری رنگیں نوائی اور گلوں کی شگفتگی کے لئے وجہ مشترک ہے۔ اِس مضمون کو ذرا بدل کر اقبال نے یوں لکھا ہے۔

ایک ہی قانونِ عالمگیر کے ہیں سب اثر
بوئے گل کا باغ سے گلچیں کا دنیا سے سفر

دہانِ ہر بُتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی
عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا

"پیغارہ جو" طعنہ زن۔ "دہن" بہ لحاظ انفراد جو ہر لفظ سے ظاہر ہے زنجیر نہیں ہو سکتا اس لئے یا تو ایک حلقۂ زنجیر مراد ہے یا زنجیرِ رسوائی بمعنیِ سلسلۂ زنجیرِ رسوائی جو ایک منہ سے دوسرا منہ مل کر پیدا کرتا ہے یا آوازِ زنجیرِ رسوائی۔ دہانِ معشوق کو معدوم باندھتے ہیں اس لئے دہانِ بت میں شکوہ ہونا ملکِ عدم کا چرچا ہوا۔ بُت جو خود بے وفا ہوتے ہیں اگر انھوں نے بھی باہم مِل کر کسی کی بیوفائی کا چرچا کیا تو سمجھو کہ بیوفائی کی حد ہو گئی۔ مطلب یہ کہ بتانِ طعنہ زن کا دہن ایک ایسا سلسلۂ رسوائی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ تیری انتہائے بے وفائی کا چرچا عدم تک ہو رہا ہے۔ یا یہ کہ بتوں کے نزدیک بیوفائی کوئی چیز نہیں یعنی یہ خیال وہاں معدوم ہے تو کسی کی بیوفائی کا چرچا بتوں میں ہونا اس کے ملکِ عدم تک پہونچ جانے کے برابر ہوا۔

نہ دے نامہ کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

اے غالبؔ تو جو معشوق کو آلامِ جدائی کی داستان لکھنے بیٹھا ہے تو یہ کب ختم ہو گی کتنا لکھے گا اور کون اس دفتر کو پڑھے گا اس لئے بہتر یہ ہے کہ مختصراً اتنا لکھ دے کہ مجھے یہ حسرت ہے کہ کسی طرح جدائی کی مصیبتوں کو بیان کر سکتا اس سے آپ واضح ہو جائیگا کہ مصیبت حدِ بیان سے باہر ہے۔

(۲۴)

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
بے تکلف داغِ مہ مُہرِ دہاں ہو جائے گا

اگر شبِ فرقت کی مصیبت بیان نہ ہو سکی تو یہ ماننا پڑیگا کہ اس رات کا چاند میرے ہونٹوں پر اپنی داغ کی مہر لگا گیا ہے یعنی یہ کہ مصائبِ شبِ فرقت کو کسی طرح بیان کر دینا ہی چاہئے کیونکہ بصورتِ دیگر یہ شک ہو گا کہ اس رات گو میں معشوق کو بھول کر چاند کے خوبصورت نظارہ میں منہمک رہا اس طرح اس کے داغ نے میرے منہ پر مہرِ سکوت لگا دی کہ نہ مجھ پر کوئی مصیبت آئی اور نہ میں نے اس کا کچھ بیان کیا۔

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب
پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا

اگر شامِ فراق میں ایسا ہی زہرہ آب ہوتا ہے تو پھر میری مصیبت کی ہمدم ہو کر شبِ غم کی چاندنی کا پتہ پانی ہوجانا چاہئے اور میرے لئے وہی چاندنی خانہ بربادی کا سبب ہوگی۔ یا یہ کہ شامِ ہجر کی ہر بات ایسی ہی زہرہ آب کرنیوالی ہے تو پھر یہ توِ مہتاب وہی غضب ڈھائیگا کیونکہ چاندنی رات کو شبِ وصل سے خاص نسبت ہے جس کی یاد میں میں اس قدر روؤں گا کہ گھر بہہ جائے گا۔

(ناطقؔ) یادِ شبِ وصال سے ہے سیلِ خانماں
شامِ فراق پر توِ بے مہر ماہ کا

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہوجائے گا

معشوق محوِ خوابِ راحت ہے اور یہ اس کی نگہبانی کر رہے ہیں خیال ہوتا ہے لائیے رخسار کا نہیں تو پاؤں ہی کا بوسہ لے لیں اس پر کہتے ہیں ہاں ایسا موقع تو ہے لیکن کہیں پتہ چل گیا تو آئندہ کے لئے بات بگڑ جائے گی اور خوابِ ناز کی نگہبانی کے لئے پھر کبھی مجھ پر بھروسہ نہ کرے گا کیونکہ بوقتِ خواب پاؤں تک دست درازی کی ابتدا اسے وہ دور تک سوچے گا اور خیال کرے گا کہ خدا جانے آگے چل کر یہ کیا کرے۔

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہوجائے گا

ہم تو یہ سمجھے تھے کہ دل رسمِ وفا کو نباہنے کے لئے ہمیشہ ہمارے کام آئے گا یہ کسے معلوم تھا کہ پہلے امتحان میں اس کا کام تمام ہوجائے گا مصنف نے یہاں جس مقام پر لفظ "یعنی" لکھا ہے یہ اب "کہ" کا محلِ استعمال سمجھا جاتا ہے۔

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اِک زمانہ مہرباں ہوجائے گا

جب تیری جگہ سب کے دل میں ہے تو تیرا مجھ سے راضی ہونا گویا سب کا دل سے راضی ہونا ہوگا۔ یا تیری رضامندی کے لئے ہر شخص مجھ پر مہربان ہوگا مصنف

نے یہاں اس مقولہ کو نظم کیا ہے کہ خدا راضی تو سب راضی۔

باغ میں مجھکو نہ لیجا ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہوجائے گا

میرا حال وہ ہے جسے دیکھ کر ہنستے ہوؤں کو رونا آتا ہے اس لئے مجھے دیکھ کر پھول روئیں گے اور ان کے اشکِ سرخ سے سارا باغ چشمِ خوں فشاں کا منظر پیش کرے گا۔

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہوجائے گا

اگر نگاہِ گرم تعلیمِ ضبط کرتی رہی تو خون رگوں میں اسی طرح جذب ہو کر یا خشک ہو کر پنہاں ہوجائے گا جس طرح شعلہ خس میں ہوتا ہے اور جب خون کا وجود رگوں میں شعلۂ خس کی طرح امکانی ہو کر رہ جائے گا تو نظامِ جسم میں اشک بن کر آنکھوں سے ٹپکنے کے لئے کیا رہے گا اسی طرح ضبط مکمل ہوجائے گا۔ یہ بات ظاہر ہے کہ شعلہ خس میں بنفسہٖ موجود نہیں رہتا بلکہ اس کا مادہ رہتا ہے۔ شاعر کہتا ہے اس نگاہ گرم کی طرف سے تعلیمِ ضبط کا یہ اثر ہوگا کہ رگوں میں خون کا وجود امکانی ہو کر رہ جائے گا۔ یا یہ کہ جس طرح نگاہِ گرم کی تعلیمِ ضبط کے اثر سے میرا خون رگوں میں پنہاں ہو کر رہ گیا ہے جو نہ آنکھوں سے نکلتا ہے نہ فصد سے اسی طرح اگر وہ نگاہ گرم اپنی تعلیم کو عام کرے تو گھانس کے تنکے میں سے بھی شعلہ کا برآمد ہونا محال ہوجائے گا۔

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہوجائے گا

(داغؔ) اِترا رہے ہیں حشر میں وہ تیرے لطف پر
ایسا غضب نہ اے مرے پروردگار ہو

"تلک" اور "واں" کا استعمال اب فصحا قافیہ کی ضرورت کے لئے بھی نہیں کرتے۔ لیکن اُن اہل ادب میں جو ترقی معکوس کر رہے ہیں اس کا پھر سے استعمال

شروع ہو گیا ہے۔

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

مثل مشہور ہے "ناداں کی دوستی جی کا جنجال" پہلے یہ مثل یوں بھی تھی کہ "نادان کی دوستی جی کا زیاں"۔ معشوق کو کمسن اور نادان باندھتے ہیں۔ یہ اپنے دل کو سمجھا رہے ہیں کہ تو بھی سمجھدار ہے سوچ تو بھلا ایسے کی دوستی سے کیا نتیجہ ہو گا۔

(۲۵)

دردِ منّت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

اگر میں اچھا نہ ہوا تو اس میں کیا برائی ہے اس طرح درد دوا کا مرہونِ منت ہونے سے بچ گیا۔ اس میں درد مخاطب بھی ہو سکتا ہے یہ اپنے گھر میں آرام کے ساتھ بیٹھے ہوئے درد سے باتیں کر رہے ہیں کہ اگر میں اچھا نہ ہوا تو چلو اچھا ہوا کیونکہ اس طرح دوا کا احسان اٹھانا نہ پڑا۔

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اِک تماشا ہوا گِلا نہ ہوا

ہمارا گِلا بھی کوئی تماشا یعنی دلبستگی کا افسانہ ہے کہ تم اسے سُننے کے لئے رقیبوں کو جمع کرتے ہو یا یہ کہ ہم ایسی کون سی تماشے کی بات کر رہے ہیں جسے سننے کے لئے آپ نے لوگوں کو بلا لیا۔

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

معشوق سے کہتے ہیں کہ جب تو نے ہی اپنے خنجر کو نہ آزمایا تو اب ہم کہاں جا کر

قسمت آزمائیں دوسرا کون ہے جو ہمارے شوقِ شہادت کو پورا کرے اور دنیا کے جھگڑوں سے نجات دلائے۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

تیرے لبوں پر شیرینی کی انتہا ہو گئی کہ رقیب بھی جو عاشق نہیں بوالہوس ہوتا ہے ان سے گالیاں کھا کر بے مزا نہ ہوا یعنی اسے بھی حرفِ تلخ میں مزا آ گیا۔ "بے مزا ہونا" رنجیدہ ہونے کے معنیٰ میں بولا جاتا ہے۔

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

اپنی بدنصیبی پر افسوس کرتے ہیں کہ آمدِ معشوق کی خبر گرم ہے اور اتفاق سے آج ہی بے سرو سامانی اس حد کو پہونچی کہ گھر میں بوریہ نہ ہوا۔

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مِرا بھلا نہ ہوا

انسان کے لئے بھلائی عبودیت میں ہے اور تباہی دعویٰ معبودیت میں۔ بندگی پر غرور بھی شانِ عبودیت نہیں کیونکہ اس سے خدا ناراض ہوتا ہے اور بندگی بیکار جاتی ہے۔ کہتے ہیں میری بندگی جو غرورِ عبادت سے بھری ہوئی تھی کہیں اس کا درجہ غرورِ نمرود کی خدائی تک تو نہیں پہونچ گیا تھا کہ اس سے میرا کچھ بھلا نہ ہوا۔ اسی مضمون کو مصنف نے پچھلی ایک غزل میں یوں لکھا تھا جو غیر مروجہ دیوان میں موجود ہے۔

(غالب) اسدؔ یہ عجز و بے سامانی فرعون توأم ہے
جسے تو بندگی کہتا ہے دعویٰ ہے خدائی کا

(ناطق) رسمِ نیاز سے ہے دورِ شیخ بزعمِ بندگی
بندہ یہ یا سرِ غرورِ خود ہے خدا نما زمیں

یا جس کی بندگی کی ہے اس پر طعن کرتے ہیں کہ کہیں وہ نمرود کی خدائی تو نہ تھی کہ بندگی میں
مرا بھلا نہ ہوا۔ غالب کی شوخ طبعی سے یہ بھی بعید نہیں کہ انھوں نے یہ مضمون اپنے
اللہ میاں ہی پر سیدھا ٹھوک دیا ہو کہ آپ کی بندگی میں میرا کچھ بھلا نہ ہوا تو کیا میں
اسے یہ سمجھوں کہ نمرود کی بے فیض خدائی تھی۔ جہاں لینے ہی سے کام تھا دینے سے نہ تھا۔
اسی مضمون کا ایک شعر انھوں نے اور لکھا ہے۔

(غالب) زندگی اپنی گر اس رنگ سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

جان دی ۔ دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

حقِ محبت تو یہ تھا کہ اپنا کچھ دیتے اور عشقِ ذات میں جان دی تو کیا دے
دیا اور اس سے کیا حقِ محبت ادا ہوا کیونکہ یہ تو اسی کی امانت تھی۔

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما
کام گر رک گیا روا نہ ہوا

شعرا دہانِ زخم باندھتے ہیں یہاں زخم اور کام کام و دہن کی مناسبت
سے لائے۔ دبنا اور رکنا قریب المعنی ہیں۔ لہو نہ تھما یعنی زخم کا اثر بد
باقی رہا۔ حاصل یہ ہے کہ برائی کو دبانے کی کوشش بھی کیجیے تو دبتی نہیں
اس کا اثر باقی ہی رہتا ہے اور بھلائی کی کوشش اگر ناکام ہوتی ہے یعنی کام
رک جاتا ہے تو پھر اس کا روبراہ ہونا مشکل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔ میں نے
اس شعر کے متعلق بہت لوگوں سے استفسار کیا مگر کسی نے کوئی لگتی ہوئی بات
نہ کہی اور خود بھی غور کیا تو اس کے سوا سمجھ میں نہ آیا جو لکھ دیا گیا۔

رہزنی ہے کہ دلستانی ہے
لے کے دل دلستاں روا نہ ہوا

دلستانی اس کا نام ہے کہ دل لے اور دل جوئی کرے یہاں دلربا دل لیکر چلتا پھرتا
نظر آیا اور پھر بات بھی نہ کی یا پلٹ کر بھی نہ دیکھا یہ دلستانی کیا ہوئی رہزنی ہو گئی

؎ (جامی) دلم بردی و دلداری نکردی غم دادی و غم خواری نکردی

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

غزل تو پڑھ چکے پھر تو پڑھیے کے کیا معنی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ غزل کا ہر
شعر آزادانہ کہ جداگانہ کیفیت کا حامل ہوتا ہے اسے کسی خاص موقع سے کوئی
واسطہ ہونا ضروری نہیں جس مشاعرہ میں یہ غزل پڑھی گئی وہاں نہ سہی دوسری
جگہ جہاں انھوں نے غزل نہ پڑھی ہو یہ شعر پڑھا جا سکتا ہے۔

(۲۶)

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

وسعتِ دل مشہور ہے جس کو دو عالم پر محیط باندھا جاتا ہے۔ یہ اپنے شوق
کی وسعت کو بیان کرتے ہیں کہ دل کے ساتھ بھی اس کو وہی نسبت ہے جو
گہر کے ساتھ دریا کو ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ شوق دل کی وسیع دنیا میں بند
ہو کر بھی اس کی تنگی کا گلا کرتا ہے کہ ایک چھوٹے سے موتی میں بند کر کے میرے
عالمِ تلاطم کو برباد کر دیا۔

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

تو اور پاسخِ مکتوب یہ کچھ لگتی ہوئی سی بات نہیں میں جانتا ہوں کہ جواب سے
جواب نہ دے گا مگر کروں کیا، شوقِ تحریر کے ظلم کا مارا ہوا ہوں اور خامہ فرسائی
کیے جاتا ہوں دوسری جگہ اسی مضمون کو یوں لکھا ہے ؎

(غالبؔ) خط لکھیں گے گرچہ کچھ مطلب نہ ہو ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے بھی
دوام کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

عیش دنیا کو کلفتِ دوام کا باعث بتاتے ہیں اور اس کے ثبوت میں بہار کے وجود کو حنائے پائے خزاں ٹھہراتے ہیں۔ بہار جو سامانِ عیش ہے اس کو بوجہ چند روزہ ہونے کے شاعر سامانِ عیش نہیں بلکہ وجہ کلفت مانتا ہے کیونکہ خود بہار کو تو قیام ہے نہیں مگر اس کے انتظار میں زمانۂ خزاں بڑھ پڑتا ہے گویا اس کے پاؤں کو مہندی لگ جاتی ہے اور چل نہیں سکتا جس طرح کہ شب وعدہ میں انتظار کی گھڑیاں عاشق کے لئے برسوں کی ہو جاتی ہیں۔ حاصل یہ کہ دنیا کا ناپائیدار عیش وجہ کلفتِ دوام ہے کیونکہ اس کے انتظار میں مصیبت کا زمانہ اور بھی طولانی ہو جاتا ہے جو کاٹے نہیں کٹتا۔

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

سیرِ باغ وجہ دلبستگی و تفریح ہے جو یاروں کے ساتھ مل کر ہنسنے ہنسانے کا مشغلہ پیدا کرتی ہے۔ کہتے ہیں کہ غمِ فراق میں اور سیرِ باغ کی تکلیف؟ معاف کیجیے اس بے وقت کی تہنائی سے یا ایسی بیجا ہنسی یا خوشی سے مجھے نفرت ہے۔ یا یہ کہ خندۂ گل کو خندۂ بیجا قرار دیا ہے جو بوجہ اور فکرِ انجام سے غافل ہونے کا نتیجہ ہے تو غمِ فراق اور ایسے چھچھوروں کی محفل مجھ سے اِن خندہ ہائے بیجا کی برداشت نہ ہو گی۔

ہنوز محرمیِ حسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بنِ مو کام چشمِ بینا کا

باوجودیکہ ہر بُنِ چشمِ بینا کا کام کر رہا ہے اور میں سراپا نظر بنا ہوا ہوں لیکن پھر بھی اِس بات کے لئے ترستا ہوں کہ حسنِ ذات کا محرم ہو جاؤں یعنی کما حقہٗ

دیکھ سکوں یا لطفِ دیدار پورا حاصل ہو۔ اہلِ تصوف کی اصطلاح میں اسے مقامِ حیرت کہتے ہیں۔

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

اگر نظارۂ اول پر دل نہ دیتے اور ناز و ادا تک نوبت آتی تو گویا حسن ہم سے دل کے لئے تقاضا کرتا اور چونکہ حسن کا تقاضا ہم سے برداشت نہ ہوتا اس لئے پہلے ہی دل دے بیٹھے اور ناز و ادا تک نوبت نہ آنے دی۔ لفظ تقاضا بلا ترکیب فارسی خلاف محاورہ ہے یہاں امالہ در کار تھا جو بوجہ قافیہ نہ آسکا میں ایسی مجبوری آ جائے تو زبان پر دست اندازی نہیں کرنا خیال ہی کو چھوڑ دیتا ہوں۔

نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدارِ حسرتِ دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

اگر آنکھوں سے اشکوں کا دریا بہ رہا ہے تو یہ نہ کہہ کہ گریہ حسرتِ دل کے مطابق ہے کیونکہ دریا کا جمع و خرچ یعنی اس کا کم یا بہ ہونا میری نگاہ میں ہے۔ حاصل یہ کہ دریا محدود ہے اور حسرت غیر محدود پھر محدود سے غیر محدود کو کیا نسبت اور گریہ حسرتِ دل کے مطابق کیونکر ہو گیا۔

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ
جفا میں اس کی ہے انداز کار فرما کا

فلک کو جب میں دیکھتا ہوں تو کار فرمائے فلک کی یاد آتی ہے کیونکہ جفائے چرخ یعنی آسمانی ستم کی کوئی ڈھال نہیں ہو سکتی اس لئے جب میں بہ عالمِ یاس آسمان کی طرف دیکھتا ہوں اور اس کی بے پناہ جفاؤں کی طرف جب خیال کرتا ہوں تو اِس بات کی یاد کر کے خاموش ہو جانا پڑتا ہے کہ یہی مشیتِ ایزدی ہے۔

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

۲۷

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

حیرت کا لازمہ ہے جمود۔ قطرہ صدف میں منجمد ہو کر گوہر بن جاتا ہے جس سے اس کی ایک جداگانہ ہستی بھی قائم ہوتی ہے اور شان بھی بڑھ جاتی ہے۔ مصنف نے بحالت انجماد قطرہ کی اس حالت کو نفس پروری سے تعبیر کیا ہے۔ کہتے ہیں جو قطرہ ہائے مے کہ معشوق کی مے نوشی کے وقت ساغر میں باقی رہ گئے تھے وہ حیرتِ دیدارِ جمال سے منجمد ہو کر موتی ہو گئے اور خطِ جامِ مے جو ان کے ساتھ مُسلک تھا رشتۂ گوہر بن گیا۔ یا قطرۂ مے سے مراد ہے ہر قطرۂ مے جو بھرے ہوئے ساغر میں محیطِ بادہ تک تھا یعنی یہ کہ حیرتِ دیدارِ جمال سے شراب کا ہر قطرہ موتی ہو گیا یہ موتی چونکہ محیطِ بادہ تک بھرے ہوئے تھے جسے خطِ جامِ مے کہتے ہیں اس لئے محیطِ بادہ میں گویا یہ موتی پروئے گئے۔ اس میں تغزل کم ہے اور تکلف زیادہ۔

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

معشوق کو میرے عشق پر اعتبار ہے اور غیر بوالہوس سمجھتا ہے اُسے اس بات کا یقین نہیں آتا کہ غیر بھی آہ کر سکتا ہے اس لئے وہ غیر کی آہ سے بھی مجھ پر خفا ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک یہ عاشق ہی کر سکتا ہے بوالہوس کا کام نہیں اس طرح اعتبارِ عشق میری خانہ خرابی کا باعث ہوا کہ غیر کا جرم بھی میرے سر تھوپا گیا۔ ؏

"اے روشنیِ طبع تو بر من بلا شدی"

۲۸

جب بہ تقریبِ سفر یار نے محمل باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا

ذرہ کی شکل اضطرابی ہوتی ہے جس کا عالم روزنِ دیوار سے گزرنے والی شعاعِ مہر میں صاف نظر آتا ہے اور خانۂ عاشق کا بھی معشوق پر شیدا ہونا تخیلِ شعر میں داخل ہے چنانچہ خود انھوں نے لکھا ہے۔

(غالبؔ) وہ آب سا مرے ہمسایہ میں تو سایہ سے
ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار

مطلب یہ کہ معشوق کے کوچ کی تیاریاں دیکھ کر میرے گھر کا ہر ذرہ تپشِ شوق کے اثر سے ایک دلِ بیتاب کی طرح تڑپ رہا تھا یعنی میں مضطرب تھا میرے گھر کے در و دیوار مضطرب تھے یہاں تک ذرہ ذرہ غمِ جدائی کے اثر سے وقفِ طپیدن تھا۔

اہلِ بینش نے بحیرت کدۂ شوخیِ ناز
جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

آئینہ فولاد کے جوہر سبز ہوتے ہیں یہ بھی طوطی کے ساتھ وجہ شبہ ہے اور یہ بھی کہ طوطی آئینہ کو دیکھ کر چہکتی ہے۔ بسمل سے تشبیہ اس لئے دی کہ جوہر متحرک بلکہ مضطرب نظر آتے ہیں۔ جوہرِ آئینہ کے اضطراب کو قائل عالم معشوق کی شوخیِ ناز کا اثر ٹھہرایا اور آئینہ میں جسے حیرت کدہ باندھتے ہیں طوطیِ بسمل کا انداز اجتماعِ ضدین ہوا۔

(ناطقؔ) بہ ذوقِ جلوہ سیماب اضطراب آگاہ بے معنی
کہ آئینے کی حیرانی ہے صاف آئینہ حیراں کا

شعر کا مطلب یہ کہ آئینہ میں جو شوخیِ ناز کا حیرت کدہ ہے باوصفِ حیرت اضطرابِ جوہر

کو دیکھ کر اہلِ بینش اسے طوطیِ بسمل باندھنے پر مجبور ہوئے یعنی انھیں اجتماعِ ضدین کا قائل ہونا پڑا۔

یاس و امید نے اک عربدہ میداں مانگا
عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

یاس و امید نے جو باہم نبرد آزمائی کے لئے میدانِ جنگ کی تلاش کی تو عجزِ ہمت نے دلِ سائل کا ایک طلسمی میدان بنا کر پیش کر دیا کہ لو یہاں زور آزمائی کیا کرو۔ حاصل یہ کہ جس دل کا عجزِ ہمت سوال کے درجے تک پہونچے اُسے امید و یاس کا طلسمی میدانِ جنگ سمجھو جو کبھی حقیقتِ زیست میں کامیاب نہیں ہو سکتا اور ہمیشہ پامال رہے گا۔ یعنی وہ ہمتِ پست جو اپنی قوتِ بازو کا بھروسہ چھوڑ کر دوسروں کی دست نگر ہونے تک اتر آئے ہمیشہ کے لئے امید و یاس کی جولاں گاہ بن کر رہ جاتی ہے۔ تقاضائے ہمت تو یہ ہے کہ انسان خود اپنے اوپر بھروسہ کرے اور کسی سے مدد نہ چاہے۔ فرمانِ رسول ؐ ہے "کہ برباد ہے دنیا و درہم اور ملبوس کا بندہ جو ملنے پر خوش ہو جاتا ہے اور نہ ملنے پر ناراض۔"

(ناطق) یہ مدت ہستی کی آخر یوں بھی تو گزر ہی جائے گی
دو دن کے لئے پھر کس سے کہوں آسان مری مشکل کر دے

نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضموں غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

دل کھول کے کوئی کام کیا بے دھڑک کیا اس میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ساحل کو تشنہ لب باندھتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہم نے تشنگیِ شوق کے مضمون میں یہاں تک غلو کیا کہ بے تکلف دریا کو بھی تشنہ کام باندھ دیا لیکن اس پر بھی بقدرِ حوصلہ یا کماحقہٗ بیان میں مضمون آفرینی نہ کر سکے اس طرح خیال کو معرضِ بیان میں لانے کی جو حسرت تھی دل کی دل میں رہ گئی۔

(ناطق) اس کے مضمون ہی نہیں ملتے

(۲۹)

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام جاؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

افسوس! مجھ سا میکش اور بزمِ مے سے یوں نامراد اور تشنہ کام جائے۔ میں نے ضرور پینے سے توبہ کی تھی لیکن ساقی نے تو پلانے سے توبہ نہیں کی تھی اسے میری تشنہ کامی کا خیال ہوتا تو بقولِ داغ۔

انکارِ میکشی نے مجھے کیا مزا دیا
سینہ پہ چڑھ کے اس نے خمِ مے پلا دیا

ہر دستہ پلا دیتا کہ مری توبہ بھی نہ ٹوٹتی اور رسمِ دیرینہ بھی نہ چھوٹتی لاو للناس من کائسِ الکرامِ نصیبٌ۔

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

وہ دن گئے جب دل و جگر اپنے اپنے حال میں مست تھے اور ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی اب تو دونوں پر عشق کی ایک ہی مصیبت پڑی ہوئی ہے اور ایک ہی بلا میں مبتلا ہیں ایک ہی فکر ہے۔ دل و جگر کا یہ حال ہوتا ہوگا مگر یہ حالت غلامی ہندو مسلمانوں کے لئے یگانگت کی کوئی صورت نہیں۔

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

درماندگی وقتِ مصیبت۔ ناخن تدبیر۔ کہتے ہیں جس وقت تک اپنا رشتۂ حیات بے گرہ تھا یعنی اس میں الجھنیں نہیں پڑی تھیں اور سر پر مصیبتیں نہیں آئی تھیں اس وقت تک ناخنِ تدبیر میں گرہ کشائی کی کمل صلاحیت موجود تھی جس سمجھے ... حیات کے سہارے رہیں وہ دن گزر گئے اور مصیبتوں کا

وقت جسے وقتِ درماندگی کہتے ہیں آیا ہم تو جب جانیں کہ اب کوئی تدبیر کام آئے۔ حاصل یہ کہ جب تک انسان کے دن سیدھے رہتے ہیں قمار گاہ زیست میں ہر پانسہ سیدھا ہی پڑتا ہے لیکن جب وقت ناموافق ہوتا ہے تو بنائے نہیں بنتی۔

(۳۰)

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

دریا کی روانی کی جگہ اگر پانی نہ ہو تو ریت ہوتا ہے اور دھول اڑا کرتی ہے جو علامتِ بیاباں ہے۔ کہتے ہیں ہمارے گھر کی قسمت میں ویرانی لکھی تھی اس لئے اگر ہمارے گریۂ دریا بار سے اس میں ندی کی صورت پیدا نہ ہوتی تو بھی ویران بیابان ہونا کہاں گیا تھا۔ جس سے دریا ہونا کہیں بہتر ہے۔

تنگیِ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

دل کی تنگی کا گلا فضول یہ تو ایسا کافر ہے کہ بصورتِ دیگر بھی دلجمعی کا مرہون نہ ہوتا کیونکہ یہ واشدہ خاطر کو اتنا بڑھاتا کہ پریشانی کی حد تک پہونچ جاتے اس کی مثال غنچہ و گل سے لیجئے کہ پھول جب تک کلی رہتا ہے دل سمجھا جاتا ہے اور جب کھلتا ہے تو اتنا دل کھول کر کہ اس کی پنکھڑیاں پریشان ہو کر بکھر جاتی ہیں۔ حاصل یہ کہ دل اعتدال پسند نہیں ہم اس کی باتوں میں کیا رہیں کہ یہ تو افراط و تفریط کا شکار ہو کر رہنے والا ہے۔

بعد یک عمر ورع بار تو دیتا بارے
کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

رضوان بہشت کا داروغہ جو کو عمر بھر زہد و ورع کے بعد ہی جنت میں جانے دیتا ہے لیکن جانے تو دیتا ہے درِ یار کا دربان تو ایسا ہے کہ وہ کسی طرح باریاب نہیں ہونے دیتا اس لئے تمنا کرتے ہیں کہ کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا کہ بعد یک عمر ورع ہی سہی کبھی باریابی کی امید تو ہوتی۔

(عرفی) عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال
صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

(ناطق) آدمیت نہیں پھٹکی ترے درباں کے قریب
ورنہ آتا تو ہے انسان ہی انساں کے قریب

(۳۱)

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اہلِ تصوف کے ایک مذہب کے مطابق جملہ موجودات کا مبدء ذاتِ واجب ہے۔ کہتے ہیں جب میں عالمِ امکان میں بہ وجودِ موجودہ نہیں تھا تو اس وقت وجودِ واجب میں موجود اور شامل تھا۔ اگر اس وقت بھی موجود بوضعِ ظاہر نہ ہوتا تو مبدءِ ذات میں شامل ہوتا۔ یعنی عینِ ذات ہوتا افسوس مجھے میرے اس ہونے نے ڈبو دیا کہ کہیں کا کہیں نظر آ رہا ہوں کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے اس ہونے کی ضرورت کیا تھی حاصل یہ کہ اگر میں بوجودِ ممکن موجود نہ ہوتا تو مجھ پر یہ ڈوب نہ پڑتی کہ اطلاقِ واجب سے جدا ہوتا۔

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو کیا غم سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

جب غم نے بے حس ہی کر دیا تھا تو سر اس کے سوا اور کس کام کا رہ گیا تھا کہ زانو پہ دھرا رہے اس لئے اس کے کٹنے کا کیا غم کیجئے ایک بے کار شے رہی تو کیا اور گئی تو کیا۔

ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

غالبؔ کو مرے ہوئے اک زمانہ ہو گیا لیکن ہنوز اس کا استغنا یادگار ہے کہ وہ ہر بات پر کہہ دیا کرتا تھا کہ "یوں ہوتا تو کیا ہوتا" یعنی اچھا اگر دنیا میں ہمارے لئے کچھ ہو بھی جاتا یا ہم کچھ ہو بھی جاتے تو پھر اس کا حاصل۔

(سوداؔ) سودا پئے دنیا تو بہ ہر سو کب تک
آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی نا اس سے کہ دنیا مل جائے
مل جائے جو دنیا بھی تو پھر تو کب تک

(ناطقؔ) اہلِ وطن وطن سہی غربت نہیں سہی
رہ کر کبھی دیکھ لیتے ہیں رہتا ہے گھر کہ ہم

حالانکہ طبیعتِ انسانی اس کے برعکس ہے۔

(نوحؔ) گذرتی ہے بشر کی عمر بھی کس وہمِ باطل میں
جو یوں ہوتا تو یوں ہوتا جو یوں ہوتا تو یوں ہوتا

(۳۲)

یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

جادہ کثرتِ نقشِ قدم سے پیدا ہوتا جس میں نقشِ قدم خود معدوم ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنی ایک نظم میں نقشِ پا کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

کیا تجھے جادۂ اربابِ وفا ہونا ہے
کیا اسی راہ میں آخر کو فنا ہونا ہے

یہاں باغ کی زمین کا کوئی ذرہ بے کار یعنی پھولوں سے خالی نہیں یہاں تک کہ جادہ بھی جس میں بظاہر پھول نظر نہیں آتے گلہائے لالہ کی کثرت و تواتر داغ

سے پیدا ہوا ہے۔ یا یہ کہ جادہ بھی ایک فتیلہ ہے جس سے لالے کا چراغ روشن ہوتا ہے۔ یا یہ کہ اگر داغِ لالہ سبق آموزِ دل ہے تو جادہ بھی بے کار نہیں کہ یہی گلِ لالہ تک بہ وقتِ سیر پہونچاتا ہے اور اس طرح داغِ لالہ سے دل کا چراغ روشن کرنے کے لئے فتیلہ کا کام دیتا ہے۔

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی
کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا

آشوبِ آگہی افکارِ ہوش جو وجہ پریشانی ہوتے ہیں۔ خطِ ایاغ ساغر کا وہ خط جہاں تک شراب بھری جاتی ہے جسے پیمانہ شراب کہنا چاہیئے۔ کہتے ہیں خطِ ایاغ کو عجزِ حوصلہ نے کھینچا ہے یعنی پورا پیمانہ بھر شراب پئے بغیر کسے اس بات کی ہمت ہے کہ آشوبِ عالم کا مقابلہ کرے یعنی انسان اگر مصائبِ فکر کا مقابلہ کر سکتا ہے تو صرف بیخود رہ کر چنانچہ مصنف نے لکھا ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

یا آشوب آگاہی ذات کے آفات قطع منازلِ سلوک جس کے لئے جوگی وغیرہ بھنگ و گانجہ وغیرہ کے نشہ سے کام لیتے ہیں جس سے ان کے نزدیک یکسوئی پیدا ہوتی ہے اسلام میں بھی اس رنگ کا ایک فرقہ بھنگیڑیوں کا حشاشین کے نام سے ہوا ہے جس کا تعلق حسن ابن صباح کے گروہ سے تھا ان کے نزدیک بھنگ وغیرہ کے نشے کی تصوف میں یکسوئی خیال کے لئے ضرورت تھی۔ مصنف کے خیال کے مطابق یہ سب فضول ہے کیونکہ شراب کے سوا کسی نشہ میں یہ بات نہیں بھنگ توڑ لانے والا نشہ ہے اس لئے کہتے ہیں شراب کے سوا کس کی ہمت ہے کہ یکسوئی خیال پیدا کرے اور مصائب آگاہی کی برداشت کرے اس کے لئے تو پورے پیمانہ کا نشہ ہونا چاہیئے۔ خطِ ایاغ سے کم میں کام نہیں چلتا اور حوصلہ نہیں بڑھتا۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

جس کو خللِ دماغ ہو اس کے کام ایسے ہوتے ہیں کہ دیکھنے والوں کو خواہ مخواہ ہنسی آئے۔ واشد گل کو خندۂ گل کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ بلبل جو عاشقِ گل کہلاتی ہے اس کے کاروبار یعنی نغمہ سرائی و نالہ کشی پر پھول ہنستے ہیں جس سے ثابت ہوا کہ جس کا نام عشق رکھا ہے وہ خللِ دماغ یعنی جنون ہے۔

تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے
تریاکیِ قدیم ہوں دودِ چراغ کا

تریاک ایک سیاہی مائل مقویِ دماغ دوا۔ یہاں شاعر دودِ چراغ کو جو سیاہ ہوتا ہے تریاکِ منتی اور خود کو اس کا کھانے والا ٹھہراتا ہے۔ شاعری کے لئے سکوت کی ضرورت ہے اور چونکہ دن کی بہ نسبت رات بہت زیادہ خاموش ہوتی ہے اس لئے اکثر شعرا رات ہی کے وقت فکرِ سخن کرتے ہیں اور رات کی تاریکی میں لکھنے کے لئے چراغ درکار ہوتا ہے۔ تریاکی کی یائے نسبت ایسی ہے جیسی افیونی اور شرابی کی۔ کہتے ہیں میں دودِ چراغ کا قدیم تریاکی ہوں یعنی میں نے ہمیشہ فکرِ سخن میں راتیں گزاری ہیں اور ساری عمر یہی کرتا رہا ہوں میرا یہ نشہ آج کچھ نیا نہیں۔ یا چراغ تابشِ سخن اور اس کا دھواں فکرِ سخن یعنی میں پریشانیِ فکرِ سخن کا پرانا تریاکی ہوں یہ کوئی نیا نشہ نہیں۔

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

بندِ عشق سے آزادی وجہ فراغتِ خاطر ہے۔ کہتے ہیں ہم دل سے مجبور ہیں یہ کمبخت دشمنِ فراغ آوارہ جب ہم بندِ عشق سے آزاد ہو جاتے ہیں تو پھر کہیں لے جا کر پھنسا دیتا ہے۔

بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار
یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

چشمِ عاشق ایک میکدہ ہے جس کی شراب ہے خونِ دل۔ میخانہ میں شراب نہ

ہو تو ویران ہوگا۔ ویران مکان میں دھول اور موجِ نگہ سے محوِ سراغ ہونا بھی پیدا کیا اور خاک اڑنا بھی۔ کہتے ہیں میکدۂ چشم میں خونِ دل کے نہ ہونے سے موجِ نگہ اس کی تلاش میں نکل رہی ہے وہ گویا ایک غبار ہے جو میکدے کو ویران اور خراب کر رہا ہے۔

باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار خم کدہ کس کے دماغ کا

کس کے دماغ کا استفہام انکاری ہے۔ کہتے ہیں ابرِ بہار سے باغ باغ ہونے اور سرور حاصل کرنے کا کس کو دماغ ہے وہ تو باغ کے پھولوں ہی کو شگفتہ کر لے ہمارے دل کے لئے تو بساطِ نشاط صرف تیرے حسن کا شگفتہ باغ ہے جسے دیکھ کر دل کی کلی کھلتی ہے۔

(۲۳)

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا

جس طرح سرنامہ کی بے ربطی سے خط کی پریشان حالی عیاں ہو جاتی ہے یعنی جس خط کا عنوان ہی بے ربط ہو اس میں کیا لکھا ہوگا یہ ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح میری چینِ جبیں سے معشوق میرے غمِ پنہاں یا دلی الجھن کو سمجھ گیا کہ جذباتِ دلی کا اثر ہمیشہ صورت سے عیاں ہوتا ہے۔

(ناطق) نئے پتہ سے لکھا ہم نے اضطراب کا حال
کہ لفظ ایک بھی خط میں نہیں ٹھکانے کا

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

گریبان بصورت الف ہوتا ہے۔ آئینہ پر بوقت صیقل پہلے ایک خطِ مستقیم بصورت الف کھینچ کر اس کو چاروں طرف بذریعہ خط بڑھایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں جبکہ میں گریبان کے مقصد کو سمجھا ہوں یعنی اِس سے مجھے یہ راز معلوم ہوا کہ ابھی تک آئینہ

سینہ پر ایک الف سے زیادہ صیقل نہیں اس وقت مجھے وحشت ہو گئی ہے۔ اور گریبان دری میں مشغول ہوں کہ اس ایک خط کو چاروں طرف بڑھا کر تکمیل صیقل کر رہا ہوں۔ یعنے جس وقت سے کہ میں گریبان کو صیقل آئینہ سینہ کا پہلا الف سمجھا ہوں اسی وقت سے اسے چاک کر کر کے ہر طرف خطوط بڑھا کر تکمیل صیقل میں مشغول ہوں۔

شرح اسباب گرفتاری خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

دل کی وسعت مشہور ہے کہ اسے دو عالم پر محیط مانا جاتا ہے۔ یہ کہتے ہیں دل بوسعت معروف اس قدر تنگ ہو گیا کہ مجھے اس پر کال کوٹھری کا گمان ہونے لگا۔ اس سے سمجھ جایئے کہ گرفتاری خاطر کے کیسے برے اسباب ہوں گے جنھوں نے دل کی اتنی وسیع دنیا کو ایسا تنگ کر دیا۔ تشریح کی اس میں ضرورت باقی نہیں رہتی۔

بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرم خرام
رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

معشوق ہر قطرۂ عرق کو جو سرگرم خرام ہونے کے وقت اس کے چہرہ پر آیا ایک دیدۂ حیراں یعنی چشم نظارگی سمجھا۔ اور اسی بدگمانی کی بدولت ٹھٹک کر رہ گیا کہ اسے دید عشاق پسند نہیں۔ یا یہ کہ ہر قطرۂ عرق کو میں ایک دیدۂ حیراں سمجھا اور اس بدگمانی کی بدولت یہ بھی منظور نہ ہوا کہ معشوق میرے گھر آنے کے لئے بھی سرگرم خرام ہو۔

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
نبض خس سے تپش شعلۂ سوزاں سمجھا

بدخو یعنی شعلہ مزاجی۔ جو نسبت شعلہ کو گھانس کے تنکے سے ہے وہی معشوق کو عاشق سے ہے کہ دونوں میں موثر اور موثر ہونا وجہ مشترک ہے۔ کہتے ہیں کہ

میں اپنے انتہائے عجز کو دیکھ کر معشوق کی شعلہ مزاجی کو اسی طرح جان گیا جس طرح کہ گھانس کے تنکے کی کمزوری اور نرمی سے شعلۂ سوزاں کی تپش کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی جس طرح غریب گیاہ خشک کو پھونک دینے کے لئے شعلہ بڑی تیزی دکھاتا ہے اسی طرح میرا عجز کامل بھی اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ معشوق بکمال بدخوئی پیش آئے گا۔

سفر عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سائے کو میں اپنے شبستاں سمجھا

شبستاں رات گزارنے کی جگہ بمعنی مجازی مکان۔ کہتے ہیں میں بہ عالم ضعف سفر عشق میں ایسا راحت طلب ہو گیا تھا کہ ہر ہر قدم پر خود اپنے سائے کو دیکھ کر یہ سمجھتا تھا کہ کارواں سرا یا گھر آ گیا اور وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ مصرع ثانی کی ترکیب میں ایسی تعقید ہے جسے غالب کے مابعد والے اساتذہ نے ناپسند کیا ہے۔

(ناطق) وجہ سکون راہ طلب عجز حوصلہ
منزل کو پائے ماندہ نے منزل بنا دیا

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دم مرگ
دفع پیکان قضا اس قدر آساں سمجھا

مژگان نگاہ معشوق کو تیر و پیکاں باندھتے ہیں اور اس پر اضافہ قضا پیکان قضا بھی لکھتے ہیں۔ پیکان قضا اجل مقدر کو گویا اس کے خیال ٹل نہیں سکتی۔ کہتے ہیں دل اخیر وقت تک مژۂ یار سے جان بچاتا رہا جس سے بالآخر جاں بر نہ ہو سکا گویا اس کے خیال میں دفع پیکان قضا اس قدر آسان تھا کہ گریز سے مفر ہو جاتا۔

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

(52)

بے وفا کو وفادار جان کر کیوں دل دیا۔ غالب تم نے بڑی غلطی کی کہ ناخدا ترس کافر کو خدا ترس مسلماں سمجھ بیٹھے۔

(۳۴)

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دل جگر تشنۂ فریاد آیا یعنی دل کو ضرورتِ فریاد معلوم ہوئی کیونکہ اب اس کی ضرورت پڑی ہے اور فریاد کے لئے نالہ کی ضرورت ہے جس کے واسطے دیدۂ تر کی یاد آئی۔ حاصل یہ کہ میں اپنے حالِ دل میں ایسا مست ہوں کہ جو اس کی بھی بے ضرورت یاد نہیں آتی۔ یا یہ کہ گریۂ سابق میں بےفکرِ مآل ایسے روئے کہ اندھے ہو کر بیٹھ گئے اور آنکھ پھوٹ پیر گئی کا خیال کیا اب جو پھر ضرورتِ فریاد ہوئی تو دیدۂ تر کی یاد آئی کہ اس کے بغیر لطفِ فریاد نہیں۔ اب سوچتے ہیں کہ آنکھیں پھوڑ کر نہ بیٹھتے تو کیوں رونے کو بھی محتاج ہوتے۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

تیری جدائی سے جو قیامت کی مصیبت مجھ پر آئی تھی اس میں ابھی پورا سکون نہ ہونے پایا تھا کہ قسمت سے پھر تیرا وقت سفر یاد آگیا اور پھر خیال کی پریشانیوں نے نئے سرے وہی قیامت برپا کر دی۔

سادگی ہائے تمنا یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

اگر لفظ نیرنگ نظر بلا اضافت ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ سادگیٔ تمنا کو ملاحظہ کیجئے کہ پھر سے اسی کی یاد آرہی ہے جس کی نگاہِ فتنہ پرور نیرنگیاں دکھا چکی

ہے اور اگر اضافت ہے تو پھر اس کی تشریح مصنف کے اس شعر سے ہوگی ؎

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

عذر واماندگی اے حسرتِ دل
نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

دل کو نالہ کشی کی حسرت تھی یہ اس کی تمنا کو پورا کر دینا چاہتے تھے لیکن عین وقت پر خیال آگیا کہ بقولِ مصنف ؎

دل میں طاقت جگر میں حال کہاں　　ایسا آساں نہیں لہو رونا

اب یہ حسرتِ دل سے عذر واماندگی کرتے ہیں کہ ضعفِ جگر کے خیال سے مجبور ہو رہا ہوں کہ یہ مصیبت اسی پر پڑے گی جسے بے موت مارنا اچھا نہیں آخر وہ بیچارہ بھی جان رکھتا ہے۔

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

اگر تیری راہ گزر کی خوشگوار یاد میں زندگی گزاری تو اس سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوا اگر یہ یاد نہ آتی تو بھی گزر ہی جاتی پھر مجھے اس سے کیا فائدہ ہوا تو مل گیا پھر اس یاد میں تیرا مجھ پر کیا احسان ہوا۔ یا کیوں احسان ہوا میرے نزدیک راہ گزر مونث ہے۔

(ناطق)　یہ مدت ہستی کی یوں بھی تو گزر ہی جائے گی
دو دن کے لئے میں کس سے کہوں آسان مری مشکل کر دے

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

اگر تیرے گھر کی فضا جنت میں یاد آگئی تو بہارِ خلد سے ناراض ہو کر ہم رضواں سے لڑ پڑیں گے۔ یا یہ کہ ہم اس کی تعریفیں کریں گے رضواں خود کی تضحیک

سمجھے گا اور تفضیل حسن میں بحث ہو کر لڑائی کی نوبت آجائے گی۔ اس پر ایک قصہ یاد آیا میں سنہ [illegible]ء میں لکھنؤ گیا تھا گرمی کا موسم تھا مولانا آسی کے وہاں مقیم تھا وہ مجھے اپنے ایک دوست کے وہاں ملاقات بازدید کے لئے لے گئے انھوں نے فالودہ سے تواضع کی جو کسی مشہور دوکان سے منگوایا گیا تھا مجھے یہ فالودہ پسند نہ آیا مگر خاطراً تعریف ضرور کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ بھوپال میں عرب کی دوکان کا فالودہ جس قدر نفیس ہوتا ہے ایسا ہندوستان بھر میں کہیں نہیں دیکھا۔ وہاں ایک صاحب قدیمی وضع کے دیرینہ سال بھی بیٹھے ہوئے تھے وہ یہ سن کر بگڑ گئے اور بیساختہ کہا واللہ قبلہ آپ بھی کیسی ناگوار باتیں کرتے ہیں لکھنؤ کی نفاست تو دنیا بھر کو نصیب نہیں۔ اُس وقت اُن کے تیور کچھ ایسے تھے کہ اگر میں جواب دینے کی جرأت کرتا تو یقیناً لڑ پڑتے۔

آہ وہ جرأت فریاد کہاں
دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا

میں دل کی پست ہمتی سے تنگ آگیا ہوں کہ اس کو ہزار مرد بناتا ہوں لیکن پھر بھی وہ جرأت فریاد نہیں کرتا جو جگر خوں گشتہ میں تھی اس لئے اب اس مرحوم کی یاد آتی ہے کہ اگر جگر کو نذر غم کر کے اس کا خون نہ کر بیٹھے ہوتے تو آج ہمارے کام آتا۔ یا یہ کہ دل سے ہمیں جس جرأت فریاد کی توقع تھی وہ اس میں موجود نہیں اس لئے تنگ آکر اب جگر کا خیال آیا ہے کہ لاؤ اسے بھی آزما دیکھیں شاید اسی سے کچھ کام نکلے۔

پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

خیال نے پھر ترے کوچہ کا ارادہ کیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے دلِ گم گشتہ کی یاد آگئی سوچتا ہے کہ وہیں چھوڑا تھا اور وہیں ملے گا۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اُف رے دشتِ وحشت کی ویرانی یہ تو بالکل ایسا ہی نظر آتا ہے جیسا میرا خانۂ ویراں تھا۔ یا یہ کہ دشت کی ویرانی سے گھبرا کر گھر یاد آگیا یہ قاعدہ ہے کہ غربت کی پریشانی میں ہمیشہ گھر کی یاد آیا کرتی ہے۔

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

لڑکپن میں سنتِ طفلاں کے مطابق مجنوں پر دیوانہ سمجھ کر مارنے کے لئے پتھر اُٹھایا ہی تھا کہ اپنی شوریدہ سری کا خیال آگیا اور سمجھ گیا کہ ایک دن مجھ پر بھی یہی پتھر پڑیں گے یا یہ کہ ہر اہلِ مصیبت اپنی بالمثل مصیبت والے کی مصیبت کو جانتا ہے اور اس کے ساتھ ہمدردی ہوتی ہے۔

(۳۵)

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

"عناں گیر" باگ پکڑنے والا یعنی سوار کو روکنے والا۔ کہتے ہیں آتے آتے جو اتنی دیر ہو گئی تو اس کا سبب کیا ہے یہ تو فرمائیے کہ اب تک آپ کو کس نے پکڑ رکھا تھا۔

(حسن دہلوی)　کہو جی شب کہاں تم نے بسر کی　اب آئے ہو صدا سُن کر گجر کی

(میر)　نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے
پسینہ پونچھ لو اپنی جبیں سے

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلا
اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

اپنی تباہی کا اگر میں تم سے گلہ کرتا ہوں تو بیجا ہے کیونکہ اس میں خود میری بدبختی کا بھی کچھ اثر تھا۔ اس طرزِ بیان کو حسنِ شکایت کہتے ہیں کہ تباہ کرنے والے نے جو جو بیجا سے اِن پر مصیبتیں ڈھائیں یہ اس بات کا ذکر خود اس سے اپنی قسمت کی برائی کے ساتھ کرتے ہیں۔

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

بھولے ہوئے صیاد کو یہ اپنا پتہ بتلاتے ہیں کہ میں وہ نخچیر ہوں جو تیرے فتراک میں رہ چکا ہے یعنی میں تیرا پرانا شکار ہوں "بتلا" متاخرین کے نزدیک متروک تھا اور یہ لفظ اب عام استعمالِ فصحا سے بھی نکل گیا ہے۔ اس کی جگہ بتانا بولا جاتا ہے لیکن آج کل کے کم مایہ شعرا جو بدقسمتی سے مشاہیر میں بھی شمار ہوتے ہیں اس لفظ کو پھر سے استعمال کرنے لگے ہیں۔

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گراں باریِ زنجیر بھی تھا

قیدِ وحشت میں جو سودائے زلف کی بدولت نصیب ہوئی تیرے وحشی کو وہی زلف کی یاد ہے ہنوز کوئی دوسرا خیال نہیں اور جھوٹ کیوں کہوں ہاں ایک گراں باریِ زنجیر کی تکلیف کا احساس بھی تھا مگر کچھ یوں ہی سا۔ یہاں مصنف نے بیانِ حال کرتے ہوئے لفظ "تھا" کا استعمال کیا ہے جس سے بیان ماضی مقصود ہوتا ہے۔ بقاعدۂ ظاہر یہ طرزِ بیان کچھ درست سا معلوم نہیں ہوتا لیکن یہ بات استعمالِ فصحا میں موجود ہے کہ کسی چیز کے متعلق بیانِ حال کرتے ہوئے لفظِ ماضی کا استعمال زورِ بیان کو کم کرنے کے لئے کیا جاتا ہے اس لئے

یہاں مصنف نے ردیف کا استعمال رنجِ گراں باریِ زنجیر کے لئے نہایت کامیابی سے کیا ہے۔

بجلی اِک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

مجھے شوقِ دیدار بھی تھا اور حسرتِ گفتار بھی اِک جھلک دکھا کر چلے گئے تو اس سے کیا سیری ہو سکتی ہے کہ آنکھوں کے آگے ایک بجلی سی کوند کر رہ گئی انھیں کچھ بولنا بتانا چاہیے تھا کیونکہ میں تشنہ لبِ تقریر بھی تھا۔

یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

میں نے یوسف سے کہا اور وہ مہ جمال سن کر خاموش ہو گیا بڑی خیر ہو گئی ورنہ اگر بگڑ بیٹھتا تو میں اس جرم پر کہ اس کے مرتبہ کو گھٹا دیا قابلِ عقوبت بھی تھا۔ یا یہ کہ میں نے اسے یوسفِ ثانی کہا اور وہ چپ ہو رہا ورنہ اگر حسن میں اولیت کا مرتبہ دوسرے کو دینے پر بگڑ بیٹھتا تو میں لائقِ تعزیر بھی ہو چکا تھا۔ یا یہ کہ اگر وہ اِس بات پر بگڑ بیٹھتا کہ مجھے ایک ایسے شخص کے نام پر پکارا جو بکتا پھرا ہے تو بجز اس کے کیا کہہ سکتا کہ لائقِ تعزیر ہوں۔

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا وے طالبِ تاثیر بھی تھا

غیر نالہ کش تھا اور اس کا نالہ بے اثر بھی اسے یوں بے فائدے کی چیخ و پکار کرتے ہوئے دیکھ کر کلیجہ کیوں نہ ٹھنڈا ہوتا۔ یا یہ کہ میں جو رقیب سے نالہ کش تھا اور ساتھ ہی یہ بھی تمنا تھی کہ اِن نالوں کا اثر ہو جائے ایسی حالت میں اسے یکایک تباہ حال دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا کیوں نہ ہو۔

پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

وہ بہادر بھی تو ہمیں آشفتہ سروں میں سے ایک تھا اگر فرہاد نے کوہکنی کی تو اُسے نام کیوں رکھتے ہو پیشے میں کوئی عیب نہیں مثل مشہور ہے کہ پیشہ ور حبیب اللہ ہے فرہاد کو نام رکھنے سے اہل عشق کی رسوائی ہے اسے نام رکھیں گے تو ساتھ ہی ہم بھی بدنام ہو جائیں گے اگر وہ عشق میں نالہ کشی کے عیوض بہادری پیشہ ہوا اور ایک بہانے سے اپنی کامیابی کے لئے اُس نے پہاڑ کو پھوڑ ڈالا تو اس میں کیا عیب ہے۔ ع

وَلِلنَّاسِ فِیْ مَا یَعْشِقُوْنَ مَذَاھِب

اس نے اسی کوہکنی کی مزدوری کو حصول مراد کا ذریعہ سمجھا اور ہمت سے کام لیا۔ لفظ "ہم ہی" اب مخفف ہو کر "ہمی" لکھا اور بولا جاتا ہے۔ میرے نزدیک اب "ہم ہی" لکھنا درست نہیں۔

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی
آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

ہم کوئی گلے لگانے کو نہیں کھڑے تھے مرنا چاہتے تھے اگر اُسے ہم سے ایسی ہی نفرت تھی کہ قتل کرنے کے لئے بھی پاس آنا پسند نہ تھا تو نہ سہی دور ہی سے ایک تیر لگا کر کام تمام کرتا آخر اس میں کیا عذر تھا۔ اسی مضمون کو مصنف نے دوسری جگہ یوں باندھا ہے ؎

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے   پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

فرشتوں کو تو اسی دن سے ہمارے ساتھ خدا واسطے کا بیر ہے جبکہ انھوں نے ہماری خلافت فی الارض کی مخالفت کرتے ہوئے اپنے حق کا دعوٰی کیا تھا اور منہ

کی کھائی تھی اب جو ہم کراماً کاتبین کے لکھے پر پکڑے جاتے ہیں تو یہ کیسی بات ہے اگر دمِ تحریر اعمال کوئی ہمارا آدمی بھی موجود تھا تو اسے گواہی میں لایئے۔ غالب کے اسی رندانہ شعر کے مطابق حضرتِ انسان قیامت کے روز اپنے اعمالِ زشت سے منکر ہونے کی جرأت کریں گے لیکن انھیں معلوم نہیں کہ وہاں دوسرا ثبوت کیا ہوگا۔ غالب تو اپنا آدمی ہی گواہی میں بلانا چاہتے ہیں وہاں خود مجرم کے ہاتھ پاؤں اس کے خلاف گواہی دینے کھڑے ہو جائیں گے۔ دوسرے مصرع کی تعقید غالب کے لئے تو اجنبی نہیں لیکن فصاحت اس کی متحمل بھی نہیں ہوتی میں نے بھی اس خیال کو یوں نظم کیا ہے۔

(ناطق)   کراماً کاتبین لائے ہیں میری فردِ عصیاں کو
گواہِ معتبر بن کر یہ دو خانہ بدوش آئے

ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ریختہ وہ زبان جو اجتماع السنہ سے بصورت ریختہ پیدا ہوئی یعنی زبان اردو۔ مطلب شعر یہ ہے کہ شاعر زبان اردو میں اپنے سوا صرف میر تقی میر کی استادی کا قائل ہے۔

(۳۶)

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا
زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا

میں بد نصیب گویا ان دل آزردہ لوگوں کا زیارت کدہ ہوں جو خشک لب آرزو تشنہ کام ملکِ عدم کو سدھارے یعنی میں ان لوگوں میں سے ایک زندہ باقی رہ گیا ہوں جو خشک لب تشنہ دہن دل آزردہ اس دنیا سے جا چکے ہیں اور چونکہ میں تنہا زندہ ہوں اس لئے ان لوگوں کی یادگار اور دنیا کے لوگوں کے لئے

زیارت کدہ ہوں۔

ہمہ نا امیدی ہمہ بد گمانی
میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

فریب وفا کھائے ہوئے لوگ از سرتاپا بدگمانی و نا امیدی ہو جاتے ہیں یعنی ان کے دل کو نہ کسی کا بھروسہ ہوتا ہے نہ کوئی امید باقی رہتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ "سانپ کا کاٹا ہوا رسی سے ڈرتا ہے" یہ کہتے ہیں مجھ حرماں نصیب کی بس یہی حالت ہو گئی ہے۔ مردگاں دل آزردگاں اور فریب وفا خوردگاں کا ایسا طرزِ بیان ہے کہ اب زبان اردو اس کی متحمل نہیں۔ میں مخفف سے میں اجتناب کرتا ہوں خصوصاً مصرع کی ابتدا میں اس کا لانا اور بھی نامطبوع ہے۔

(۳۷)

تو دوست کسی کا ہے ستمگر نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

اے ستمگر تو نہ کسی کا دوست ہے نہ ہوا تیرا جو ظلم پہلے مجھ پر ہوا تھا اس سے زیادہ اب غیروں پر ہو رہا ہے تجھ سے کوئی دوستی کی تمنا نہیں رکھ سکتا اور تو کسی کا دوست نہیں ہو سکتا۔ یا یہ کہ میں اس ظلم کو جو تو مجھ پر کرتا تھا اپنی خصوصیت سمجھ کر دوستانہ عنایت جانتا تھا لیکن جو مجھ سے زیادہ اوروں پر ظلم کرنے لگا تو اس سے معلوم ہو گیا کہ نہ وہ میرے ساتھ دوستانہ عنایت تھی نہ یہ اوروں کے ساتھ۔ بعض نسخوں میں پہلے مصرع میں لفظ ہے کی جگہ بھی لکھا ہے جو غلط کتابت ہے۔

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ابھی اس کے برابر نہ ہوا تھا

ماہِ نخشب حکیم ابن مقنع کا چاند جس کو نخشب نامی مقام میں بنا کر اس نے معلق

چھوڑ دیا تھا اس چاند کے متعلق کہا جاتا ہے کہ چاروں طرف بارہ میل تک روشنی دیتا تھا ظاہر ہے کہ یہ چاند ماہتاب فلک کے مقابلہ میں ناقص اور پست تھا۔ کہتے ہیں میرے معشوق کے حسن کی آب و تاب کی شان اس قدر اعلیٰ اور ارفع ہے کہ اس کے مقابلے میں دست قضا و قدر نے خورشید عالمتاب کو اس طرح ناقص اور پست چھوڑ دیا ہے جس طرح کہ ماہِ منور کے مقابلے میں ماہِ نخشب۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

توفیق ہر کسی کی مدد اس کی ہمت کے مطابق کرتی ہے یعنی جس کی ہمت ہو اتنی ہی اسے تائیدِ غیبی حاصل ہوتی ہے۔ دیکھو جس قطرہ نے گوہر بننے کی تمنا کر کے صدف میں مقید ہونا اپنی کسرِ شان سمجھا اس نے آنکھوں میں جگہ پائی یعنی قطرۂ اشک بنا جس کا مرتبہ گوہر سے بہت زیادہ بلند ہے۔ یہاں کلیم کاشانی کا شعر یاد آیا جو تقریباً اسی مضمون کا ہے اور جس پر جہانگیر نے اسے ایک لاکھ روپیہ انعام دیا تھا۔

تاک را سرسبز کن اے ابرِ نیساں در بہار
قطرہ تا مے میتواں گشتن چرا گوہر شود

جبتک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

یار کی قامت کا فتنہ پرور عالم جب تک میری نظر سے نہیں گزرا تھا اس وقت تک فتنۂ محشر کو میں مانتا ہی نہ تھا۔

(ذوق) وہ ہونگے کب قائلِ قیامت جو تیرا قامت نہ دیکھ لینگے
رہینگے رویت کے بلکہ منکر جو تیری صورت نہ دیکھ لینگے

میں سادہ دل آزردگیِ یار سے خوش ہوں
یعنی سبقِ شوقِ مکرر نہ ہوا تھا

میں سادہ دل معشوق کی رنجش سے اس لئے خوش ہوں کہ عرضِ شوق جو پہلے ملاقات ہونے کے وقت کیا گیا تھا اس کے تکرار کا پھر کوئی موقع نہیں ملا تھا اب سوچتا ہوں کہ جب تجدیدِ ملاقات ہوگی تو پھر یہ سبق دُہرایا جائے گا۔ ایسا خیال آنا یقیناً سادہ دلی ہوگی۔

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

گناہ کو تردامنی سے تعبیر کرتے ہیں اور گناہ گار کو تردامن کہتے ہیں۔ کہتے ہیں حسرتِ گناہ میں میں ایسا وسیع الذّیل ہوں کہ سارا دریائے معاصی خشک ہوگیا اور میرے دامن کا ایک کونا بھیگنے نہ پایا۔ حاصل یہ کہ میں نے دنیا بھر کے گناہ کر ڈالے لیکن پھر دیکھتا ہوں کہ حسرتِ دل کے لحاظ سے میں نے کچھ بھی نہیں کیا یعنی کیا بھی اور کچھ نہ ہوا۔

جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مری تحصیل
آتش کدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

سمندر ایک جانور کا نام ہے جس کے متعلق روایت مشہور ہے کہ چوہے کی شکل کا ہوتا ہے اور اگر سو سال تک پیہم آگ جلے تو اس میں یہ جانور پیدا ہوجاتا ہے اور آگ ہی میں رہتا ہے گویا آتش کدہ اس کی جاگیر ہے لوگ اس خیال کا تمسخر کرتے ہیں لیکن قدرت سے کچھ بعید نہیں کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ سمندر کے ان مقامات میں بھی مچھلیاں بکثرت ہوتی ہیں جہاں کا پانی اس قدر گرم ہے کہ اس کا ایک قطرہ حیوانی جسم پر پڑے تو جلا دیتا ہے یہ مچھلیاں اس پانی سے نکال کر ٹھنڈے پانی میں ڈالی جائیں تو فوراً مر جاتی ہیں۔ یہاں داغِ جگر کو آتش کدہ کا منبع ٹھہرایا ہے۔ کہتے ہیں داغِ جگر سے آتش کدہ اس زمانے سے آگ پا رہا ہے جبکہ یہ خود سمندر کی جاگیر نہ بنا تھا یعنی آتش کدہ اپنی حالت ابتدائی بھی ہے میرے داغ سوزاں کا پیدا کردہ ہے۔ یا یہ کہ سمندر کا گزارا آتش کدہ میں کہیں بعد جا کر شروع ہوا ہے میں اس سے بہت پہلے کا داغِ جگر

کی آگ کھانے اور اس آتشِ سوزاں میں رہنے کا عادی ہوں۔

(۳۸)

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

ناموس شرم و حجاب۔ کسوت لباس۔ خارِ پیراہن ہونا استعارہ ہے اسبابِ بیچینی سے۔ رشتۂ شمع شمع کی بتی یعنی موم بتی کے درمیان کا دھاگہ جس سے موم بتی جلتی ہے۔ کہتے ہیں آج رات کو جبکہ وہ شعلہ رو اپنی خلوت گاہ شرم و حیا میں جلوہ افروز تھا تو اس کے تابِ حسن سے مارے شرم کے شمع روشن کا دھاگہ جو اس کی ہواداری کرتا ہے یعنی وجہ نور ہوتا ہے فانوس کو خارِ پیراہن کی طرح بیچین کئے ہوئے تھا۔ حاصل یہ کہ اس کی تابِ حسن کے سامنے شمع روشن کو رکھ کر فانوس مارے شرم کے بیچین ہوا جاتا تھا کہ یہ آفتاب کو چراغ دکھانا ہوا۔

(دردؔ) رات محفل میں ترے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

حنا کو پابوس باندھتے ہیں۔ کہتے ہیں یا اللہ عاشق بھی کس قدر حسرتِ پابوسی میں مرا جاتا تھا کہ جس کی آرزو کے اثر سے شہید ہونے کے بعد اس کی قبر کے چاروں طرف کوسوں تک مہندی ہی مہندی اُگتی ہے یعنی اس کی حسرتِ پابوسی کا اثر زمین میں بھی دور تک پھیلا ہوا ہے۔

58

حاصلِ الفت نہ دیکھا جُز شکستِ آرزو
دل بہ دل پیوستہ گویا اک لبِ افسوس تھا

یہ عالمِ افسوس! ہونٹ کو ہونٹ سے ملا کر دانتوں سے دباتے ہیں جس کے لئے فارسی میں "لب بدنداں" گزیدن کا استعمال ہے اور یوں بھی بہ عالمِ افسوس! انسان خاموش ہو کر بیٹھتا ہے۔ کہتے ہیں دل لگانے یا محبت کرنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نظر نہ آیا کہ ہمیشہ بالآخر شکست آرزو یعنی ناامیدی سے واسطہ پڑا اس لئے دو دلوں کے باہم پیوست ہونے کو لب افسوس! کہنا بیجا نہ ہوگا۔

عہدِ وفا سے ہے کفِ افسوس! کا سبق
جاں دادۂ شکست ہے پیماں نباہ کا
(ناطق)

کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

بقاعدۂ یونانی جو غذا پیٹ میں جاتی ہے بلغ اول جسے کیلوس کہتے ہیں معدے میں ہو کر ایک باریک سیال صورت میں عروقِ ماساریقہ کے ذریعہ سے جگر کو منتقل ہو جاتی ہے جہاں طبخ ثانی ہو کر جسے کیموس کہتے ہیں اخلاطِ اربع بنتی ہیں جس میں خون بھی شامل ہے اور اخلاط میں زیادہ تولید جسم صحیح کے اندر خون ہی کی ہوتی ہے صفرا سودا اور بلغم کی تولید نسبتاً خون سے بہت کم ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ بیماریِ غم میں مجھے کیلوس اور کیموس کی احتیاج باقی نہیں رہی کیونکہ جو کچھ بھی کھایا وہ براہ راست خونِ دل تھا یعنی بیماریِ غم میں کچھ نہ ہر مار کرنا میرے لئے خونِ دل کھانے سے کم نہیں تھا۔

(۳۹)

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

اپنا سا منہ لے کر رہ جانا بے بس ہونا قائل ہو جانا شرمندہ ہونا۔ کہتے ہیں آپ کو بڑا گھمنڈ تھا کہ ہم کسی کو دل نہ دیں گے اب آئینہ دیکھ کر یہ کیا ہو گیا کیوں بہ مجبوری دل دے بیٹھے اور اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

قاصد کو گردن نہ ماریے ترجمہ ہے فارسی طرزِ استعمال کا جو "قاصد را گردن زدن" یہاں مصنف بڑی آسانی سے "کو" کی جگہ "کی" لکھ سکتے تھے مگر نہ ماریے کا خیال کرتے ہوئے "کی" لکھ کر پہلوئے ذم سے بچنے کے لئے لفظ "کو" لکھنا مناسب سمجھا۔ کہتے ہیں قاصد کی جو آپ اپنے ہاتھ سے گردن مارنے چلے ہیں اس کا مجھے رشک بلکہ حسد ہوتا ہے مہربانی فرما کر یہ عنایت مجھ پر کیجئے کہ وہ تو میرا بھیجا ہوا تھا اور اصل قصوروار میں ہوں بھلا ایلچی کو کیا زوال۔

(۴۰)

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

دل چونکہ صدمے اُٹھا اٹھا کر مضمحل ہو گیا ہے اس لئے اس پر مجھے اب ناز نہیں رہا اور میں اس کو بحالت موجودہ حضرتِ عشق کی نیاز مندی میں پیش کرنے کے قابل نہیں سمجھتا کیونکہ اس کے لئے پتھر کا دل درکار ہے۔ یا یہ کہ عشق کی لاحاصل نیاز مندی سے دل اُکتا گیا ہے اور اب مجھے اس کی حالت قابلِ اطمینان نظر نہیں آتی اگر اسے کسی معشوق کی بارگاہِ ناز میں پیش کروں تو خدا جانے کیسی خفت اُٹھانی پڑے۔

(۵۹)

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے
ہوں شمع کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

شمع کشتہ شمع مردہ بجھی ہوئی شمع جس کے سر پر شعلے کی جگہ داغ سیاہ نظر آتا ہے۔ شمع کو صبح ہونے اور بجھا دینے کے بعد محفل سے اٹھا دیا جاتا ہے۔ یہاں شمع کشتہ کے محفل سے نکلنے کو رنج محفل میں داغ لے کر نکلنے سے تعبیر کیا۔ یہ بات ظاہر ہے کہ شمع کشتہ قابل محفل نہیں رہتی کہ اس سے کچھ فائدہ نہیں۔ کہتے ہیں جس طرح شمع کشتہ داغِ حسرت محفل لے کر محفل سے نکلتی ہے اسی طرح میں مردہ دل بھی حسرتِ ہستی کا داغ لے کر محفلِ عالم سے رخصت ہوتا ہوں کہ بہ حالت بزمِ ہستی میں رہنے کے قابل نہیں اور میری اب یہاں کوئی ضرورت نہیں۔

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

وہ مرتے ہوئے کو مارنے کی زحمت کیوں اٹھائے گا "شہباز کو ہوائے شکارِ مگس نہیں"۔ کمبخت دل تو نے مجھے غمِ پیہم سے مضمحل کر کے اس قابل بھی نہیں رکھا کہ اس قاتل عالم کے ہاتھوں مارا جاتا اور نام کماتا اِس بیکار زندگی سے کیا حاصل چل اب کہیں مر رہنے کی کوئی اور ہی تدبیر کر۔

بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

شش جہت۔ امام۔ خلف۔ یمین۔ یسار۔ فوق۔ تحت۔ ہر طرف آئینہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے جو چاہے حسب حوصلہ خود آرائی کر لے۔ یہاں اس بات کی ضرورت نہیں کہ کامل ہی مستفید ہو ناقص بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یا یہ کہ آئینہ ناقدر شناس ہے کہ ناقص و کامل ہر ایک سے عکس پذیر ہو جاتا ہے۔ یا یہ کہ عکس جمال سے ہر طرف ایک عالم تحیر طاری ہے اور ہر ایک آئینہ ساں حیران ہے یہاں ناقص و کامل کا کوئی فرق نہیں۔

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

شوقِ خود نمائی نے حسنِ یار کو بے نقاب کر دیا ہے اب اگر اہلِ نظارہ کے لئے کچھ مانع دید ہے تو خود ان کی کم نگاہی۔

(ناطق) عام تھا جلوہ مگر دیدۂ بیدار نہ تھا
سب تھے اور کوئی بھی نظارہ کا حقدار نہ تھا

(ولہ) تھا دیدۂ ظاہر بیں خود مانع نظارہ
اب راز کھلا ہم پر کیا پردۂ حائل تھا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

گو مجھ پر زمانے کی ہزار مصیبتیں آئیں لیکن اپنی بد ادسانی میں کسی وقت تجھے نہ بھولا اور یہی سمجھا کہ "ہمہ از اوست"

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

دل سے کشتِ وفا کا خیال ہم نے اس لئے مٹا دیا یا اس لئے مٹ گیا کہ اس کھیتی کی پیداوار بجز اس خیال کے کچھ نہیں کہ ہائے کچھ نہیں

(ناطقؔ) تھی برق فنا پنہاں خود کشتِ تمنا میں
حاصل یہ کہ لاحاصل اندیشۂ حاصل تھا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے میں کبھی نہیں ڈرتا لیکن اے غالب کیا کروں وہ میرا بہادر ستم کش دل جو قابلِ ناز تھا باقی نہیں رہا اب اس ظلم و جفا کا مقابلہ کروں تو کس کی

ہمت سے اور کس کے بل بوتے پر۔

(۴۱)

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

معشوق کے ساتھ غیر کا ارتباط اور اخلاص دیکھ کر مجھے رشک آتا ہے تو عقلِ سلیم کہتی ہے کہ کیوں دیوانہ ہوا ہے بھلا وہ بے مہر کس کا آشنا۔

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا۔

جس طرح مجنوں کی گردش یعنی آوارہ گردی لیلیٰ کی آنکھ کے اشاروں کو پہچانتی ہے یعنی جس طرح چشمِ لیلیٰ کے اشاروں پر مجنوں رقص کرتا یا گھومتا ہے اس طرح دنیا کا ہر ذرہ نیرنگِ عالم کے میخانے کا ایک ساغر ہے جو وقت کے اشارہ پر گھومتا ہے۔

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

شوق اہلِ عجز کے لئے خود بخود سامانِ ناز پیدا کر دیتا ہے چنانچہ ذرہ کا دل ذوقِ صحرا میں محو ہو کر اسے صحرا بنا دیتا ہے اور قطرہ تمنائے دریا میں (دریا کے اندر) فنا ہو کر دریا ہو جاتا ہے یعنی قطرہ کا شوق اسے دریا میں ملا کر دریا کر دیتا ہے اور ذرہ کی آرزو اسے صحرا میں رکھ کر صحرا بنا دیتی ہے۔

شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر نہ رہنا چاہیے
میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

شعرا زانوں کو آئینہ باندھتے ہیں چنانچہ اہلِ فارس نے کثرت سے آئینۂ زانوں کا استعمال کیا ہے۔ یہ بھی ہوتا تھا کہ پہلے بوقت آرائش آئینہ زانوں پر رکھ کر دیکھا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ تم شوقِ خود آرائی میں رو بہ آئینہ ہو اور میں اپنے غم و اندوہ سے سر بہ زانو اس میں ایک دوسرے کا شکوۂ رشک کرنے کی ضرورت نہیں اب تم یہ شکایت کرو کہ کیسے عاشق ہو زانوں کو مونس بنا رکھا ہے اور نہ میں یہ گلہ کروں کہ تم نے آئینہ سے آشنائی پیدا کی۔ حاصل یہ کہ تم خود بینی و خود آرائی میں محو ہو اور تمہیں میری پرواہ نہیں تو اب مجھے اپنے حالِ غم و اندوہ میں مست رہنے دو چڑتے کیوں ہو اور طعنے کیوں دیتے ہو۔

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

مجھے ایک ایسے آفت کے پرکالے وحشی دل سے واسطہ پڑا ہے جو آوارگی اور مصیبت کو پسند کرتا ہے اور سکون و راحت کا دشمن ہے۔

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

مشہور ہے کہ جوئے شیر کے دہانے پر فرہاد نے شیریں کا بت بنایا تھا۔ کہتے ہیں پتھر سے سر مار کر کوہکن شیریں کو پیدا نہ کر سکا ایک تمثالِ یار اس نے ضرور بنائی جو آشنا نہیں ہو سکتی۔ ہووے کا استعمال اب نہیں۔ یہاں اسے مصنف نے ہو سکتا ہے کے معنی میں لکھا ہے جو درست نہیں معلوم ہوتا۔

(۴۲)

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

معشوق کا ذکرِ حسن اور اس پر ہمارا حسنِ بیان نتیجہ یہ نکلا کہ جو ہمارا رازداں تھا

وہ بھی اس پر عاشق ہو کر ہمارا رقیب ہو گیا۔

(داغ) پہلے ہی وہ زمین پہ رکھتے نہ تھے قدم
تعریف کرکے اور بھی ہم نے اُڑا دیا

مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب
آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

بزمِ دشمن میں معشوق کے بہت شراب پی جانے کا باعث کیا۔ یا اللہ کیا آج ہی انھیں اس بات کا امتحان کرنا تھا کہ دیکھیں کس قدر پی سکتے ہیں کیا اس کے لئے میرا گھر یا خود اُن کا اپنا گھر مناسب نہ تھا۔ حاصل یہ کہ انھیں غیروں میں بدمستی کا تماشہ دکھانا منظور تھا یا خود کو بیہوش کر کے غیر کے حوالے کر دینا تھا جو نہایت شرم کی بات ہے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

عرش عالمِ امکان میں بلند ترین مقام ہے جس کے اُدھر اہلِ حکمت خلا و ملا کچھ نہیں مانتے اسی کو لامکاں بھی کہتے ہیں۔ بلندی سے پست مقامات تو بخوبی نظر آتے ہیں لیکن جس سطح میں ہوں اس سطح کا بعید منظر کما حقہٗ نظر نہیں آسکتا۔ کہتے ہیں عرش منزل ہونے سے یہ تو ہوا کہ ہفت افلاک کا منظر ہمارے پیش نظر ہے لیکن یہاں سے خود عرش کا منظر کما حقہٗ نظر نہیں آتا۔ کاش اُس سے بھی بلند تر اپنا مکان ہوتا کہ عالمِ امکان بتمامہ پیشِ نظر رہتا۔ سالک راہِ طریقت میں ہمیشہ رفعِ منازل کا طالب رہتا ہے اور کسی مقام کو منزلِ منتہا قرار نہیں دیتا۔ بصورتِ دیگر اگر دھوکہ کھا کر کسی مقام کو منتہا سمجھ کر ٹھہر جائے تو اسے تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ معنی آفرینی کے لئے میدان بہت وسیع ہے لیکن فی الحقیقت یہ شعر غالبؔ کی شاعری کے لئے پست ہے۔

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

چلو اچھا ہوا کہ معشوق کا دربان ہمارا پُرانا ملاقاتی نکلا اب وہ بے مروت ہو کر جس قدر ذلت دیوے گا اس پر ہم یہ کہہ دیں گے کہ یار بے تکلف ہے ہمارا اس کا پہلے سے ایسا ہی معاملہ چلا آتا ہے اور یوں بات ہنسی میں ٹلتی رہے گی۔ یا یہ کہ وہ جب سختی کرے گا تو ہم کہیں گے واہ دوست کیا کہنا تم خوب حق آشنائی ادا کر رہے ہو۔ لفظ "بارے" کا اِس طرح استعمال غالبؔ کے بعد نہیں کیا گیا۔

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں اسکو دکھلادوں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

دردِ دل کے مضامینِ خونچکاں لکھتے لکھتے انگلیاں گھس گئیں خون نوکِ قلم سے ٹپک رہا ہے اور ہنوز کچھ نہیں لکھا جاتا آخر یہ سوکھے یا پڑ کب تک بیلتا رہوں خود وہاں جاکر اپنی زخمی انگلیاں جن کے خون سے قلم فوارہ بنا ہوا ہے انھیں بتا دوں یہ زبانِ حال خود دفتر بیان بن جائے گی۔

(داغ) کاتبِ اعمال سے چند تھی دمِ تحریرِ شوق
انگلیاں گھس گھس گئیں وہ خامہ فرسائی ہوئی

گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا

میرے سجدۂ آستاں کو باعثِ ننگ سمجھ کر آپ نے اپنے سنگِ در کو بدلنے کی عبث زحمت فرمائی میں خود ہی اس پر اس قدر سجدے کرتا کہ وہ گھستے گھستے مٹ جاتا۔

تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

اس ڈر سے کہ کہیں جاکر وہ چغل خوری نہ کرے ہم نے دشمن کو بھی اپنے ڈھب پہ

چڑھالیا ہے اور دوست کی شکایت میں اپنا ہمزبان بنالیا ہے کہ وہ بھی ہاں میں
ہاں ملانے لگا ہے اب کیا چغل خوری کرے گا۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

یہ مشہور ہے کہ آسمان دشمنِ اہلِ کمال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں ہم میں کون ایسا کمال
موجود تھا جو آسمان نے ہم سے بیر باندھا۔

(۴۳)

سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

میں بینائی کو مفت روشن کرنے والا سرمہ ہوں اور قیمت یہ ہے کہ چشمِ خریدار پر
میرا احسان رہے۔ یا یہ کہ میں بہ فیضِ اہلِ باطن ہوں اور چشمِ بینا پر میرا احسان
ہے کہ اس کو مفت روشن کرتا ہوں۔ یا یہ کہ میرا کمالِ شاعری اہلِ ذوق کے
لئے سرمۂ بصیرت افروز ہے اور اس کی یہی قیمت ہے کہ ان کے وجدان پر میرا
احسان رہے۔ بیچارا شاعر ناقدری کے زمانے میں اس سے زیادہ اہلِ دنیا سے
کیا امید کرسکتا ہے یہی غنیمت ہے کہ لوگ پڑھ کر گالیاں نہ دیں۔

رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

مجھے نالہ کرکے دل کی بھڑاس نکال لینے دے ضبط پر مجبور کرے گا تو کہیں ایسا نہ ہو
کہ صبر پڑے اور میرے غمِ پنہاں کے اثر سے تیرا پھول سا چہرہ مرجھا جائے۔

مرے صبر نے غضب کیا کہ عدو کے جاں پہ بن گئی
یہ کہاں کی چوٹ کہاں لگی یہ کہاں کا درد کہاں اٹھا
(ناطقؔ)

(۴۴)

غافل بہ وہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طُرّہ گیاہ کا

گھانس خودرو ہوتی ہے اور بہ ظاہر کوئی اس کی تربیت نہیں کرتا لیکن حقیقت
حال یہ ہے کہ جس زمین پر ہوا کا گزر نہ ہو وہاں گھانس دل تو پیدا ہی نہیں ہوتی اور اگر
ہوتی بھی ہے تو نہایت مرجھائی ہوئی شکل میں۔ کہتے ہیں کہ غافل اپنے وہمِ فخر و ناز
کے اندر خود کو خود آرا سمجھتا ہے حالانکہ دنیا عالمِ اسباب ہے یہاں سبزۂ خودرَو
بھی ہوا کی مدد کے بغیر طرہ نہیں نکال سکتا۔ حاصل یہ کہ بغیر امدادِ غیبی جسے امداد
باہمی سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کوئی کچھ نہیں ہوتا یہاں جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں
کہ ہم نے اپنی تدبیر یا قوتِ بازو سے کام کرلیا انھیں بیجا گھمنڈ ہے۔

بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ
صیدِ ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا

عیشِ تمنا اضافتِ مقلوب ہے یعنی تمنائے عیش۔ غالبؔ کے لئے ہر ترکیب روا
ہے لیکن عام اردو شاعری اس کی متحمل نہیں۔ کہتے ہیں بزمِ شراب سے عیش کی تمنا
رکھنا نادانی ہے کیونکہ رنگِ سرور ایسا شکار ہے جو اس دام گاہ کے جال سے
نکل بھاگا ہے۔ حاصل یہ کہ مے نوشی سرور نہیں بلکہ یا تو بے ہوشی ہے یا خمار۔
یگانہ چنگیزی نے اس کا تمسخر کرتے ہوئے لالہ بھیروں پرشاد کا شعر لکھا تھا۔

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

عذرِ گناہ نہ کرنے کے لئے مجھے شرمندگی کا عذر ہے کہ میں اپنے مالک کے سامنے شرمندگی
گناہ سے منہ کھولنے کے قابل نہیں اگر رحمتِ ایزدی اس عذر کو قبول کرلے جو

63

بے زبانی سے کیا جا رہا ہے تو اس کی شان سے کچھ بعید نہیں۔

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پر گل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

مقتل میں جا کر میں جو جو زخم کھاؤں گا وہ آنکھوں میں پھر رہے ہیں یعنی دامنِ نگاہ میں بھرے ہوئے ہیں اور ایسے خوشگوار معلوم ہوتے ہیں کہ گویا گلِ مراد سے دامن بھرا ہوا ہے اس سے میری خوشی کا اندازہ کر لیجئے۔

جاں درہوائے یک نگہہ گرم ہے اسدؔ
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

سبحان اللہ۔ غالبؔ ترے حسن کے دربار میں دادِ عشق چاہنے آیا ہے اور پروانے کو وکیل بنا کر لایا ہے جو شبستانِ ناز میں اپنی جان شمع کی شعلہ خوئی کی نذر کر کے بزبانِ حال کہہ رہا ہے کہ "جاں درہوائے یک نگہہ گرم ہے اسدؔ"

(۴۵)

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھکو منہ دکھلائیں کیا

ظلم سے باز بھی آئے تو وہ کیا باز آئے کیونکہ وہ کہتے ہیں ہم تجھے اب کیا منہ دکھائیں۔ یہ پشیمانی کے بہانے سے منہ دکھانا پہلے ظلم سے بڑھ کر ظلم ہے تو اسے کیونکر کہا جائے کہ وہ ظلم سے باز آئے۔

(ناطقؔ) یہ شرمِ جفا کیسی منہ ہم سے چھپاتے ہو اِس شرم کو کیا کہئے شرمانے کو کیا کہئے

رات دن گردش میں ہیں ہفت آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

کبھی تو ہمارے بھی دن پھریں گے۔

(ناطقؔ) کیوں نہیں پھرتے کبھی عاشق کے دن کیا الگ ہیں گردشِ ایام سے

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکہ کھائیں کیا

وہ ہم پر ظلم کرتا تو لطف قرار دے کر پیار کی مار سمجھتے لیکن جب یہ بھی نہیں تو دل کو کس طرح سمجھائیں اور کس بات کا دھوکہ کھائیں۔

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یارب اپنے خط کو ہم پہونچائیں کیا

راستہ بتاتے بتاتے جو نامہ بر کے ساتھ ہی ساتھ جانا پڑ رہا ہے تو یا اللہ کیا ہمیں اپنے خط کو خود ہی وہاں لے جا کر پہونچانا پڑے گا۔

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

جورِ فلک سے یہاں بیٹھ کر خون میں نہانا تو کیا اپنے خون کی ندی میں چاہے ڈوب ہی کیوں نہ جائیں لیکن ہم درِ یار سے نہ اُٹھیں گے۔

(ناطقؔ) گلے گلے ترے خنجر کی دھار چڑھ کے چلے
ہمیں خوشی ہے کھڑے خون میں نہانے کی

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

معشوق نے ہمیں جیتے جی تو موت کی راہ دکھائی یعنی وہ وہ ستم یا ایسا تغافل کیا کہ ہم زندگی سے تنگ آ کر مرنے کی راہ دیکھتے رہے خدا جانے اب جبکہ ہم مر گئے ہیں تو وہ کیا دکھاتے ہیں یعنی نعش کی تشہیر کرتے ہیں یا قبر کو پامال۔ یا یوں سمجھئے کہ ہم نے فکرِ عاقبت میں عمر بھر مرنے کی راہ دیکھی ہے دیکھئے مرتے پر کیا دکھائی

دیتا ہے۔

(ذوق) اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

(ناطق) زندگی سے موت اچھی ہے اگر خاتمہ ہو بعدِ مرگ آلام کا

یا یہ کہ ہم نے زندگی بھر اس خیال سے موت کی راہ دیکھی ہے کہ جلوۂ ذات کا وعدۂ دیدار بعدِ مرگ ہے۔ خدا جانے بعدِ مردن کیا نظر آتا ہے حدیث میں آتا ہے کہ اہلِ جنت جلوۂ ذاتِ باری کو اس طرح صاف دیکھیں گے جس طرح لوگ چودھویں رات کے چاند کو دیکھتے ہیں۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

وہ پوچھ رہے ہیں کہ غالبؔ کون ہے بتایئے کہ اب ہم کیا بتائیں کیونکہ ہماری تو کوئی شخصیت ہی نہیں یا یہ کہ اس سوال کا جواب کوئی دوسرا دے کہ ہمارے لئے اپنا تعارف خود کرانا موزوں نہیں۔ یا یہ کہ وہ تجاہل عارفانہ کر رہے ہیں اب اس کا کیا جواب اس شعر میں "بتلاؤ" نہ صرف یہ کہ زمانہ حال کے متروکات میں سے ہے بلکہ "کوئی" کے ساتھ "بتلاؤ" کا استعمال بھی درست نہیں ممکن ہے کہ مصنف نے "بتلائے" لکھا ہو جو بگڑ کر بعد میں "بتلاؤ" ہو گیا۔

(۴۶)

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آیئنۂ بادِ بہاری کا

چمن بلحاظِ سبزی زنگار سے مماثل ہے اور ہوا کا وجود جو عنصر لطیف ہے نظر نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں کہ لطافت کو اپنے اظہارِ وجود کے لئے کثافت کی ضرورت ہے [illegible] اور ہوا بذریعہ چمن جلوہ آرائی کرتی ہے جو اجسامِ کثیف سے مرکب

ہے اور جو آیئنہ ہوا کے لئے زنگار سے کم نہیں۔

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریٔ ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

جس طرح کہ جوشِ دریا کے مقابلے میں ساحل باایں ہمہ خودداری خود کو غرق آبی سے نہیں بچا سکتا یعنی دریا کی طوفانی موجیں اسے لے ہی ڈالتی ہیں اسی طرح جس بزم میں کہ تجھ سا دربادل ساقی ہو وہاں کوئی رندِ مے نوش ہوشیار نہیں رہ سکتا اور اگر کوئی دعویٰ ہوشیاری کرے تو جھوٹا ہے۔

(۴۷)

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

جس طرح قطرہ کے لئے سامانِ عشرت دریا میں فنا ہو جانا ہے کہ یہ جزو اپنے کل میں شامل ہو کر کل ہو جاتا ہے۔ قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے۔ اسی طرح اہلِ درد کے لئے بھی درد کا حد سے گزر جانا دوا ہو جانا ہے کہ فنا ہو کر مبدءِ ذات میں شامل ہو جاتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ دوائے درد ہے بلکہ سامانِ عشرتِ دوام بھی ہے۔

(ناطق) نجات دہر کا باعث ہوا [illegible] تسلسل سے
فنا جو ہو گیا کل میں وہی جز بڑھ گیا کل سے

میرے اس شعر پر لکھنؤ کے ایک پروفیسر صاحب نے جو خوش قسمتی سے ایک مشہور شاعر مرحوم کے صاحبزادے بھی ہیں یہ اعتراض کیا کہ "جز کل سے مسلماتِ علمی کے مطابق ہرگز نہیں بڑھ سکتا" جب مجھ تک ان کا یہ اعتراض پہونچا تو میں نے کہا کہ "شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد" کاش پروفیسر صاحب کو یہ معلوم ہوتا کہ قافیہ "کل" کا "جز" کے مقابلہ کا نہیں۔

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

قفلِ ابجد حرفوں کا قفل جو واضع کے مقرر کردہ حروف کو ایک خط میں جمع کر دینے سے ایک لفظ یا بات بن کر فوراً کھل جاتا ہے مثلاً کسی قفل کی وضع حروف "م" "ل" یا "سے" رکھی جائے تو جب تک لفظ "ملے" نہ بنے قفل نہیں کھل سکتا اور جب یہ لفظ ملیں گے تو کھل کر قفل کے دونوں حصے جدا ہو جائیں گے۔ یہاں بات بنا تدبیر بنانے یا رسمِ محبت پیدا ہونے کے معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں جس طرح قفل ابجد کے لئے یہ بات مقدر ہوتی ہے کہ بات کے بنتے ہی جدا ہو جائے اسی طرح میری قسمت میں بھی لکھا تھا تم سے میل پیدا ہوتے ہی جدائی ہو۔

دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا

دلِ بیمار چارہ جوئی کی کھینچ تان میں تمام ہو گیا گویا یہ ایک گرہ تھی جس کے کھلنے کا امکان ہی کھولنے والوں کی گھسا گھسیں میں مٹ گیا یعنی دھاگہ ہی ٹوٹ گیا ظاہر ہے کہ کشمکش سے گرہ اور سخت ہوتی جاتی ہے اور اس کے کھلنے کا امکان ہی جاتا رہتا ہے۔

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

اللہ اللہ اہلِ وفا سے یہ دشمنی کہ آپ نے اب ہمیں جفا سے بھی محروم کر رکھا ہے۔

ضعف سے گریہ مبدل بدمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

ہمیں پہلے اس بات میں شک تھا کہ اربعِ عناصر ایک دوسرے میں مبدل ہو جاتے اب جو یہ دیکھ لیا کہ ضعف کے اثر سے گریہ بدمِ سرد مبدل ہو گیا کہ آنسوؤں کے

بدلے میں اب ٹھنڈی سانسیں نکل رہی ہیں تو ہمیں قانونِ استحالہ کو ماننا پڑا۔

دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

مثل مشہور ہے کہ کہیں گوشت سے ناخن بھی جدا ہوتا ہے اور یہ مثل اکثر عزیزوں کے ارتباط کے متعلق بولی جاتی ہے جس سے دل اور انگشت حنائی کا تعلق ظاہر کرنا مقصود ہے۔ اگر ناخن کو گوشت سے جدا کیا جائے تو تکلیف بے حد کا باعث ہوتا ہے کہ ایسی تکلیف جسم پر کوئی گہرا زخم لگنے سے بھی نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں تیری انگشت حنائی کا خیال دل سے کیونکر مٹ سکتا ہے کہیں گوشت سے ناخن بھی جدا ہوا ہے۔ یا یہ کہ دل سے اس خیال کو مٹانے کی کوشش اس قدر تکلیف رساں ہے جس طرح گوشت سے ناخن کو جدا کرنا۔

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

ابرِ بہار کے برس کر کھلنے کا منظر دلفریب ہوتا ہے۔ کہتے ہیں روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا میرے لئے ایسا خوش آئند ہے جیسا کہ ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا۔ اس شعر میں "میرے لئے" کی جگہ جس طرح مصنف نے "مجھے" کا استعمال کیا ہے میرے نزدیک اب یہ درست نہیں۔

گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس
کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

نکہتِ گل جو جولانِ صبا کی گردِ راہ بنی ہے اس کا سبب بجز اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ اسے تیرے کوچے میں پہونچنے کی ہوس چکر میں ڈالے ہوئے ہے ورنہ تیرے سوا اور کون ایسا ہے جس کے لئے بوئے گل جیسی ہستی آوارگی پسند کرے۔

تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

ہوائے صیقل ہوائے برشگال برساتی ہوا کے اثر سے عالمِ خشک کو صیقل ہوتی ہے یعنی وہ تازہ چمک دمک سے نمودار ہوتا ہے یا اس میں سبزی کی رنگینی پیدا ہو جاتی ہے۔ برسات کی مرطوب ہوا سے آئینۂ فولاد جس کا استعمال ہمارے ملک میں انگریزی حکومت سے پہلے ہوتا رہا ہے سبزی لے آتا ہے۔ کہتے ہیں ہوائے صیقل کا اعجاز دیکھنا ہو تو آئینۂ فولاد کو دیکھ کر یہ بھی موسمِ برسات میں سبز یا سرسبز ہو جاتا ہے یعنی حیوانات و نباتات تو کیا برساتی ہوائیں جمادات پر بھی اپنا رنگ جمائے بغیر نہیں رہتیں۔

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشہ غالبؔ
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

جلوۂ گل سے مراد ہے جلوۂ گلِ مراد یا حصولِ گلِ مراد۔ ذوقِ تماشہ سے جلوۂ گل بھی میسر آجاتا ہے اس لئے آنکھ کو چاہئے کہ ہر رنگ کو دیکھے اور پرکھنے کی کوشش کرے۔ یا جلوۂ گل جلوۂ ذات جس کا ہر رنگ میں ظہور ہے۔ کہتے ہیں کہ چشمِ حقیقت بیں کے لئے جلوۂ گل ذوقِ تماشہ آفریں ہے اس لئے آنکھ کو چاہئے کہ ہر چیز کا نظارہ غور سے کرے یعنی حقیقتِ اشیاء پر نظر رکھے کہ ہر جگہ ایک ہی لطفِ نظارہ ہے ؎

نظر بہ عیب مکن در طیورِ باغِ وجود
کہ طوطیانِ چمن زاغ و ہمزغن ہمہ اوست

(۴۸)

پھر ہوا وقت کہ ہو بالِ کشا موجِ شراب
دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

"بطِ مے" کی صراحی۔ شراب کی صراحی بشکل بط بھی بنائی جاتی ہے۔ دل ہمت دست طاقت۔ موسمِ بہار یا فصلِ گل یا موسمِ برشگال کی آمد آمد کا یوں ذکر کرتے ہیں کہ وہ وقت آپہونچا کہ موجِ شراب پر پُرزے نکال کر بطِ مے میں جان ڈال دے اور اس کے اندر موجِ مستی میں گھومنے کی امنگ اور طاقت پیدا ہو جائے۔ ایسے اشعار قصیدے کی تشبیب کے لئے بہت موزوں ہوتے ہیں اس میں "پھر ہوا" کی جگہ آ گیا زیادہ موزوں ہوتا۔

پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

"اربابِ چمن" نہالانِ چمن جن کی سبزی موسمِ بہار میں سیاہی کی حد تک گہری ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں ان کی سیہ مستی کی وجہ یہ ہے کہ موجِ ہوا ان میں روح پیدا کر دیتی ہے جو سایہ تاک سے گزر کر موجِ شراب بن جاتی ہے اور یہ اس ہوا سے متکیف ہو کر مستانہ وار جھومنے لگتے ہیں۔

جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

مشہور ہے کہ مرغِ ہما کا سایہ جس کے سر پر پڑ جائے وہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔ موجِ آب جس صنف میں شراب بھی ہے اگر سر سے گزر جائے یعنی سر سے بلند ہو جائے تو انسان کے لئے باعثِ ہلاکت ہوتی ہے۔ انتہائے مصیبت کے وقت بولا جاتا ہے کہ پانی سر سے گزر گیا۔ کہتے ہیں کہ موجِ شراب اگر سر سے گزر بھی جائے تو بالِ ہما کا اثر کرتی ہے۔ بدمست کو غرقاب بھی کہتے ہیں۔ یعنی جس کے سر سے موجِ شراب گزر جائے وہ عالی مرتبت بادشاہ کی طرح دنیا و ما فیہا سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اسے کوئی غم باقی نہیں رہتا۔ اس لئے جو غرقاب ہو جائے سمجھو کہ اس کے بڑے نصیب۔

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

برسات وہ موسم ہے کہ اس کے اثر سے جوشِ مستی پیدا ہوتا ہے اس لئے اگر ہوائے برشگال جہانِ گزران کی رفتار کو بھی موجِ شراب بنا دے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو
موجِ گل موجِ شفق موجِ ہوا موجِ شراب

"چار موج" بھنور گرداب۔ کہتے ہیں باغ میں موجِ گل ہے تو آسمان پر موجِ شفق فضا میں موجِ ہوا ہے تو بزم میں موجِ شراب غرض جس طرف دیکھئے اسی طرف موجِ طرب کا طوفان امڈا ہوا ہے جس کے گرداب میں دنیا غرق ہوئی جا رہی ہے۔

جس قدر روحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز
دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

"روح نباتی" قوتِ نامیہ یہاں مراد ہے دل کی بڑھتی ہوئی امنگوں سے۔ کہتے ہیں کہ دلوں کی امنگیں جس قدر بڑھ کر باندازِ ناز ابھرنا چاہتی ہیں اسی قدر موجِ شراب آبِ بقا بن کر انھیں سیراب کرتی ہے یعنی حسبِ حوصلہ جانفزائی ہوتی ہے۔ یا یہ کہ روح حیوانی تو الگ رہی روح نباتی بھی باندازِ نازِ موجِ شراب کی روح افزائی سے متمتع ہوتی ہے یعنی شراب نباتات کے لئے بھی وجہِ ناز ہے کہ یہ انگور سے پیدا ہوتی ہے جو نباتات میں شامل ہے اس لئے شراب کا جانفزا وجود ایسا ہے کہ نباتات اس پر جتنا ناز کریں بجا ہے رنگِ طرب کے پر لگا کر

بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

رنگِ طرب کے پر لگا کر موجِ شراب انگور کی شاخوں میں خون کی طرح دوڑتی پھر رہی ہے۔ یا سبزی و شادابی کو شہپرِ رنگ ٹھہرایا ہے یا یہ کہ شراب جو رگِ تاک میں خون بن کر پھرتی ہے رنگِ سبز کے شہپر سے اڑی جا رہی ہے۔

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

موجِ شراب کے تصور میں ان کا دماغ باغ باغ ہو رہا ہے جس کے پھولوں کی افروختگی سے گزرگاہِ خیال چراغاں نظر آتی ہے۔

نشہ کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ
بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

شراب پینے کے بعد دماغ میں جو ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کو نشو و نما سے تعبیر کیا یعنی چونکہ شراب کو دماغ میں نشو و نما پیدا کرنے کی فکر ہے اس لئے وہ نشے کے پردے میں آکر اس کا تماشہ دیکھتی ہے۔ یا یہ کہ بہ عالمِ نشہ یکسوئیِ خیال پیدا ہو کر دماغ کو جو دور کی سوجھنے لگتی ہے اس حالت کو نشو و نما سے تعبیر کیا یعنی چونکہ شراب کو دماغ کی نشو و نما کا خیال ہے اس لئے وہ نشے کے پردے میں آکر اس کی بلند پروازی کا تماشہ دیکھتی ہے۔ یا یہ کہ چونکہ شراب کو خود نشو و نما پانے یعنی رفعتِ خیال کی فکر ہے اس لئے نشے کے پردے میں آکر دماغ کی تماشائی ہوتی ہے کہ دماغ ہی نشو و نمائے خیال کا گھر ہے۔

ایک عالم پہ ہے طوفانیِ کیفیتِ فصل
موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

سبزۂ نوخیز ہو یا شرابِ کہنہ فصلِ گل کی طوفانی کیفیت سب پر یکساں اثر کرتی ہے یعنی چھوٹے سے لے کر بڑے تک یا بچے سے لے کر بوڑھے تک سب مست ہیں۔ سبزۂ نوخیز ابتدائے نمو ہے اور شراب انتہا و حاصلِ نمو۔

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل
رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشا موجِ شراب

زہے موسمِ گل جو ہنگامۂ ہستی کی تشریح کر کے اس کی دلفریبیوں سے نفرت دلاتا ہے کہ یہ سب آنی اور فانی ہے اور خوشا موجِ شراب شوق جو قطرہ کو دریا میں ملاتی ہے یعنی اس کی مدد سے انسان دنیا کے جھگڑوں سے نجات پاتا اور اس کی بدولت مبدءِ ذات میں شامل ہو جاتا ہے۔ یا یہ کہ زہے موسمِ گل جس سے ہنگامۂ ہستی کی شرح ہوتی ہے اور اس طرف انسان کھنچا چلا جاتا ہے اور مبارک ہے موجِ شراب جس کی بدولت انسان اپنی انفرادی کیفیات سے ہٹ کر دنیا کی رنگ رلیوں میں شامل ہو جاتا ہے۔

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

جلوۂ گل جو موسمِ بہار کی علامت ہے دیکھ کر اے غالب میرے ہوش اڑے جاتے ہیں، لو پھر وہ وقت آ گیا کہ وہی دشمنِ ہوش یعنی موجِ شراب پر پُرزے نکال کر ہنگامہ خرد کو پامال کر ڈالے۔

(۴۹)

افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت

بعالمِ تعجب و حسرت و افسوس! دانتوں میں انگلی دبانے کی رسم ہے۔ "عقدِ گہر" ہونے کا اردو میں موزوں ترجمہ "سونے چاندی سے کھیلنا ہوگا۔" موتیوں کے ساتھ دانتوں کو جو مناسبت ہے وہ ظاہر ہے۔ یہ بات قرینِ قیاس ہونا چاہیے کہ اہلِ کمال سونے چاندی سے کھیلیں یعنی وہ اہلِ دولت ہوں یہ ناقدر شناسیِ

فلک یا جورِ زمانہ کی شکایت کرتے ہیں کہ افسوس! جو انگلیاں عقدِ گہر کرنے کے لائق تھیں وہ دانتوں کا رزق ہو گئیں یعنی اہلِ کمال کو وقفِ حسرت و اندوہ کر کے رکھ دیا کہ وہ بہ عالمِ بے بسی دانتوں سے انگلیاں کاٹیں۔ میرے والد صاحب مرحوم خدا اُنھیں غریقِ رحمت کرے گو شاعری کم کرتے تھے لیکن ذوقِ سلیم ایسا رکھتے تھے کہ ہمیشہ نہ صرف بلحاظِ ادب پدری بلکہ بوجہ زورِ دلائل مجھے ان سے قائل ہونا پڑتا تھا ایک روز کا ذکر ہے کہ میں دیوان غالب پڑھ رہا تھا حضرت بھی اتفاق سے تشریف لے آئے اور میرے ہاتھ سے دیوان لے لیا صفحہ وہی کھلا ہوا تھا جس پر یہ شعر ہے آپ نے پڑھ کر اول تو تعریف کی اس کے بعد مجھ سے کہا میاں بتاؤ اس میں غالب نے کوئی غلطی تو نہیں کی ہے میں نے غور کیا اور جب مکرر سوال پر بھی میں خاموش ہی رہا تو فرمایا دیکھو شاعر کا مطلب یہ ہے کہ "فلک نے انگشت کو دانتوں کا رزق کیا" لیکن الفاظ ایسے استعمال کئے ہیں جن سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ خود ان لوگوں کو دانتوں کا رزق کر دیا جن کی انگشت درخورِ عقدِ گہر تھی میں نے کہا درست ہے۔ تو فرمایا جب تک سیاقِ بیان سے مطلب نکل آئے شاعر پر اعتراض کرنا نہیں چاہیئے کہ وہ بڑی جگر کاوی سے لکھتا ہے اور بے خیالی سے کون غلطی نہیں کرتا اور کس نے غلطی نہیں کی بے عیب ذات صرف اللہ کی ہے۔ آہ اے خاکِ گلاؤٹھی کیسے پتھر پڑ گئے کہ اب تجھ سے پہلے کے ایسے باکمال لوگ پیدا نہیں ہوتے۔ میں اسی باپ کا کم مایہ بیٹا ہوں اور میرا بیٹا مجھ سے بہت زیادہ نااہل ہے۔

کافی ہے نشانی تری چھلّے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

بوقتِ سفر چھلّا نشانی دینے کی رسم پہلے عام تھی مگر اب بہت کم ہے اس کا مقصد یہ تھا کہ جب ہاتھ پر نگاہ پڑے جب ہی نشانی والے کی یاد آ جائے۔ کہتے ہیں کہ تو نے جو بوقتِ سفر سادہ ادائی سے مجھے خالی انگلی بتا دی کہ دیکھو میرے پاس چھلا ہی نہیں جو نشانی دوں بس یہی نشانی میرے لئے کافی ہے کہ یہ خلوص مجھے کبھی نہ بھولے گا یا یہ سادہ ادائی ہمیشہ یاد آئے گی۔ یا یہ کہ تو چھلا دینے کی جگہ شوخی سے مجھے انگوٹھا بتا گیا کہ یہ لو چھلّا بس یہی نشانی کافی ہے کہ یہ کمالِ شوخی کا انداز

میری آنکھوں کے سامنے پھرتا رہے گا۔

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مِرے شعر پہ انگشت

"شعر یا حرف پر انگلی رکھنا" عیب گیری کرنا۔ "سخن گرم" "مضامینِ پرسوز" گرم چیز پہ ہاتھ نہیں رکھا جاتا۔ کہتے ہیں کہ میں سوزِ دل کے یا سوزِ دل سے اس لئے گرما گرم مضامین نکال کر لکھتا ہوں یا میں دل کو جلا کر اس لئے مضامینِ گرم نکالتا ہوں کہ کسی کو میرے شعر پہ انگلی رکھنے کی جرأت نہ ہو۔

(داغؔ) بھاگنے کی راہ ڈھونڈیں عیب جو
اپنے اپنے کان پکڑیں حرف گیر

(۵۰)

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اِک روز مرنا ہے حضرت سلامت

حضرت سلامت پرانا طرزِ کلام ہے جو یوں بھی استعمال ہوتا تھا اور ان کے زمانے تک بڑوں کو چھوٹے یا شرفا کو دوسرے لوگ السلام علیکم کے عوض حضرت سلامت سے خطاب کرتے تھے یہ لفظ اشارۂ طنز بھی ہے غالب نے مرنے کے ساتھ اشارۂ طنز کرتے ہوئے جو حضرت سلامت لکھا بہ خوبیٔ بیان ہے۔ کہتے ہیں جب ہر ایک کو مرنا ہی ہے تو پھر اگر کوئی حشر تک بھی زندہ رہا تو اس سے حاصل کیا۔

جگر کو مرے عشقِ خوں نابہ مشرب
لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت

عشق میرے خونِ جگر کا پروردہ ہے اور جگر اس کا خداوندانِ نعمت۔ یا

عشقِ خوں آشام کی میرے میخانۂ جگر پر نظر ہے اس لئے وہ اسے خداوندِ نعمت سلامت کے القاب خط کے عنوان پر لکھتا ہے۔

علی الرغم دشمن شہیدِ وفا ہوں
مبارک مبارک سلامت سلامت

لفظ "رغم" کے معنی ہیں مٹی میں ناک رگڑنا "علی الرغم" کا استعمال عربی فارسی اور اردو میں ایسے مقام پر کیا جاتا ہے جہاں یہ کہنا مقصود ہو کہ فلاں ناکام ہو گیا مخالف کی کچھ نہ چلی اور وہ ذلیل ہو کر رہ گیا۔ کہتے ہیں ہمیں دشمن کے علی الرغم شہیدِ وفا ہونے کا فخر حاصل ہو گیا۔ اب مبارک اس لئے کہ اس کی مخالفت کے باوجود کامیاب ہوئے اور سلامت اس لئے کہ شہید ہو کر زندۂ جاوید ہو گئے۔ مگر "مبارک سلامت" ایک محاورہ بھی ہے جو مبارکباد کے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ کہا کرتے ہیں کہ فلاں خوشی پر فلاں کے گھر مبارک سلامت کا غل مچا ہوا ہے۔

نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

اگر موجودات کی صورتِ ظاہری سے ماہیت اشیا کو جاننے کی قابلیت نہ ہو یا مخلوق سے خالق کو نہ پہچان سکے تو پھر یہ عالمِ بے نسبی تکنا مبارک ہو یا یہ کہ نیرنگِ صورت کا تماشا ہی سلامت رہے کہ یہ بھی عارضی دلبستگی کے لئے کچھ کم نہیں۔

(۵۱)

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ
یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت

(75)

آنکھیں بند ہونا کنایہ ہے موت سے

(ناطق) نہ مر جینے پہ اتنا موت کے دن آ گئے ناطق
ارے بے ہوش آنکھیں کھول آنکھیں بند ہوتی ہیں

مرض الموت کی غفلت میں ایسے وقت احباب اسے میری بالیں پر لائے کہ آنکھیں کھولتے ہی کھولتے بند ہو گئیں یعنی میں مر گیا۔ مُند جانا بمعنی بند ہو جانا اب قطعی متروک ہے۔

(۵۲)

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
دودِ شمع کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

"بازار سرد ہونا" بے قدری ہونا ہوا اُکھڑ جانا۔ آمدِ خط کو نمودِ سبزۂ رخسار کہتے ہیں۔ آمدِ خط سے جو حسن کے بازار میں اُس کی بات جاتی رہی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خطِ رخسار جس کی شکل دودی ہوتی ہے شاید حسن کی شمع کشتہ کا دھواں تھا جس سے معلوم ہو گیا کہ اب وہ شمع روشن گل ہو گئی ریش برآمد باجی شد۔

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

(داغ) نہ جلتا طور کیونکر کس طرح موسیٰ نہ غش کھاتے
کہاں یہ تاب و طاقت جلوہ دیکھے مردمک تیرا

یہ اپنے دلِ ناعاقبت اندیش کو صلاح دے رہے ہیں کہ جلوۂ دیدارِ دوست کی کوئی تاب نہیں لا سکتا اس لئے اس معاملے میں ضبطِ شوق ہی کرنا بہتر ہے۔

خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجئے
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

"نقشِ قدم" کو محوِ حیرت باندھتے ہیں جو حیرت ہی حیرت میں یہ عالم افتادگی فنا ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں ملاحظہ فرمایئے میری حیرت نے بھی کس قدر خانہ ویرانی پر کمر باندھی ہے کہ مجھے نقشِ قدم کی طرح رفتارِ یار پر کھوئے دیتی ہے۔

عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست

میں دوست کا بیمارِ الفت تھا لیکن کشتۂ دشمن ہو گیا کہ اس کی کامیابی کی بیدادِ رشک سے عشق میں جانبر نہ ہو سکا یعنی میں جو بیماریِ غمِ الفت میں کسی طرح زندہ تھا آخر رشکِ غیر کی تاب نہ لا سکا اور گھبرا کر جان دیدی۔ حاصل یہ کہ دوست کا دشمن کی طرف التفات مجھ بیمارِ غم کے لئے ایسا بڑا حادثہ تھا کہ جس سے جانبر نہ ہو سکا۔

چشمِ ما روشن کہ اس بیدرد کا دل شاد ہے
دیدۂ پُر خوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

ہماری آنکھوں میں اشکِ خونی دیکھ کر اس بیدرد کو سرور ہوتا ہے تو چشمِ ما روشن دلِ ما شاد کہ دوست کے لئے یہ دیدۂ پرخوں ساغرِ سرشار بنا ہوا ہے۔

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اس کے ہجر میں
(قطعہ) بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست

اس کے ہجر میں میری یہ حالت ہو گئی ہے کہ غیر کو بھی تمسخر کرنے یا بنانے کا موقع ہاتھ آ گیا اور اب وہ ایک بے تکلف دوست کی طرح مجھ سے غمخواری کی باتیں کرتا ہے۔

تا کہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

وہ مجھے دوست کی طرف سے یہ پیغام دیتا ہے کہ ہم تجھے دیدار دکھائیں گے اور اس کہنے کا مقصد ہوتا ہے کہ میں سمجھوں اس کی رسائی وہاں تک ہے اور میرا جی جلے۔

جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ
سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبربارِ دوست

سر کرتا ہے شروع کرنا۔ جب میں اپنے ضعفِ دماغ کا شکوہ کرتا ہوں تو وہ دوست کی زلفِ عنبر بار کا ذکر نکالتا ہے یعنی جب میرا خیال کچھ اپنی حالت کی طرف رجوع ہوتا ہے تو وہ پھر زلفِ پریشانِ یار کی یاد دلا کر پریشانی کی صورت پیدا کر دیتا ہے۔

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست

تاکہ میں اور بھی بیقرار ہو جاؤں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگوں۔

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے
یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

اب میں دشمن کی ان دل آزار مہربانیوں کی شکایت کروں یا دوست سے جو پہنچ رہے ہیں ان کی لذت کا بیان کروں یعنی دشمن کی یہ مہربانیاں بھی سب دوست کی بدولت ہیں کہ نہ وہ بے اعتنائی کر کے مجھے دیوانہ بناتا نہ دشمن کو ایسے پتھر برسانے کا موقع ہاتھ آتا۔

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں غالبؔ زبس تکرارِ دوست

ردیف اس کو کہتے ہیں جو ہر شعر کے آخر میں آئے یعنی جس کی اشعار میں تکرار ہو اس زمینِ شعر یعنی غزل میں چونکہ ردیف دوست ہے اس لئے مجھے اپنی یہ غزل بہت مرغوب ہے کہ ہر شعر میں دوست دوست کی تکرار ہے۔

(داغ) ہاں ناصحِ شفیق رہے کچھ تو چھیڑ چھاڑ
ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

۵۳

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

آج باغ میں عیش و نشاط و آزادی کا یہ عالم ہے کہ قمری کا طوق بھی حلقۂ بیرونِ در بنا ہوا ہے۔ یہاں مصنف نے اس خط کو جو قمری کی گردن میں ہوتا ہے طوق سے تعبیر کیا اور طوق کا گلے میں ہونا علامتِ گرفتاری ہے۔ ان کا مطلب اس مضمون آفرینی سے یہ ہے کہ قمری کا طوق بھی جو محض طوقِ گرفتاری سے مماثل ہے آج باغ سے باہر نکلا ہوا ہے اور ہر طرح صورت آزادی قائم ہے۔ یا یہ کہ باغ میں عروسانِ چمن کی خلوت کا ایسا انتظام ہے کہ قمری کا طوق بھی حلقۂ بیرونِ در بنا ہوا ہے یعنی وہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

آج تارِ نفس اثر کو شکار کرنے کی ایک کمند ہوا ہے کہ میرے ہر سانس کے ساتھ جو کمندِ فغاں ہے دل کا ایک ٹکڑا کھینچ کر نکل آتا ہے یعنی میرے فغاں میں یہ تباہ کن اثر پیدا ہو گیا ہے کہ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نکلا جا رہا ہے۔

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل
سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

بی عافیت بچئے اور میاں انتظام بھاگئے کہ سیلابِ گریہ کوئی دم میں گھر کو لئے بیٹھتا ہے ایسا نہ ہو کہ آپ اس میں دب کر رہ جائیں۔

(مولانا آسی) خرابِ خانۂ دل اور سیلِ موجِ سرشک
تم اپنی یاد سے کہدو کہ اب یہاں نہ رہے

لو ہم مریضِ عشق کے تیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

"کیا علاج" کیا سزا۔ کوئی کہتا ہے کہ طبیب تو قسمت سے مسیحا نفس ملا ہے لیکن جب مریضِ عشق کا کوئی تیمار دار ہی نہیں یعنی اس کی دوا اور پرہیز کا انتظام نہیں ہو سکتا تو اسے خاک شفا ہوگی یہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ اچھا یہ زحمت ہم برداشت کرتے ہیں لیکن اگر اس پر بھی اچھا نہ ہو تو پھر مسیحا نفس صاحب کو کیا سزا دی جائے۔ یہاں لفظِ مسیحا سے مراد خود حضرت مسیح علیہ السلام نہیں کیونکہ ان کے علاج کے لئے تیمار دار درکار نہیں تھا۔ لفظِ "مسیحا کے ساتھ حرفِ ندا" ملانے سے بنا ہے ہمارے شعرا نے بہت کثرت کے ساتھ استعمال کیا ہے جیسا کہ ؎

خبر لے اے مسیحا تو کہاں ہے　　ترا بیمارِ بسمل نیم جاں ہے

میرے نزدیک نہ بلا ضرورت ندا لفظِ "مسیحا" کا استعمال جائز ہے اور نہ بہ ضرورت ندا مسیحا کے ساتھ "اے" کا استعمال۔ لفظ "مسیحا" کا استعمال اب شعرا چھوڑ رہے ہیں لیکن اس میں یہ زیادتی ہو رہی ہے کہ بوقتِ ندا بھی وہ مسیحا کا استعمال کرنا نہیں چاہتے جو صرف کم علمی کی دلیل ہے۔ یہی حالت ساقیا کی بھی ہے۔

(۵۴)

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

زمین کی ضرورت سے بعض وقت شاعر کو قصداً بھی بھٹک جانا پڑتا ہے یہاں دونوں مصرعوں میں جو ردیف کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی یہی حالت ہے کہ اردو میں نہ سانس لینے کے لئے۔ سانس کھینچنا آتا ہے اور نہ انتظار کرنے کے لئے انتظار کھینچنا۔ یہاں شاعر نے فارسی محاورے کا ترجمہ کر دیا ہے جو غالب کے لئے نئی بات

نہیں۔ شراب و ساغر کا جو یہاں ذکر ہے وہ محض حسن بیان کے واسطے ہے۔ ورنہ نہ شراب سے مراد پینے والی شراب ہے اور نہ ساغر سے مراد پینے کا پیالہ۔

شاعر یہاں صرف حسنِ آرزو کی کیفیت کا بیان کر رہا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ بہرحال آرزو مند رہ کہ یہ حاصلِ زندگی ہے۔ "اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ" کے الفاظ سمجھنے والے کو دھوکہ دیتے ہیں۔ شاعر کی مراد شراب سے شراب آرزو ہے کہ آرزو میں بھی ایک قسم کا نشہ ہوتا ہے۔ تو یہ کہہ رہا ہے کہ اگر بحالتِ موجودہ تجھے شرابِ آرزو حاصل نہیں یعنی کسی شے کی آرزو نہیں جس سے بلند معیار میں مراد ہوتی ہے۔ آرزوِ معشوقِ حقیقی سے تو شاعر کہتا ہے ایسی حالت میں انتظارِ ساغر کر یعنی آرزو کا آرزو مند ہو کر رہ۔

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ
برنگِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ

توالی اضافت کو جو یہاں پہلے مصرع میں ہیں متاخرین نے ترک کر دیا ہے کہ اس سے بیان میں فارسیت آجاتی ہے اور جب معنوی اضافتیں ہوں تو اس کا اردو ترجمہ بھی کچھ بُرا ہی سا ہو جاتا ہے۔ لیکن حسنِ بیان کی ضرورت کے لئے حضرتِ استاد کے فیصلے کے خلاف میں اسے جائز سمجھتا ہوں اور کبھی لکھ بھی لیتا ہوں۔

یہاں پہلے مصرع کا بیان یہ ہے کہ سعیِ تلاشِ دید کی گرمیِ رفتار کی حالت ناقابلِ بیان ہے کہ اُس کی بدولت میرے پائے نگاہ مجروح ہو کر رہ گئے۔ اور اب مجھے اس بات کی ضرورت ہے کہ میرے آئینہ خیال سے جوہرِ فکر جس نے مجھے تلاشِ دید کی سعی پر مجبور کر رکھا ہے۔ اس طرح نکال کر پھینک دیا جائے جس طرح کانٹے کو نکال کر پھینک دیتے ہیں۔

تجھے بہانہ راحت ہے انتظار اے دل
کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

مندرجہ بالا شعر بہرحال غالب کے معیار کا نہیں۔ یہ حضرت کبھی کبھی ایسے شعر بھی لکھ جاتے ہیں جو غالب تو کیا کسی بھی استاد کے شایانِ شان نہیں۔ یہاں بستر

(73) کے قافیہ کو نبھانے کے لئے انھوں نے یہ شعر لکھ دیا جس میں نہ کوئی حسنِ خیال ہے اور نہ حسنِ بیان۔

کہہ رہے ہیں کہ اے دل تو نے تو انتظارِ یار کو بہانۂ راحت بنا لیا ہے کہ بستر پر دراز ہو کر رہ گیا۔ یہ شانِ انتظار نہیں۔ انتظارِ یار کے لئے تو بیتابی کی ضرورت ہے۔ جس میں راحت کہاں۔ اس میں تو یہ چاہئے تھا کہ بیتابی کے ساتھ اندر آتے، باہر جاتے، گلی کو دیکھتے، دروازے پر بیٹھتے جیسا کہ خود انھوں نے دوسری جگہ لکھا ہے کہ ؎

وعدہ آنے کا وفا کیجئے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے در کی دربانی مجھے

کہتے ہیں کہ یہ تو شایانِ انتظار نہیں کہ بستر پر دراز رہے۔ ایسی صلاح تجھے کس نے دی۔

تری طرف ہے بحسرت نظارۂ نرگس
بہ کوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

اس شعر کے بیان میں چونکہ غالب نے نرگس سے استعارہ کیا ہے اس لئے اربابِ فہم بھٹک گئے ہیں۔ دراصل غالب کا مطلب نرگس لکھنے سے بیانِ نرگس نہیں۔ نہ اسے رقیب بنانا چاہتے ہیں۔ خود غالب نے لکھا ہے کہ ؎

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف برطرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

آخر کس کا نصیب ایسا ہے کہ نرگس اس کی رقیب ہو جائے۔ یہاں بیانِ شعر یہ ہے کہ شاعر اپنے محبوب کے ساتھ مے نوشی میں مشغول ہے اور رقیب جس کا معشوق کو ڈر ہونا چاہئے حسرت سے دیکھ رہا ہے۔ اور معشوق جھجکتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ رقیب کور دل اور کور چشم کا تیری طرف بحسرت دیکھنا نظارۂ نرگس سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ اس لئے اب تو اس کی کور دلی اور کور چشمی ہی کے نام پر شراب پی۔ مے نوشی کا جام بیشتر کسی نام پر بھی پیا جاتا ہے۔ جیسے جامِ صحت بھی کہتے ہیں۔

بہ نیم غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز
نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

غالب کا یہ شعر بھی نہ صرف یہ کہ کچھ یوں ہی سا ہے بلکہ اس میں کافی تکلفات بھی ہیں۔ بہرحال مطلب یہ کہ معشوق کا خنجرِ ناز جو جگر میں پیوست ہو کر رہ گیا تھا اسے انھوں نے بطور امانت رکھ چھوڑا اور زخمِ جگر اس کا میان بن گیا۔ خنجر آزما کو تو اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اسے میان سے نکالے ہی۔ اب معشوق کا ارادہ اسے نکالنے کا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ نکالتے ہو تو اس کا حقِ ودیعت بھی دو جو یہ ہے کہ نیم غمزہ کی ادا سے اسے باہر کھینچ۔ غالب کے اصطلاح میں "تیر نیمکش" اور "نیم غمزہ" کمال جور ہے جس کے یہ معشوق سے متمنی ہیں۔ انھوں نے دوسری جگہ اس مضمون کو ذرا واضح طور پر لکھا ہے جو اچھا معلوم ہوتا ہے ؎

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

غالب کی عادت ہے کہ وہ ایک ہی خیال کو ادل بدل کر مختلف انداز میں لکھتے ہیں اور اس میں تنوع پیدا کر دیتے ہیں۔

مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں
بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

یہاں قدح سے مراد قدحِ دل لیجئے تو بھی چلے گا اور یہی پیالہ بھی لیجئے جس میں شراب پیتے ہیں تو بھی غلط نہ ہوگا۔ شراب پینے کے لوازمات ہوتے ہیں اور شراب کے ساتھ مرغوب لازمہ کباب ہوتا ہے۔ کسی شرابی کی برائی کرنے کے لئے بھی "شرابی کبابی" کہتے ہیں۔ تو جب شراب کے ساتھ لازمۂ شراب کا بھی سوال پیدا ہوا تو یہ کہتے ہیں کہ جب میرے قدح میں آتشِ پنہاں کی شراب ہے یعنی آتشِ عشق ہے جس کے متعلق سب سے زیادہ گرم ہونے کا مفہوم شامل ہے تو اس کی مناسبت سے کباب سمندر کے دل کے ہونے چاہئیں کہ دل مقامِ عشق ہوتا ہے جس کے متعلق سوز کا مفہوم سب سے زیادہ ہے اور سمندر آگ والے

کیڑے کا دل جس میں کریلے اور نیم چڑھے کی شان پیدا ہو جائے گی۔ اس شعر کا معیار بھی کچھ بلند نہیں۔

غزل تمام ہوئی جو پوری کی پوری یا تو الجھی ہوئی ہے یا معیار میں پست ہے۔ مقطع موجود نہیں جس سے معلوم ہوتا کہ مصنف نے کب لکھی۔ غالب نے خود لکھا ہے کہ عرصے تک شاعری میں خبط الہواسی کرتے رہے اور پھر جو ہوش آیا تو خود ہی سب کو ختم بھی کر دیا۔ یہ غزل اس وقت کی معلوم ہوتی ہے جب مصنف میں پرانے اثرات باقی ہوں گے۔ ردیف بیشتر اس طرح استعمال کی ہے کہ اردو کا بیان نہیں۔ مگر غالب ہیں۔ انھیں لائسنس بھی ہے اور خود کہا بھی ہے کہ ؎

"بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است"

۵۵

حسن غمزہ کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

بتان مہوش و جفا جو کو میری جان لینے کے لئے غمزوں کی تکلیف کرنا پڑتا تھا چلو میرا مرجانا اچھا ہوا کہ حسن کو غمزہ کی کشاکش سے نجات مل گئی لفظ "بارے" کا اس طرح استعمال اب نہیں کیا جاتا۔

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

چونکہ شیفتگی کے اعلیٰ منصب کو سنبھالنے کی میرے بعد کسی میں قابلیت نہیں رہی اس لئے انداز و ادا کو جو اس دفتر کے کارکن تھے معزول کر دیا گیا یعنی جب محکمے کا سنبھالنے والا کوئی نہیں رہا تو اس میں کارکنوں کی ضرورت باقی نہیں بچی۔

شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو صرف اس میں سے دھواں اُٹھ کر اظہارِ ماتم کرتا ہے لیکن میں عشق کی وہ شمعِ روشن تھا کہ میرے سوگ میں شعلۂ عشق سیہ پوش ہو گیا یعنی میری موت سے دیارِ عشق میں اندھیرا پڑ گیا۔

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

بتانِ مہوش کے ناخن جو میرے جیتے جی مرے خونِ جگر سے لال بھبوکا رہتے تھے وہ اب ہمیشہ کے لئے مہندی کے محتاج ہو گئے ان کی اس دست نگری پر میرا دل خاک میں خون ہوا جاتا ہے۔

درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا
نگہِ ناز ہے سرمہ سے خفا میرے بعد

میرے بعد جوہر بیداد کو معرض وجود میں لانے کا کوئی موقع باقی نہیں رہا اس لئے نگاہِ ناز اب سرمہ سے خفا ہے یعنی اسے پاس نہیں آنے دیتی کہ جب کوئی سینہ سپر ہونے والا ہی نہیں یا جب حملہ کرنے کے قابل ہی نہیں تو ہتھیار کس کے لئے باندھے۔ ہر اد یہاں مصنف نے لفظ "عرض" جوہر کی مناسبت سے لکھا لیکن مقصد رائے مفتوح سے نہیں بالجزم سے ہے کیونکہ ان معانی کے لئے مجزوم ہی کی ضرورت تھی اس لئے یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ لفظ "عرض" کا استعمال غلط کیا گیا۔ لفظ "عرض" بالفتح کے لئے ایسے مضمون کی ضرورت ہے۔

خود جلوہ گاہِ ذات ہے جلوہ رسول کا
ہے جو ہرِ عرض میں بیاں عرض و طول کا

یہاں اگر عرض اول بجزم ہو تو مطلب خبط ہو جاتا ہے۔

ہے جنوں اہلِ جنوں کیلئے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

چاکِ گریباں گویا میرے بعد ایک آغوشِ وداع ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنون اہلِ جنوں سے رخصت طلب ہے یعنی میرے مرنے پر چاکِ گریباں کا خاتمہ ہو گیا کہ اب کوئی شغل جنوں کرنے والا باقی نہیں رہا اس لئے میرا گریبانِ چاک گویا جنون ہے جو اہلِ جنوں سے مل کر رخصت ہونے کے لئے آغوشِ وداع کشادہ کئے ہوئے کہ اس کے بعد کسی گریبان کو چاک سے موانسیت نہ ہوگی یعنی گریبان ہمیشہ کے لئے چاک سے جدا ہو رہا ہے۔

کون ہوتا ہے حریفِ مے مردافگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

سبحان اللہ۔ صلا ندائے طلب ہے جیسے کہ "ہَلْ مِنْ یَشْرِب" یا "ہَلْ مِنْ مُبارِزٍ" کہتے ہیں میرے بعد لبِ ساقی پر یہ صلا مکرر ہے کہ "کون ہوتا ہے حریفِ مے مردافگنِ عشق" اور تکرار صلا سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ کوئی مردِ میدان بن کر سامنے آنے کی ہمت نہیں کرتا۔ یا یہ کہ میرے بعد ساقی بار بار پکارتا ہے "ہل من یشرب" لیکن ایسی جہاں میں کس کو ہمت ہے کہ عشق کی مے مردافگن کا حریف بننے کی جرأت کرے۔ غالب کا یہ شعر اہلِ علم و اربابِ ذوق میں بے حد مقبول ہے اور حقیقت میں ہے بھی ایسا ہی اس میں "جدتِ بیان" "معانی" "الفاظ اور "بے ساختگی" ہر بات قابلِ داد ہے۔ اردو شاعری بجا طور پر اس شعر پہ ناز کر سکتی ہے۔ اس شعر کا اندازِ بیان بہ تکرار بیان یوں ہے کہ پہلی مرتبہ ساقی بطور ندا پکار کر کہتا ہے کہ ع "کون ہوتا ہے حریفِ مے مردافگن عشق" اور جب کہیں سے اس کا جواب نہیں پاتا تو پھر بعالمِ مایوسی اسی کو دہراتا ہے جس کا بیانِ استفہام انکاری ہو گیا۔

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

محبت اور وفا یہ دونوں میری رفیق اور شریکِ زندگی ہیں اور میں جب مروں گا تو یہی دونوں میرے غم میں سوگوار بھی ہوں گے اس لئے میں مرنے سے پہلے اس غم سے مرا جاتا ہوں کہ دنیا میں کوئی اتنا بھی نہیں کہ میرے بعد مہر و وفا کے تعزیت کرے یعنی ان کی دلجوئی کے واسطے آکر بیٹھ سکے۔ یعنی کسی کو دنیا میں وفا اور اہلِ وفا کے ساتھ اتنا بھی ربط نہیں کہ ان کی مصیبت کے وقت دو حرف ہمدردی اور تسلی کے بھی کہے۔

آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

یہ مر رہے ہیں اپنی تو کچھ فکر نہیں کہ دنیا میں رہ کر سب کچھ دیکھ لیا اور بہت کچھ کر لیا لیکن رونا آتا ہے تو عشق کی بیکسی پر کہ وہ بے چارہ ان کے بعد سیلابِ بلا کو جو اس کا ساز و سامان ہے کہاں لے کر بیٹھے گا اور کس کے گھر جائے گا کہ اس کا کہیں اور تو ٹھکانا ہی نہیں یعنی میرے بعد عشق کا کوئی پرسانِ حال نظر نہیں آتا۔

(مومنؔ) تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

(۵۶)

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

مکانِ یار کے در و دیوار یعنی بند دروازے اور کھڑی دیواریں اگر مانعِ دیدار

ہیں تو بلا سے ان سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں اس طرح تو ہمارا شوقِ دیدار اور بڑھتا ہے یعنی موانع ظاہر سے نگاہِ شوق کو پَر لگ جاتے ہیں۔

وفورِ گریہ نے کاشانے کا کیا یہ حال
کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

یہاں لف و نشر مرتب ہے کہ دیوار در پر جاتی ہے اور در دیوار پر۔ کہتے ہیں سیلابِ گریہ سے میرے گھر کی دیواریں ٹوٹ کر دروازوں پر جا پڑیں جس سے دروازے بند ہو کر دیواریں بن گئے اور دیواروں کی کھلی جگہیں جو رہ گئیں وہ دروازے ہو گئے۔

نہیں ہے سایہ کہ سُن کر نویدِ مقدمِ یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

دیوار و در کا جو سایہ ان سے آگے بڑھا ہوا نظر آتا ہے وہ درحقیقت سایہ نہیں بلکہ معشوق کی آمد کی خوشخبری سُن کر در و دیوار پیشوائی کے لئے چند قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔ یہاں جو مصنف نے لفظ "کہ" استعمال کیا ہے ایسے مواقع پر اب "بلکہ" بولا جاتا ہے۔

ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مے جلوہ
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار

تو نے یہاں مے دیدار کو کس قدر سستا کر دیا ہے کہ تیرے کوچے کا ہر در و دیوار مست نظر آتا ہے یعنی جلوہ نمائی میں تو نے ایسی افراط سے کام لیا ہے کہ اب تیرے کوچے میں اہل و نااہل کی بھی تمیز باقی نہیں رہی ظاہر ہے کہ در و دیوار میں اہلیتِ دید نہیں۔ یا یہ کہ جہاں تو ہے وہاں ہر ایک کو فیض یابِ جلوہ ہونے کا موقع حاصل ہے۔ یا یہ کہ تیری شرابِ جلوہ انسان تو کیا جمادات کو بھی مست رکھتی ہے۔

جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ
کہ ہیں دُکانِ متاعِ نظر در و دیوار

منتظرانِ دید کی نگاہیں جو ان پر جم کر رہ گئی ہیں انھوں نے تیرے در و دیوار کو متاعِ نظر کی دُکان بنا دیا ہے اس لئے اگر تجھے سودائے انتظار کی خریداری منظور ہے یعنی تو اس کا قدر داں ہے تو باہر آ۔ یا یہ کہ معشوق کے در و دیوار متاعِ نظر کی دوکان ہیں کہ منتظرانِ دید کی نگاہوں کا یہاں انبار ہے اگر تجھے بھی یہ سودائے انتظار مول لینا ہے تو آ اور شامل ہو جا۔

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے
کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے گریۂ طوفان بار کا سامان کیا ہو اور در و دیوار میرے پاؤں پر نہ گر پڑے ہوں یعنی ہمیشہ ایسے وقت پر میرے قدموں پر سر رکھ رکھ دیا ہے کہ جانے دیجئے ہماری طرف دیکھئے۔ یا کسی چیز کا اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں پر گرانا خود کو مصیبت میں مبتلا کرنا یعنی ایسا کب ہوا ہے کہ میں نے ہجومِ گریہ کا سامان کیا ہو اور اس سے خود میری خانماں بربادی نہ ہوئی ہو۔

وہ آ رہا مرے ہم سایہ میں۔ تو سائے سے
ہوئے فدا در و دیوار پر۔ در و دیوار

معشوق کے سائے نے ہم سایہ کے در و دیوار کو ایسا صبیح کر دیا کہ میرے در و دیوار در و دیوار پر فدا ہو گئے۔

نظر میں کھٹکے ہے بِن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

جب تو گھر میں نہیں ہوتا تو گھر کی آبادی کا سارا سامان ہماری نگاہ میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے چنانچہ دمِ نظر در و دیوار کے لکڑی پتھر تنکے کنکر کی طرح چُبھ کر

بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری کر دیتے ہیں۔

نہ پوچھ بے خودیِ عیش۔ مقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے۔ سربسر در و دیوار

آمدِ سیلاب سے جو گھر کے ٹکڑے پتھر گر کر الٹ پلٹ ہو رہے ہیں اس حالت کو شاعر جو اپنی خانہ بربادی سے خوش ہے بیخودیٔ عیش سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ در و دیوار پڑے ناچ رہے ہیں یعنی آمدِ سیلاب کی خوشی سے ان کے گھر میں کھروا ہو رہا ہے۔

نہ کہہ کسی سے کہ غالبؔ نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

فارسی مثل ہے کہ "دیوار ہم گوش دارد" یہاں انحصار سے تشدد بیان مقصود ہے۔ جس طرح کہیں کہ دل ہی تو آدمی کا دشمن ہے۔ دیوار سے صوتِ رجعی پیدا ہوتی ہے۔ کہتے ہیں در و دیوار کے سامنے بھی انھیں بے زبان سمجھ کر رازِ دل کا اظہار نہ کر۔

(۵۷)

گھر جب بنا لیا ترے در پہ کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

جب بے کہے یعنی بغیر تری اجازت کے میں تیرے در پر گھر بنا چکا ہوں یعنی ڈھئی دیئے بیٹھا ہوں تو کیا اب بھی بے جتلائے بتلائے تجھے میرا گھر معلوم نہ رہے گا یعنی اب تو جو تیرا گھر ہے وہی میرا گھر ہے اس میں کچھ کہنے سننے کی بات نہیں رہی۔ اس شعر میں پہلی ردیف کچھ غیر ضروری سی معلوم ہوتی ہے۔

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سُخن
سمجھوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

جب یہاں طاقتِ سخن طاق ہو گئی تو انھیں تغافل کے لیے بہانہ مل گیا اس لئے اب یہ کہہ کر بات بنا لیتے ہیں کہ میں کسی کے دل کی بات بغیر کہے کیونکر سمجھوں۔

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

بدقسمتی دیکھیے کہ ہمیں ایسے سفاک جفا جو سے پالا پڑا ہے جس کے ظلم کا سارا جہان شاکی ہے اور جب کوئی اس کا نام لیتا ہے تو ستمگر کہہ کر۔ لفظ "لیوے" اب کہیں فصحا کی زبان پر نہیں۔

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

ہم کبھی لگی لپٹی رکھنا گوارا نہیں کرتے جو بات جی میں آ جائے اسے کہہ دیتے ہیں پس و پیش نہیں ہوتا چاہے کوئی بات کہہ کر ہماری جان ہی کیوں نہ چلی جائے اس لئے اگر ہم چپ ہیں یا کوئی چبھتی ہوئی بات نہیں کہتے تو یہ نہ سمجھو کہ کسی سے ڈر گئے بلکہ ہمارے دل ہی میں کچھ نہیں ہے۔ یہاں "ہے ہمارے" میں تنافر ہے جسے عیب سمجھا جاتا ہے مگر اس سے بچنا بھی مشکل ہے۔ "وگرنہ" متروک ہے اب اس کی جگہ ورنہ بولتے ہیں۔

چھوڑوں گا میں نہ اس بتِ کافر کو پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

میں تو اس بتِ کافر کی پرستش کبھی نہ چھوڑوں گا چاہے مجھے دنیا کافر ہی بنا کر کیوں نہ چھوڑے یعنی اہلِ عالم مجھ پر کفر ہی کا حکم کیوں نہ لگا دیں۔ "کافر کہے بغیر نہ چھوڑے" ایک بہت فصیح محاورہ ہے۔ لفظ کافر عربی ہے اور بکسر فا

تکرار دو میں بہ فتح بھی جائز ہے۔

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہماری گفتگو میں دشنہ و خنجر سے مراد ناز و غمزہ ہے لیکن چونکہ ناز و غمزہ کہہ دینے سے زورِ کلام نہیں پیدا ہوتا یعنی ان سادہ الفاظ کے استعمال سے غمزہ و نازِ بے شوق کے تباہ کن اثرات واضح نہیں ہوتے اس لئے بسولہ اور خنجر کہنا پڑتا ہے۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مشاہدۂ حق کی گفتگو میں بھی ساغر و بادہ کا ذکر خیر کئے بغیر کام نہیں چلتا کیونکہ محسوسات میں شراب ہی ایک ایسی چیز ہے جسے پُر کیف اور پُر سرور کہا جا سکے اس لئے کیفیت و سرورِ جلوۂ دیدارِ حق کی اگر کوئی تشبیہ ہو سکتی ہے تو یہی اور اگر اس کا کچھ بیان ہو سکتا ہے تو اسی سے۔ اس کے ساتھ ملاحظہ کیجیے جو میں نے غالب کے مندرجہ ذیل شعر کی شرح میں لکھا ہے۔

(غالب) ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

جس طرح ہندوستانی عورتیں اپنی ساتھ والیوں کو بے تکلف نگوڑی کہہ دیتی ہیں یا اب ایسے موقع پر دہلی میں بے تکلف اندھی کہہ دیتی ہیں اسی طرح وہ اپنے خاوندوں کا نام بھی نہیں لیتیں یا تو کسی کے باپ یا بھائی کہہ کر پکارتی ہیں یا شوخی سے کوئی اپنی اصطلاح وضع کر لیتی ہیں اکثر یہی ہوتا ہے کہ "اجی او بہرے" کہہ کر خطاب کیا جاتا ہے۔ زنانِ بازاری بیشتر اپنے عاشقوں کو "بہرے جی"

کہہ کر ہی پکارتی ہیں سچ یہ ہے کہ عورتوں کی اصطلاحیں کچھ عجیب ہوتی ہیں کہ بُرے الفاظ بھی ان کی زبان پر آ کر اچھے ہو جاتے ہیں اور ان کا بُرا نہیں مانا جاتا سید انشاء نے یہی نگوڑی کا محاورہ لے کر اپنی طرف سے اس پر کچھ ایزاد کیا ہے اور اپنے ہمعصر شاعر میاں جرأت کے نام کا معمہ سرِ منڈی نگوڑی کجرا بنا دیا ہے۔ غالب نے اسی بہرے کی اصطلاح سے مضمون اختراع کیا اور ذرا سی بات کو بڑی بنا کر پیش کر دیا۔ یا یہ کہ معشوق کہتا ہے "یہ تو بہرا ہے" ہم بہرے سے کہاں تک سر پھوڑیں یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ ترکِ التفات کا سبب کیوں ہو اس طرح تو التفاتِ مزید کی ضرورت ہے۔

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

یہ حسنِ طلب ہے حضور سے مراد ہے ابوظفر بہادر شاہ بادشاہِ دہلی جن کے دربار کے یہ ملازم تھے یا وظیفہ خوار۔

(۵۸)

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

جلتا ہوں غصہ آتا ہے۔ جلنا حسد ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی دمِ نظارہ مجھے اپنی طاقت دیدار پر غصہ آتا ہے یا حسد ہوتا ہے کہ اس کی تابِ رخسار دیکھ کر دیکھتا کیوں رہ گیا مجھے آگ کیوں نہ لگ گئی۔ یا یہ کہ آگ لگے میری طاقتِ دیدار کو جس کی بدولت معشوق کا جلوۂ دیدار دیکھ کر میں جل نہ سکا اور اس طرح دنیا میں ننگِ اہلِ سوز ہو کر مجھے زندگی بسر کرنا پڑا۔

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

نالہ ہائے شرربار میں میری سرگرمی اور انہماک کو دیکھ کر جو میں اپنے فرض کے طور پر ادا کر رہا ہوں اور جس کی صورت آتش کدہ کو دھونکنے کی جیسی ہے لوگ مجھے آتش پرست کہتے ہیں۔

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں تجھ کو بے سبب آزار دیکھ کر

عشق سببِ جفا ہے اور اس میں عشاق کی آبرو ہے کہ جورِ معشوق عاشق سے خاص ہو۔ کہتے ہیں جب تم اہلِ عشق اور اہلِ ہوس بلکہ رہگیروں کو بھی ایک ہی لاٹھی ہانکتے ہو اور سب پر یکساں جفا کرتے ہو تو اب عشق کی کوئی آبرو اور اہلِ محبت کا کچھ امتیاز نہیں رہ گیا تمہارے اس انداز کو دیکھ کر میرا دل نہیں بڑھتا اور تم سے کوئی امید نہیں ہوتی کیونکہ اگر جورِ معشوق عاشق کے ساتھ خاص ہو تو یہ بھی ایک شانِ وفا ہے جب اتنا بھی نہیں تو اب تم سے کیا امید باقی رہی۔

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

گو معشوق بہ عالمِ جوش میرے ہی قتل کو آرہا ہے مگر پھر بھی جوشِ رشک دیکھئے مجھے یہ خیال مارے ڈالتا ہے کہ تلوار کو اس کے ہاتھ میں جگہ پانے کا امتیاز حاصل ہوا کیا یوں نہیں قتل کر سکتا تھا کہ میری گردن یا میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہوتا اور تیغ نگاہ کا وار کرتا یا ناز و غمزہ سے قتل کرتا۔ اس شعر کا طرزِ بیاں کچھ مستحسن نہیں کہ لفظ "رشک سے" بے محل سا واقع ہوا ہے۔

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

چونکہ خود تیرا مرتبہ تو باز پرس سے اعلیٰ و ارفع ہے اس لئے تیری رفتار کی قاتلِ عالم لغزشِ مستانہ کو دیکھ کر جو نتیجہ ہے بادہ نوشی کا اور جو سبب ہے

قتلِ عالم کا موجِ مے لرز رہی ہے کہ خونِ خلق گردنِ مینا پر ثابت ہو گیا اب خدا خیر ہی کرے اور کہیں وہ وقت نہ آجائے کہ بقولِ سعدی۔

بہ میخانہ در سنگ برون زدند — کدو را نشاندند و گردن زدند

واحسرتا کہ اس نے اٹھایا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

افسوس کرتے ہیں کہ معشوق کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہیں لذتِ آزار کا دلدادہ ہوں تو اس نے ظلم کرنا چھوڑ دیا۔

(داغ) دل کو مدت میں کیا تھا خوگرِ جور و ستم
کیا خبر تھی یک بہ یک وہ مہرباں ہو جائے گا

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ ہنر کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

اگر خریدارِ ہنر یعنی سامع کا معیارِ سخن اعلیٰ و ارفع ہو اور مذاق سلیم رکھتا ہو تو ہم بھی متاعِ سخن کے ساتھ خود بک جاتے ہیں یعنی سخن شناس کے گرویدہ اور غلامِ بے دام ہو جاتے ہیں۔ مرزا غالب کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ آپ ایک روز دہلی کے کسی کتب فروش کی دوکان پر بیٹھے ہوئے تھے اتفاق سے ایک ایرانی آیا اور اس نے کتب فروش سے دریافت کیا کہ دیوانِ غالب داری مگر کتب فروش کے پاس دیوان غالب موجود نہ تھا اس نے جواب دیا عرفی دارم نظیری دارم مگر ایرانی نے سن کر کہہ دیا کہ نہ نہ ایں ہمہ نمی خواہم دیوان غالب خواہم آں قرمساق خوب میگوید، چونکہ قرمساق کا لفظ بہت ہی بے ہودہ تھا اس لئے کتب فروش کو مذاق کی سوجھی اس نے مرزا غالب کی طرف اشارہ کر کے ایرانی سے کہا کہ "دیوان غالب نہ دارم غالب دارم" یہ سن کر ایرانی کچھ شرمندہ سا ہو گیا لیکن مرزا غالب نہایت تپاک کے ساتھ اٹھ کر ایرانی سے بغلگیر ہوئے اور کہا کہ عمر بھر میں آج ہی مجھے اپنے کلام کی سچی داد ملی ہے۔

زُنّار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

زُنّار کو بہ لحاظ ایک سیدھا دھاگہ ہونے کے راہ ہموار اور تسبیح کو بہ لحاظ دانوں کے اُتار چڑھاؤ راہِ ناہموار سے مشابہ کیا۔ یہاں یہ بات بتا دینا ضروری ہے کہ جس طرح کفر کو زنار سے تعلق ہے اس طرح اسلام کو تسبیح سے کوئی خاص ربط نہیں اصل میں یہ بھی زنار کی بہن مالا کی نقل ہے اسلام نے تو جو طرزِ شمار وضع کیا ہے وہ عقدِ انامل ہے جس میں دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر نہایت آسانی سے دس ہزار تک گنا جا سکتا ہے۔ اس شعر کی اگر شرح ہو سکتی ہے تو یوں کہ اگر نقلِ کفر ہی منظور ہے تو مالا کی بہ نسبت زنار زیادہ موزوں ہو گا کہ یہ ہموار تو ہے۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

کانٹے چبھیں گے تو آبلے پھوٹ جائیں گے اور بیتک کی جو تکلیف ہے مٹ جائیگی مثل مشہور ہے کہ "آنکھ پھوٹی پیر گئی" ان کے پاس پھوڑنے کا سامان کہاں تھا یہ تو اچھا ہوا کہ غیب سے انتظام ہو گیا"۔

کیا بدگماں ہیں مجھ سی کہ آئینہ میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

آئینہ فولاد کو اگر صاف نہ رکھا جائے تو اس میں زنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں میرے آئینہ میں زنگار کا سبب خیالِ یار کی محویت اور سامان آرائش سے بے توجہی ہے لیکن اس پر یار کی بدگمانی ملاحظہ فرمایئے کہ وہ اسے طوطی کا عکس سمجھ کر مجھے مصروف بالغیر ہونے کا الزام لگاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ تو اچھا طوطا پالا۔ یا آئینہ سے مراد آئینہ دل اور زنگار سے غم میرے آئینہ دل کو غم آلود دیکھ کر معشوق بدگمانی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ کو تو غم سے محبت ہو گئی یہ آپ نے نیا طوطا پالا۔

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

ہر میکش کو شراب اس کے ظرف یعنی طاقت برداشت کے مطابق دی جاتی ہے اس لئے برقِ تجلی کو ہم پر گرنا چاہیے تھا کہ ہمارا ظرف کس لائق تھا طور پر گری تو کیا ہوا وہ تو ایک ہی رگڑے میں پس کر سرمہ ہو گیا ؎

تابِ یک جلوہ نہ آورد نہ موسیٰ و نہ طور
ایں دلم ہست کزیں گونہ ہزاراں دیدست

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

حالات یا مواقع واقعات کی یاد تازہ کر دیا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ہمیں تیری دیوار کو دیکھ کر اس وقت کا سماں یاد آ گیا جب غالبِ شوریدہ حال نے بہ عالمِ پریشانی و بے تابی یہاں آ کر اپنا سر پھوڑا تھا۔

(۵۹)

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم جو ہو خارِ مغیلاں پر

شبنم کا قطرہ وہ بھی جو کانٹے کی نوک پر ہو۔ خیال کیجیے کہ کس قدر اقل و بے حقیقت شئے ہے اس کی ہستی بھی کوئی ہستی ہے کہ زمین تک گرنے کی بھی استعداد نہیں دم بھر رہے تو خود کانٹے کی زبانِ تشنہ اسے چاٹ جائے ہوا پر اڑے تو زمین پر پہونچنے بھی نہ پائے۔ لرزنا آفتاب کی حرارت سے جو شبنم میں حرکتِ اضطرابی پیدا ہوتی ہے اس کی مناسبت سے لائے۔ مہرِ درخشاں سے مراد ہے ذاتِ واجب۔ اللہ نور السمٰوات والارض۔ کہتے ہیں میرا دل مہرِ درخشاں

کی اس زحمت پر لرزتا ہے کہ وہ مجھ سے قطرۂ ناچیز کو فنا کرنے کی فکر میں ہو۔

(حافظ) یار دارد سرِ صید دلِ حافظ یاراں
شاہبازے بشکارِ مگسے می آید

میں مخفف مصرعہ کی ابتدا، میں بہت لکھا گیا ہے اور اب فصحا، اس سے اجتناب کرتے ہیں میں اسے پسند نہیں کرتا۔

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

مفارقتِ یوسف میں شدتِ گریہ کی بدولت دیدۂ یعقوب جو سفید ہو کر خانۂ چشم کے اندر خیالِ یوسف میں گھومتے تھے یعنی اب بھی ان کی نگاہیں یوسف کو تلاش کرتی تھیں اس سے شاعر نے مضمون اختراع کیا ہے کہ ان دیدہ ہائے سفید کا پھرنا دیوارِ زنداں پر حضرتِ یوسف کا سفیدی پھیرنا ہے جو ان کے ذوقِ خانہ آرائی سے پیدا ہوا۔ ایک تکلف ہے اور کچھ نہیں۔

فنا تعلیم درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

قاعدہ ہے کہ بچے مدرسہ کی دیواروں پر لکیریں کھینچا کرتے ہیں ان لکیروں میں جو سب سے پہلے بامعنی لفظ کی صورت پیدا ہوتی ہے وہ لا ہے کہ یہ سیدھی دو لکیروں کے سِرے مل جانے سے پیدا ہو جاتی ہے لفظ "لا" کو "لام الف" بھی کہتے ہیں اور "لا" زبانِ عرب میں جہاں کا رہنے والا مجنوں تھا نفی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں میں اسی زمانہ سے درسِ بیخودی میں فنا کی تعلیم حاصل کر چکا ہوں جبکہ مجنوں صورتِ "لا" کو بھی جو منفی ہو کر فنا پر دلالتِ لفظی ہو بالقصد بنانا نہیں جانتا تھا یعنی ہنوز اس محوِ صورت نے عشقِ مجازی کے پہلے زینے پر بلا قصد قدم ہی رکھا تھا کہ میں فنا فی الذات کے مراتب طے کر رہا تھا۔ اس لئے میری بیخودی کو قیس کی بیخودی سے کوئی واسطہ نہیں۔

نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا
کہ پشتِ چشم سے جس کے نہ ہووے مہر عنواں پر

طومار مسل اس کے لئے اب اردو میں انگریزی کا لفظ فائل اس قدر استعمال ہونے لگا ہے کہ طومار اس کے مقابلہ میں اجنبی معلوم ہوتا ہے مسل یا طومار کی صورتِ تکمیل دستخط ہوتی ہے لیکن زمانۂ شاہی میں طومار کے لئے حاکم کی مہرِ خاص بھی درکار تھی۔ اقلیمِ الفت وہ ملک جہاں حضرتِ عشق کی حکمرانی ہے۔ آنکھ کو بہ لحاظ پھیلی ہوئی سیاہی کے مہر سے تعبیر کیا۔ پشتِ چشم سے مراد ہے پھری ہوئی آنکھ یعنی بے مروتی کی نظر۔ کہتے ہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا نہیں ہے جس کے عنوان پر پشتِ چشم کی مہر نہ لگائی گئی ہو یعنی کوئی رسمِ ناز بغیر عنوانِ بے وفائی کے شروع نہیں ہوتی اور جس طرح مہر سے تکمیلِ طومار ہوتی ہے اسی طرح ملکِ الفت میں بے مروتی سے تکمیلِ ناز ہوتی ہے گویا پشتِ چشم تغافل طومارِ عدالتِ حسن کی سندِ تکمیل ہے یا یہاں بے مروتی ہی سامانِ تکمیلِ ناز ہے۔ اس شعر میں دوسرے مصرعہ کا جو طرزِ بیان ہے اب یہ مستحسن نہیں سمجھا جائے گا۔

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

یہ اس وقت کا ذکر ہے جبکہ معشوق کے ساتھ مل بیٹھے ہیں اور بہ عالمِ شادی اپنی پچھلی سب مصیبتیں بھول گئے۔ ابرِ شفق آلود کو بہ لحاظ سرخی و تابانی آتش بار ٹھہرایا اور موسمِ بہار کی رنگینی کو جس کے لئے چمن مشتعل گشتہ کہتے ہیں اور مصنف نے لکھا ہے۔

(غالب) جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یہاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

(ولہ) موجۂ گل سے چراغاں ہے گذرگاہِ خیال
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

بہ لحاظِ سرخی و تابش موجِ شفق اور موجِ گل کو آگ سے مشابہ کیا۔ انسانی تخیل اپنی ذاتی کیفیات کے اعتبار سے برائی میں بھلائی اور بھلائی میں برائی پیدا کر دیتا ہے۔ یہ معشوق کے ساتھ بزم آرائے گلشن ہیں اور کہتے ہیں میں تم سے مل کر اپنی مصیبتوں کو بھول گیا تھا اس لئے کچھ نہ کہہ سکا اب جو رنگینیِ چمن پر ابرِ شفق آلود کا دلفریب منظر سامنے آیا تو مجھے بات یاد آ گئی کہ جب سیرِ چمن کے وقت تم میرے ساتھ نہ تھے تو یہی ابرِ شفق آلود میری نگاہوں اور گلستاں پر آگ برسا رہا تھا مجھے یہاں سے ایسی وحشت ہوئی اور ایسا بھاگا جیسے کوئی جلتے ہوئے مکان سے نکلے۔ ع۔ یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا۔

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہو گا
قیامت اِک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

جس خاک کو شوقِ پرواز ہو اس کے لئے ہوائے تند رحمت ہو گی۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ شہید معصوم ہوتے ہیں یعنی ان کا کوئی گناہ باقی نہیں رہتا اور وہ بے حساب جنت میں چلے جائیں گے نیز خدا کے مقبول بندوں کے لئے قیامت وعدۂ دیدار کے وفا ہونے کا دن ہے۔ ع یہ وقت ہے شگفتن گل ہائے ناز کا۔ حدیث میں آتا ہے اہلِ جنت جلوۂ ذات کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح لوگ چودھویں رات کے چاند کو بے تکلف دیکھتے ہیں۔ حریمِ ناز مقامِ ذات۔ کہتے ہیں شوقِ پروازِ حریمِ ناز کے سوا اور شہیدوں میں کیا باقی رہ گیا ہو گا کیونکہ اعمال سے تو وہ سبکدوش ہو ہی چکے ہیں اور اب کوئی گراں باری باقی نہیں تو وہ فتنۂ حشر سے کیوں گھبرائیں ان کی خاک پر تو قیامت اِک ہوائے تند کا کام کر رہی ہے اب وہ دم کے دم میں اڑ کر معشوقِ حقیقی کے حریمِ ناز تک پہونچے جاتے ہیں۔ آیہ فی مقعدِ صدقٍ عند ملیکٍ مقتدر۔

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

یہ تو اپنی اپنی جبلتی کی بات ہے ہمارا زور گریبان پر چلتا ہے تو ہم کب اس پر

شدت نہیں کرتے اگر ناصح کا ایک روز ہم پر قابو چل گیا اور اس نے شدت کر لی تو اس میں لڑنے کی کون سی بات ہے۔ یا یہ کہ ناصح نے اگر ہم پر بربنا رو حشت شدت کی تو اس سے لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں گریباں اپنے قبضہ کی چیز ہے اسی کو چاک نہ کر ڈالیں کہ وہ منہ دیکھتا رہ جائے ایک شرابی کا ذکر ہے کہ کسی نے اسے مے نوشی پر تنبیہ کی تھا من چلا جوش میں آ گیا اور ایک آدھی بوتل شراب لا کر اسی کے سامنے چڑھا لی ایک بدعتی صاحب کا مذکور ہے کہ ان سے کسی عالم نے کہا کہ قبر کو سجدہ کرنا حرام ہے آپ اٹھے وضو کیا اور پچاس سجدے قبر کو انھیں کے سامنے کر دیئے۔

(ریاض) سنائیں ہم بھی اسے کچھ جو کہہ چکے واعظ
یہ بیٹھ جائے تو مینا اٹھے سبو آئے

(۶۰)

ہے بسکہ ہر اک اس کے اشارے میں نشاں اور
کرتا ہے محبت تو گزرتا ہے گماں اور

چونکہ اس کی کوئی بات دغا بازی اور مکاری سے خالی نہیں ہوتی اس لئے مجھے اظہارِ محبت پر بھی فریب کا گمان ہوتا ہے۔

(ناطق) ان اہلِ جفا کے گھر کیا کام وفاؤں کا
اس شکل کی شے کوئی ہو گی تو دغا ہو گی

یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

میں عرضِ مدعا پر کما حقہٗ قادر نہیں اور وہ ایسے بھولے ہیں کہ میرے الفاظ سے مطلب نہیں نکال سکتے یا ایسے لاپرواہ ہیں کہ میری بات کو سمجھنا نہیں چاہتے اس لئے یا اللہ اگر مجھے ایسی زبان جو عرضِ مطلب کے لئے کافی ہو نہیں مل سکتی تو

انھیں کا دل بدل کر ایسا فہیم یا مہربان بنا دے کہ میری بات کو سمجھ لیں۔

(ناطق) عرض مطلب کا یہاں کون سے ڈھب سے ہے رواج
تیرے کوچہ کے فقیروں کی صدا کون سی ہے

ابرو سے ہے کیا اس نگہہِ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کماں اور

ابرو کو کمان اور نگاہِ ناز کو تیر باندھتے ہیں ان دونوں کی قربت سے گمان ہو سکتا ہے کہ یہ تیر اسی کمان سے چلایا جاتا ہوگا۔ یہ دفع دخل مقدر کرتے ہیں کہ ابرو کو نگاہِ ناز سے کوئی ربط نہیں یہ تیر تو ضرور ہے مگر اس کی کمان اور ہی ہے یعنی یہ تیر کسی ایسی غیبی کمان سے چلتا ہے جس کا توڑ قیامت کا ہے یعنی قوسِ قضا کا تیر ہے۔

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

جس شہر میں تم ہو وہاں ہر وقت جان و دل فروشی کا بازار گرم رہتا ہے اس لئے ہمیں نہ دل کا غم ہے نہ جان کا یہ دونوں تو بازاری چیزیں ہوگئی ہیں جب چاہیں گے جب نئی خرید لائیں گے۔ یا معشوق سے کہتے ہیں تمہارے نزدیک تو یہ مال سستا ہے پھر ہم بھی جان و دل کی کیا قدر کریں اور ان کے جانے کا کیا غم کریں جب ان چیزوں کی ضرورت پڑے گی تو تم ہمیں شہر میں موجود ہو تم ہی کو ساتھ لے جا کر بازار سے خرید لائیں گے۔

ہر چند سبکدست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

ہم ہیں یعنی ہمیں امتیازِ خودی ہے۔ بت پرستی بھی سنگ راہِ حقیقت ہوتی مگر خود پرستی اس سے کچھ کم نہیں کیونکہ یہ بھی اسی طرح خدا پرستی کے منافی ہے کہتے ہیں ہم بت شکنی میں مشاق بھی ہو گئے تو کیا حاصل کیونکہ امتیازِ خودی تو ہنوز سنگ راہِ حقیقت ہے جو بت پرستی سے زیادہ گراں سنگ ہے اور آسانی سے نہیں ہٹایا جا سکتا۔ حاصل یہ کہ وحدت پرستی میں

خود پرستی بت پرستی سے بھی زیادہ مصیبت ہے۔

(ناطق) رسمِ نیاز سے ہے دور شیخ بہ زعمِ بندگی
بندہ بہ پا سرِ غرور خود ہے خدا نماز میں

ہے خونِ جگر جوش میں جی کھول کے رونا
ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور

ان دو ہی آنکھوں کا راستہ میرے خونِ جگر کے طوفان کو نکالنے کے لئے کافی نہیں اگر اور بھی کئی آنکھیں ہوتیں تو حوصلہ نکلنے کا موقع ملتا اور جی کھول کر روتا۔ اسی مضمون کو مصنف نے فارسی میں ذرا فرق کے ساتھ لکھا ہے لیکن کمال کر دیا ہے۔

(غالب) فوّارہ وار اشک ز فرقم فرا گرفت
گم کردہ راہِ چشم بہ شبہا گریستم

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد سے لیکن وہ کہے جائے کہ ہاں اور

جلاد کو ان کے لئے حکم عقوبت دیا گیا ہے اور معشوق دم آزار ہر ضرب پر ہاں اور کہتا جاتا ہے یہ ان کے نزدیک ایسی جانفزا آواز ہے کہ چاہتے ہیں وہ ہر وار پر یہی کہتا رہے چاہے بالآخر ان کا سر ہی کیوں نہ اڑ جائے۔ دلکش آواز بسا اوقات ایسی ہوتی ہے کہ انسان اس کے سننے میں محو ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی تکلیف یا نقصان اٹھانے کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ اہل سماع کو اکثر وجد میں چوٹیں آتی ہیں اور تکلیفیں پہونچتی ہیں مگر ان کا ذوقِ نغمہ کم نہیں ہوتا۔

(ناطق) اچھا نہیں تو ذکرِ تمنا نہیں سہی
تم پھر اسی ادا سے تو کہدو کہ ہم نہیں

لفظ "کہے جائے"، گو اب بھی نواحِ دہلی میں مستعمل ہے لیکن شعرا نے اسے ترک کر دیا ہے خدا جانے کیوں۔

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکہ
ہر روز دکھاتا ہوں میں اِک داغِ نہاں اور

یہاں "لفظ اور" نئے کے معنی میں استعمال کیا ہے جو کہیں کہیں بولا بھی جاتا ہے۔ کہتے ہیں جس چیز کو لوگ ہمیشہ وہی ایک خورشید درخشاں سمجھتے ہیں فی الحقیقت وہ کوئی مستقل چیز نہیں اور نہ اس کا کوئی وجودِ واحد نہیں بلکہ میں ہر روز اپنا ایک نیا داغِ پنہاں سب کے سامنے پیش کر دیتا ہوں جن کی مماثلت سے دھوکہ کھا کر روز کا ایک ہی آفتاب سمجھتے ہیں حالانکہ معاملہ یہ نہیں ایسے لاکھوں آفتاب داغ میرے سینہ میں پنہاں ہیں جن میں سے ہر روز ایک نیا پیش کر کے میں لوگوں کو خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکہ دیتا رہتا ہوں۔

لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

اگر میں تمہیں دل نہ دیتا تو چند روزہ زندگی چین سے بسر ہوتی اس لئے دل دینا راحتِ زندگی کے لئے بُرا ہوا اور دل دے ہی دیا تھا تو چندے زندہ رہتا کہ اس طرح آہ و فغاں کے مزے لے سکتا یعنی غمِ عشق کی لذت سے بہرہ اندوز ہوتا لیکن کمبخت موت نے آ کر اس سے بھی محروم کر دیا۔ حاصل یہ کہ عشق نے لطفِ زندگی کو کھویا اور موت نے لطفِ درد کو۔ "چین لیتا اور آہ و فغاں کرتا" کا اتنی بڑی تعقید کے ساتھ بیان کچھ غالب کا زورِ کلام ہی سنبھال سکتا ہے۔

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

مشقِ سخن اگر بند ہو جائے تو طبیعت میں بستگی سی پیدا ہو جاتی ہے اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ میری طبیعت اگر رُکتی ہے تو وہ اور بھی زور پکڑ کر روانی دکھاتی ہے جس طرح ندی نالے جب راستہ نہیں پاتے تو چڑھ جاتے ہیں۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

دنیا میں اور بھی شاعر ہیں اور بہت اچھے اچھے ہیں لیکن غالب کا اندازِ بیان سب سے نرالا ہے۔ کیوں نہ ہو انھیں کا طرزِ نظم ہے جو بگڑی ہوئی ترکیب اور اکھڑے ہوئے بیان کو بھی سنبھال لیتا ہے۔ ع۔ تو سیمیں تن چناں خوبی کہ زیورہا بیارائی۔

(۶۱)

صفائی حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر
تغیّرِ آبِ برجا ماندہ کا لاتا ہے رنگ آخر

صفائی آب۔ حیرت جمود۔ کہتے ہیں جس طرح ماءِ راکد یعنی ٹھہرے ہوئے پانی کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے (رکے ہوئے پانی کا رنگ بصورتِ زنگار سبزی لے آتا ہے) یعنی پانی کے لئے ایک جگہ ٹھہرنا بالآخر رنگ بدلنے کا سبب ہوتا ہے اسی طرح آبِ آئینہ بھی جو بانداز حیرت راکد یا منجمد ہوتی ہے آئینہ کے لئے سامانِ زنگ ہے۔ حاصل یہ کہ آبِ آئینہ کے لئے اس کا جمودِ حیرت اسی طرح سامانِ زنگ ہے جس طرح پانی کے لئے رکن تغیرِ لون کا باعث ہوتا ہے۔ اک تکلف سا ہے۔

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

سامانِ عیش میں جامِ شراب وہ زمرد کا بنا ہوا جو نہایت بیش قیمت ہوتا ہے اور جسے اہلِ جاہ ہی رکھ سکتے ہیں ایک بڑی چیز ہوا اس سے بڑھ کر اور کیا رنگ سرور ہو گا۔ پلنگ ایک مہیب درندہ جو نہ صرف مردم خوار ہوتا ہے بلکہ بلحاظِ طبیعت شیر سے زیادہ خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ اردو میں اسے چیتا کہتے ہیں اور اس پر پیلے رنگ کے ساتھ سیاہ داغ ہوتے ہیں اس کی شریر طبعی اور بے رحمی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شیر جب تک بھوکا نہ ہو حملہ نہیں کرتا

لیکن چیتا اگر پیٹ بھرا ہوا بھی ہو اور کھانا نہ بھی چاہے تو شکار کو مار کر ڈال دیتا ہے یہ جسامت میں شیر ہندی سے کچھ چھوٹا ہوتا ہے لیکن صورت میں مماثل اس کا رنگ شیر ہی کا جیسا ہوتا ہے لیکن شیر پر سیاہی مائل چٹے ہوتے ہیں اور اس پر دھبے جنھیں مصنف نے یہاں داغِ پلنگ کہا۔ داغِ پلنگ کی دید پلنگ کی دید ہوئی جسے دیکھ کر انسان کو طبعاً وحشت کرنا اور بھاگنا چاہیئے۔ کہتے ہیں میری وحشت کا علاج سامانِ عیش و جاہ سے کیا گیا تھا کہ یہ انسان کے لئے وجہ دلبستگی ہے اور جامِ زمرد سے بڑھ کر یہ سامان کیا ہو سکتا تھا لیکن یہاں الٹا اثر ہوا کہ دمِ بادہ کشی جامِ زمرد بھی میرے لئے داغِ پلنگ کی طرح سامانِ وحشت ثابت ہوا۔ یعنی دنیا کا ہر سامان عیش و جاہ مجھے بہ عالمِ وحشت کھانے کو دوڑتا ہے اور میری وحشت میں اضافہ ہوتا ہے۔

۶۲

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

گریباں چاک اضافتِ مقلوب یعنی چاکِ گریباں۔ کہتے ہیں میں جنوں پرور ہوں جس کی دستگیری عریانی کے بغیر ناممکن ہو اس لئے چاک گریباں کا مجھ پر احسان ہے جس نے اس کام میں میرا ہاتھ بٹایا۔ یا یہ کہ مجھے جنون کی دستگیری کرنا ہے اور یہ بات بغیر عریانی کے ہو نہیں سکتی اس لئے اے گریباں میری گردن پر چاک کا حق ہو گیا ہے کہ وہ ہمیشہ گلوگیر رہے یعنی دستگیریِ جنوں کے لئے مجھ پر چاک گریبانی لازم ہے۔

(ناطق)
جنوں کی رہنمائی ہو گئی چاکِ گریباں سے
وہاں سے ہم نکل آئے جہاں سے آستیں نکلی

بہ رنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

ہزار آئینہ ہزار طرح سے۔ کاغذِ آتش زدہ میں بجھنے کے وقت ہزاروں روشن ذرات پیدا ہوتے ہیں گو ان کا وجود فانی ہوتا ہے اِس پر بھی گل ہونے تک اضطرابی شکل قائم رہتی ہے اِن ذرات میں جو اضطرابی صورت پیدا ہوتی ہے وہ سب میں ایک ہی قسم کی نہیں ہوتی بلکہ بہت سے رنگِ اضطراب پیدا ہوتے ہیں دل کو بیتابی کے ساتھ خصوصیت ہے۔ ہزار آئینہ دل ہزاروں طرز اضطراب۔ کہتے ہیں نیرنگِ بیتابی ایک تڑپنے والے پر اندر کاغذ آتش زدہ کی طرح دم کے دم میں ہزار طریقہ سے دل ہائے بیتاب کے انداز پیدا کر کے رکھ دیتا ہے۔

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

متاعِ بردہ مالِ بہ غارت بردہ۔ حالی نے اس کی شرح یوں کی ہے کہ یہ مضمون بالکل وقوعیات میں سے ہے کہ جو لوگ آسودگی کے بعد مفلس ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم ستم رسیدہ و فلک زدہ سمجھا کرتے ہیں اور اخیر دم تک اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف ہوگا اور ہمارا اقبال عود کرے گا شرح بالکل درست ہے اس لئے میں صرف وضاحت کے لئے اس شعر کو بدل کر یوں لکھ دینا چاہتا ہوں۔

طلب کرتے ہیں انگلستان سے ہم اپنی آزادی
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

اسی مضمون کو ذرا اندازِ بیان بدل کر مصنف نے دوسری جگہ بہت خوبی کے ساتھ لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

(غالب) گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے — غمِ محرومیِ جاوید نہیں

ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

ہمیں اس بے سبب رنجیدہ ہو جانے والے اور آشنا دشمن سے واسطہ پڑا ہے جو روزنِ در سے شعاعِ مہر کو آتے ہوئے دیکھ کر چشمِ روزن پر بھی گھورنے کی تہمت

رکھتا ہے یعنی بے بات کی بات نکال کر بگڑ بیٹھتا ہے۔ یا یہ کہ جو شعاعِ مہر کو دیکھ کر اپنی بدگمانی سے چشمِ روزن پر یہ تہمت لگاتا ہے کہ اس نے مہرِ تاباں سے نظر بازی کی ایسے بگڑ جانے والے آشنا دشمن سے ہمیں واسطہ پڑا ہے یعنی وہ خواہ مخواہ کے الزام لگا کر خفا ہو جاتا ہے۔

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

گلخن بھٹی تنور۔ تنور میں جھونکے جانے سے جو کوڑے کرکٹ کا شعلہ بلند ہوتا ہے اسے فروغِ طالعِ خاشاک کہا گویا بھٹی میں جلنے سے کچرے کا نصیبہ چمکتا ہے۔ کہتے ہیں اگر تو اپنی حقیقت کا مشتاق ہے یعنی نورِ ذات میں شامل ہو جانا چاہتا ہے تو خود کو نذرِ فنا کر دے یعنی سوزِ عشق سے فنا فی اللہ ہو جا کیونکہ اس کے بغیر کسی طرح تیری ناچیز ہستی کے لئے منور ہو کر اپنی حقیقت کو پا جانا ممکن نہیں اور فنا سے دور رہنا اسی طرح باعثِ آلودگی و ناکسی ہے جس طرح خاشاک کے لئے گلخن تک نہ پہونچنا۔

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

غالبؔ بھی کس عجیب انداز کا بسمل ہے کہ قاتل کے مشقِ ناز کا تماشا دیکھنے کے شوق میں خونِ دو عالم اپنی گردن پر لینے سے بھی نہیں ڈرتا۔

(۶۳)

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف برطرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

تجھ پر ہزاروں معشوق بھی عاشق ہیں اس مصلحت سے میں ترے مظالم کو برداشت کئے جاتا ہوں کہ انھیں رقیبوں میں کوئی نہ کوئی خود تجھ سا معشوق بھی نکل آئیگا

جیسے عشاق کے ساتھ خود دردِ عشق میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ہمدردی ہو گی میں اسی سے بے تکلف محبت کر لوں گا اور وہ اسی مرض کا شکار ہونے کی وجہ سے میرے عشق کی قدر کرے گا۔ ع۔ "خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو" یہ شعر سب کچھ بھی ہے اور کچھ بھی نہیں کہ تنوع تو اس میں ضرور ہے اور معشوق سے چھیڑ بھی مگر مسلماتِ غزل سے باہر ہو جاتا ہے "لفظِ خوباں" کا استعمال جس طرح بلا ترکیب فارسی کے انھوں نے یہاں کیا ہے اب درست نہیں۔

(۶۴)

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

یہ غزل ایک مرحوم عزیز کے خیال میں لکھی گئی ہے جس کے بعض اشعار میں تغزل ہے اور بعض میں نہیں۔ یہ اس مرحوم سے خیالی باتیں کر رہے ہیں جن کا انس جوان کے ساتھ تھا دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ ملکِ عدم میں میرا ساتھ نہ ہونے سے گھبراتے ہوں گے۔ کہتے ہیں تم نے مرجانے میں جلدی سے کام لیا اس لئے اب وہاں اور چند دن تنہا رہو اگر میرے ساتھ مل کر یہ سفر کرنے کے لئے اور کوئی دن ٹھہر جاتے تو وہاں کیوں تنہا رہتے۔

مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

تیرے سنگِ در پر۔ یوں سمجھئے کہ سنگِ مزار پر اور کوئی دن ماتھا رگڑوں گا اس سے یا تو یہ فائدہ ہوگا کہ پتھر گھس کر میرے لئے راستہ ہی نکل آئے گا اور زندہ درگور ہو کر تجھ تک پہونچ جاؤں گا یا خود مٹ کر ملکِ عدم میں تجھ سے آملوں گا یا یہ کہ معشوق سے کہتے ہیں کہ تیرا سنگِ در جو میرے راستہ میں حائل ہے اس پر اور سر رگڑتا ہوں جس سے یا تو یہی گھسے گا یہ میرے لئے راستہ نکل آئے گا یا میں ہی فنا ہو کر کشمکشِ شوق سے نجات پا جاؤں گا۔

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

کل کی تو تمہاری پیدائش ہے اور آج ہی سفرِ آخرت کی تیاری کر دی بھلا یہ بھی کچھ بات ہے بھائی یہ تو مانا کہ دنیا میں کسی کو ہمیشہ رہنا نہیں لیکن ہماری خاطر سے اور کوئی دن کی زندگی سہی۔ یا یہ کہ معشوق سے کہتے ہیں کہ آپ کل ہی تشریف لائے ہیں اور آج جانے کا ارادہ کر دیا یہ کیسی بات ہے مانا کہ آپ ہمیشہ میرے ہاں نہیں رہیں گے لیکن چند روز تو قیام فرمایئے۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

مرنے والے کہا کرتے ہیں کہ اب خدا کے وہاں ملاقات ہوگی یا قیامت کے روز ملیں گے یہ کہتے ہیں یہ بھی خوب کہی تمہاری موت کے صدمہ نے تو ہم پر آج ہی قیامت گزار دی اب اور کون سی قیامت کو ملوگے۔

(غالبؔ) فرداودی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل وہ گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

یا یوں سمجھئے کہ آپ مرے جگ پرلئے۔ یا یہ کہ معشوق خفا ہو کر جا رہا ہے اور پھر نہ ملنے کے الفاظ بجائے یوں ادا کرنے کے کہ اب تم سے قیامت تک نہ ملیں گے کہتا ہے کہ اب قیامت کے روز ملیں گے یہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ واہ یہ بھی اچھی کہی تو ہمارے لئے قیامت کا دن ہے کہ آپ ناراض ہو کر جا رہے ہیں۔ چلئے بس قیامت آ گئی اب مل بیٹھے۔

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارفؔ
کیا ترا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مرحوم سے خطاب کرتے کرتے خیال آیا کہ یہ ستم آسمان نے توڑا ہے اس لئے لفظِ ہاں سے چونک کر تغیرِ خطاب کے ساتھ آسمانِ پیر سے کہتے ہیں کہ جس غریب کی

تو نے بھری جوانی میں جان لی ہے وہ بیچارا اگر کوئی دن اور زندہ رہ کر لطفِ شباب اٹھاتا تو تیرا کیا بگڑ جاتا۔ عارفؔ مرحوم کا تخلص ہے اور نام زین الدین خاں یہ مصنف کے شاگرد بھی تھے اور عزیز بھی اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو یہ کسی رشتہ سے غالبؔ کے سالے ہوتے تھے کہتے ہیں کہ خوش گو بھی تھے اور ضرور ہوں گے کہ غالبؔ جیسا شخص ان کے لئے ماتم کرتا ہے لیکن ان کا کوئی شعر میری نظر سے نہیں گزرا۔

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

چاند بدری حالت سے ایک دم محاق نہیں ہو جاتا (محاق اماوس کا چاند) پھر تم جو مرے گھر کے ماہِ شبِ چار دہم تھے کیونکر یکایک معدوم ہو گئے۔ یا اگر اسے معشوق کے ساتھ خطاب لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ تم میرے گھر میں چودھویں رات کے چاند تھے تو پھر یہ کیا ہوا کہ ایک دم چلے گئے اور یہاں اندھیرا پڑ گیا۔

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مصنف تفننِ طبع سے کسی حالت میں نہیں چوکتے تھے شاگردوں اور چھوٹوں کے ساتھ بھی بیشتر ایسے الفاظ استعمال کر جاتے تھے اور کمالِ غم و الم کی حالت میں بھی بلاقصد کہئے یا بالقصد تمسخر کے الفاظ ان کے منہ سے نکل جاتے تھے۔ مرحوم چونکہ ان کے سالے بھی تھے اس لئے مذاق کا رشتہ بھی تھا جس پر اتر آئے۔ یہاں کہتے ہیں تم تو کچھ ایسے لین دین کے کھرے بھی نہ تھے بہت لوگ تمہارے پیچھے تقاضا کرتے ہوئے گھوما کرتے تھے اور تمہیں انھیں ٹالنا آتا تھا پھر یہ کیا خلافِ عادت کر بیٹھے کہ ملک الموت آیا اور جھٹ جانِ عزیز اس کے حوالہ کر دی تمہیں تو یہ چاہیے تھا کہ حسبِ عادت اسے ٹالتے اور کچھ دنوں تقاضا کراتے۔

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

نیّر غالب کے ایک ہونہار اور حاضر باش شاگرد تھے ان کا کلام میری نظر سے گزرا ہے خوب کہتے تھے مصنف کو ان کے ساتھ خاص اُنس تھا اور اسی وجہ سے نیّر کے ساتھ عارف کی چشمک رہتی تھی اور عارف اس میں غالب کو بھی الزام دیتے تھے کہ انھیں نیّر کی طرف بے وجہ التفات ہے ۔ یہ کچھ نیّر اور عارف ہی کی بات نہیں بلکہ عام طور پر استاد بھائیوں میں ایسا ہی ہوتا ہے ۔ کہتے ہیں تمہاری نیّر سے لڑائی تھی اور نیّر کا بیجا طرف دار سمجھ کر مجھ سے نفرت کرتے تھے تو سہی یہ ہم دونوں سے روٹھ جانے کی وجہ ضرور ہے لیکن تمہارے بچوں نے کیا قصور کیا تھا ان کا تماشا دیکھنے کے لئے تو کوئی دن اور زندہ رہتے ۔

گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

زندگی ضرور وجہ محن ہے لیکن اے جواں مرگ جتنے روز تم زندہ رہے یہ مدت بہر حال خوش و ناخوش گزر ہی نہ گئی اسی طرح تنگی ترشی سے خاطرِ احباب کے لئے اور کوئی دن گزارا کرنا تھا ۔

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ عارف کی موت کا صدمہ اُٹھا کر غالب کیوں کر زندہ رہا وہ نادان ہیں کیونکہ میں غریب زندہ درگور تو ہو ہی چکا ہوں اب یہ موت پر موت سمجھئے کہ مرنے کی تمنا میں اور کوئی دن زندہ رہنا میری قسمت میں لکھا ہے یا اس شعر کا بیانِ عام بھی ہو سکتا ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایسے صدماتِ زندگی میں غالب زندہ کیونکر ہے انھیں یہ مندرجہ بالا جواب دیتے ہیں ۔

فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح و مہر
ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز

جیب گریبان ۔ داغ کو آفتاب سے اور سفیدیِ کفن کو سفیدائے صبح سے مشابہ کیا ۔ جس طرح گریبانِ سحر آفتاب سے خالی نہیں ہوتا گو بظاہر آفتاب نظر بھی نہیں آتا ۔ یہ کہتے ہیں کہ اسی طرح پس مردن میرا گریبان بھی داغِ عشق سے خالی نہیں یعنی یہاں دخل مقدر کر رہے ہیں یہ مر کر کفن لپیٹے ہوئے خاموش لیٹے ہیں دیکھنے والے جوان کے پہلے حالات سے واقف تھے کہہ رہے ہیں کہ مر کر بے چارے نے سوزِ عشق سے نجات پائی یہ اس کا جواب ہے کہ اب تک میرے داغِ عشق کا وہی عالم ہے یہ نہ سمجھے کہ مجھے اس سے نجات مل گئی موت تو اس کے لئے اک نئی صبحِ بہار ہے کہ اب جس طرح گریبانِ صبح سے طلوع ہو کر آفتاب روشن ہوتا ہے اسی طرح میرے جیب کفن سے یہ آفتابِ داغ چمکے گا ۔ جیب عربی کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں گریبان اس کو اردو میں عام طور پر کیسے کے معنے میں بولا جاتا ہے جو مہند بالمعنی ہوا اردو میں دیکھا ہے کہ اکثر شعرا جیب و گریباں کو بصورتِ عطف لاتے ہیں جو درست نہیں کیونکہ ایسی صورت میں اگر جیب کے معنی گریبان ہی لئے جائیں تو عطف الشئے الیٰ نفسہ ہوگا جو علمِ بیان کا عیب ہے اور اگر جیب کے معنی کیسے کے لئے جائیں تو اردو لفظ کے ساتھ واوِ عاطفہ آتی ہے جو بصورتِ دیگر درست نہیں اس لئے جیب و گریباں کا استعمال میں کسی طرح مستحسن نہیں سمجھتا ۔

ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر
ہوں گلفروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز

داغِ کہن سے زوالِ عشق مراد نہیں بلکہ داغ کی تازگیِ زائل شدہ کا ذکر کرنا مقصود ہے اس لئے یہاں زرِ از دست رفتہ کے ساتھ بیان تشبیہ با دنیٰ ملابست ہے ۔ مطلب یہ کہ جس طرح بگڑے نواب اپنی تباہ شدہ دولت پر ناز کیا کرتے ہیں اسی طرح میں بھی اپنے داغِ کہن کی گلفروشیاں کر رہا ہوں یعنی اس کی بہار و

کا راگ گاتا ہوں۔ یا یہ کہ ان کے لئے زرِ از دست رفتہ بہ عالم مفلسی اِک داغِ کہن ہے جس پر دنیا کی عادت کے مطابق کہتے ہیں کہ وہ ہنوز میرے لئے وجہ ناز ہے اور اس داغ کی گلفروشیاں کرتا ہوں۔

مے خانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
خمیازہ کھینچے بُتِ بیداد فن ہنوز

خمیازہ کھینچنا انگڑائی لینا جو علامت ہے خمار کی اور جس کے دفعیہ کے لئے شراب پی جاتی ہے بُت بیداد فن کی شراب اشکِ خون عاشق ہے جو میخانۂ جگر میں کشید ہوتی ہے اور جس سے اسے سرور آتا ہے۔ مطلب یہ کہ گو اس ظالم جفا جو نے رُلا رُلا کر میرے خونِ جگر کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں چھوڑا لیکن ہنوز سیری نہیں ہوئی۔

(۶۶)

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

فسونِ نیاز خوشامد کا جادو ؎

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

شاعر اپنی نامرادی کے تلخ تجربوں کی بناء پر کہتا ہے کہ جب کوئی مشکل آپڑتی ہے تو گڑگڑانے اور دعا کرنے سے مطلب برآری نہیں ہوتی اور چونکہ خدا سے مانگنا شانِ عبودیت ہے اس لئے اب یہی دعا مانگیں گے کہ یارب حضرت خضر کی عمر دراز کردے تاکہ شانِ بندگی بھی باقی رہے اور دعا کرکے مفت کی مایوسی اور بدگمانی بھی نہ ہو کیونکہ خضر کی عمر خواہ مخواہ دراز ہے گو یہ شعر گستاخانہ ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ عجب بات پیدا کی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے اگر اللہ میاں اپنے بندوں کی دعائیں قبول نہ کریں تو ان سے کیا کہئے۔

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود
ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

ممکنات کا وجود وہمی ہے اور جب یہ سمجھا کہ ماسوا اللہ یعنی زمین و آسمان یہی کچھ ہیں تو تیرا تصور نشیب و فراز سے خالی نہ رہا اب اگر بایں بیہودگی اس بیاباں میں گشت لگائے گا یعنی ماہیت اشیاء پر غور کرے گا تو اندھے کی طرح ٹھوکریں کھائیگا اس لئے یہ چاہئے کہ وہم وجود کو دل سے نکال کر اپنے تصور کو نشیب و فراز سے خالی کرلے پھر سب کچھ تجھ پر منکشف ہوجائے گا حدیث میں آتا ہے کہ پیغمبر اسلام دنیا کی شاعری میں سب سے زیادہ لبید ابن عاصم کے اس مصرعہ کو پسند فرماتے تھے۔ ع۔ اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہ بَاطِلٌ مصنف کے اس شعر کا مطلب بھی اسی مصرعہ سے کچھ ملتا ہوا ہے۔

وصال و جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں
کہ دیجے آئینۂ انتظار کو پرواز

آئینہ انتظار سے مراد ہے چشم شوق نگاہ منتظر۔ پرواز دینا سنوارنا جلا دینا جس سے آئینہ میں عکس پذیر ہونے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ تماشائے وصال و جلوہ کا تو وجود ہے لیکن خود یہاں یہ فکر کہاں کہ آنکھ کو اس کے دیکھنے کے قابل بنائیں یعنی یہ کہ مجاہدے اور مراقبہ کی زحمت گوارا کرنا انسان نہیں جانتا ورنہ اگر یہ ہو تو جلوہ و وصالِ ذات کے سارے تماشے حاصل ہو سکتے ہیں۔

(مولانا روم)
تن زِ جان و جاں زِ تن مستور نیست
لیک کس را دیدِ جاں دستور نیست

(ناطق)
تم اپنے دل کو ذرا صاف کرکے دیکھو تو
ادھر بھی آئے گا عالم نظر ادھر کا سا

یا یہ کہ تماشا ہے اِک کھیل ہے معمولی بات ہے مطلب یہ کہ حصولِ جلوۂ دیدار اور وصالِ معشوقِ حقیقی کوئی مشکل بات نہیں کیونکہ وہ خود رگِ جاں سے زیادہ قریب ہے مگر انسان کو اس کی فکر کہاں کہ اس تک پہونچنے کی نگاہ پیدا کرلے۔

ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

ہوا حرص حسرت تمنا۔ عاشقِ حقیقی کو جو نورِ ذات کی تمنا تھی وہ خاک ہو کر زائل نہیں ہوئی کیونکہ اب اس کا ہر ذرہ آفتاب پرست بنا ہوا ہے یعنی انوار کی تلاشِ دید میں چشم بر آفتاب ہے۔

نہ پوچھ وسعت میخانۂ جنوں غالب
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

خاک انداز وہ ظرف جس میں مکان کا کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا ہے۔ آسمان کی شکل اوندھے پیالہ کی جیسی ہے اس لئے کاسۂ گردوں لکھا جاتا ہے مصنف نے اسے جامِ واژگوں بھی لکھا ہے۔ آسمان کو خاک انداز کہنا تحقیراً ہو گا لفظ "وسعت" کا استعمال یہاں تعمیماً ہے وسعت مکانی کی تخصیص نہیں مطلب یہ کہ میخانۂ جنون عشق کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ یہاں کاسۂ گردوں ایک خاک انداز کا کام دیتا ہے۔ غرض یہ کہ مستانِ جنونِ عشقِ الٰہی اپنی وسعتِ خیال میں دنیا و مافیہا پر خاک ڈالتے ہیں۔

(۶۷)

وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سرتاسرِ خاک
گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہربار ہنوز

ابر کو آبلہ پا کہا اور اس کا ثبوت گہر باری سے کام پہونچایا۔ مطلب یہ کہ اس سخی کی وسعتِ کرم میں کوشش ملاحظہ فرمایئے کہ گو آبلہ پا ہے لیکن اس پر بھی ہنوز ابرِ باراں تمام زمین پر گہرباری کرتا پھرتا ہے یعنی جو بارش ہو رہی ہے یہ بادل کے پاؤں کے پھپھولے پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہے ہیں۔ ایک تکلف ہے۔

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقش پا میں ہے تپِ گرمیِ رفتار ہنوز

میری گرم رفتاری نے مجھے صفحۂ دشت پر اتنا گھمایا ہے کہ نقشِ قدم سے کوئی حصہ خالی نہیں اور جنگل سب کا سب کاغذِ آتش زدہ کی مانند میری گرمیِ رفتار سے آتش زدہ ہے لیکن اس پر بھی میری تیز رفتاری میں فرق نہیں آیا اور نقشِ پا میں وہی پہلی سی گرمیِ رفتار کی آگ اب تک موجود ہے یعنی اتنا پھر کر بھی میں ہنوز تھکا نہیں۔

(۶۸)

کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

اگر محبت میں اس بت پر میں جان کو نثار نہیں کرتا تو ایمان جاتا ہے کہ جاں نثاری عاشقوں کا ایمان ہے بقولِ مصنف۔

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو (غالب)

دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

تیرے تیر کا پھل مجھے ایسا عزیز ہے کہ دل سے نکل جانے پر بھی اس کا انداز دل میں کھبا ہوا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہنوز دل ہی میں موجود ہے۔

تاب لاتے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

سخت مصیبت میں بے تابی اور کبھی دم پر بنا دیتی ہے اور بدحواسی سے مزید

مصیبت آتی ہے اس لئے صبر کے سوا چارہ نہیں گو بہ لحاظِ تغزل اس شعر کی کوئی شان ہو لیکن مصنف نے طرزِ بیان کو ایسا عام بنا دیا ہے جس سے ہر کیے وقت کے لئے یہ شعر موزوں ہو جاتا ہے اور رسمِ بیان میں اس سے ایک مستحسن اضافہ ہوتا ہے۔

(۷۹)

نے گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنے شکست کی آواز

گلِ نغمہ راگ کا الاپ۔ گل نغمہ اور پردۂ ساز اسباب ہیں ندائے طرب کے۔ اِن کی آوازِ نالہ کسی منچلے کو پسند آئی اُس نے تعریف کی یا کسی کو سُن کر ناگواری پیش آئی اور کہا یہ کیسی بے سری الاپ ہے یہ دونوں کا جواب دیتے ہیں کہ میں کوئی صدائے سرور نہیں بلکہ شکست کی آواز ہوں اور وہ بھی خود اپنی جس سے نقصان اور مصیبت کا پتہ چلتا ہے اب اس کا کیا علاج کہ اہلِ دنیا اسے دلنواز سمجھ کر پسند کریں یا اس کی بدنوائی کے شاکی ہوں شکست کی جو آواز نکلنا چاہیے وہ برآمد ہو رہی ہے مجھے اس کی پروا نہیں کہ کوئی کیا کہتا ہے۔

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

تو اطمینان سے خود آرائی میں مصروف ہے اور میں اپنی الجھنوں میں مبتلا۔ یا یہ کہ تجھے زلفیں سنوارتے دیکھ کر مجھے یہ اندیشے پیدا ہو رہے ہیں کہ کسی کو پھانستا تو نہیں مجھ پر بلائیں لاتا تو نہیں کہیں جانے کا ارادہ تو نہیں وغیرہ وغیرہ۔

لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

باوجود راز ہائے سینہ گداز کے جن کے ہوتے ہوئے پریشانی لازمۂ زندگی ہو جاتی

ہے ہمیں جو لافِ تمکیں ہے اسے محض سادہ دلی کا فریب کہنا چاہیے کہ پریشان ہیں اور خود کو پریشان نہیں سمجھتے۔ یا یہ کہ راز ہائے سینہ گداز پر ہمارا لافِ تمکیں محض سادہ دلوں کو فریب دینا ہے۔ یا "لاف" تمکیں فریب اور سادہ دلی مل کر ہمارے راز ہائے سینہ گداز ہیں۔

ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

یہ قیدِ قفس سے آزاد ہیں لیکن پرواز نہیں کرتے جس سے شک ہوتا ہے کہ کہیں طاقتِ پرواز تو طاق نہیں ہو گئی یہ اسے دفع کرتے ہیں کہ وہ تو ابھی مجھ میں باقی ہے لیکن چونکہ صیاد کے دامِ الفت میں گرفتار ہوں اس لئے اُڑتا نہیں یا اُڑنا نہیں چاہتا۔

وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے
ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

اب تو معشوق کی بے توجہی کی بدولت میری زندگی حسرتِ ناز میں بسر ہوتی ہے خدا وہ بھی دن کرے کہ اُسے میری طرف التفات ہو اور مجھے ظالم کی نازبرداری کا موقع ملے۔ "ناز کھینچوں" ناز کشیدن کا ترجمہ ہے مگر اردو کا یہ محاورہ نہیں اردو میں "ناز اُٹھاؤں" بولتے ہیں یہ بھی نازبرداشتن کا ترجمہ ہے۔ یہاں مصنف نے لفظ "سے" کا جو استعمال کیا ہے یہ بھی اب درست نہیں ایسے موقع پر لفظ کے بولتے ہیں۔

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں
جس سے مژگاں ہوئے نہ ہوں گلباز

میرے دل کا کوئی قطرۂ خوں ایسا نہیں جس سے مژگاں نے گلبازی نہ کی ہو یعنی سارا خون پلکوں پر کھیل چکا ہے۔ یہاں "نہیں دل میں" کی ترکیب بیانِ حال ہے اور شعر سے مراد ہے بیانِ ماضی اس طرح اس سے یہ معنی نکالے جا سکتے ہیں کہ

میرا خونِ دل جوارح ہی میں نہیں دوڑتا پھرتا بلکہ مژگاں پر بھی کھیل جاتا ہے۔ یا یہ بیانِ ماضی بطورِ تیقن مستقبل کے لئے ہے۔ مطلب یہ کہ میرے دل کا کوئی قطرۂ خوں ایسا نہیں جس سے مژگاں کی گلبازی ہونے والی نہ ہو یعنی سارے خون کو مژگاں پر آکر ٹپک جاتا ہے۔ یہ بھی ایک اردو کا مستحسن بیان ہے کہ جو امرِ مستقبل متیقن ہو اس کا ذکر ماضی کے ساتھ کر دیتے ہیں۔

اے ترا غمزہ یک قلم انگیز
اے ترا ظلم سر بسر انداز

اے یک قلم ولولہ انگیز غمزے والے اور اے ظلم میں سراسر اندازِ معشوقانہ پیدا کرنے والے۔ یہ شعر معہ دو اشعار مابعد کے قطعہ بھی ہے اور تینوں اشعار کے جدا جدا مطالب بھی ہو سکتے ہیں یہاں ایک تو یہ شعر جیسا کہ لکھ دیا گیا معشوق کی دو صفتوں کا بیان ہے جو اگلے اشعار سے مربوط ہو جاتا ہے دوسرا مطلب یہ کہ تیرا غمزہ یک قلم تمناؤں کو ابھارتا ہے اور تیرا ظلم سر بہ سر گرا دینے والا ہے یعنی ہمتوں کو پست کر دیتا ہے۔

تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو
ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

تیرے جلوہ گر ہونے پر جبینِ نیاز کے یا جبینِ نیاز کو سجدوں کی بارش مبارک ہو۔ غالبؔ نے ریزشِ سجدہ لکھ دیا تھا جو ایک موسم کی بارش تھی بعد میں ایسا زمانہ آیا کہ یہ مضمون مبتذل ہو کر رہ گیا آج کل کا ہر شاعر بے موسم کی بارشِ سجدہ کر رہا ہے اور یہ مضمون بعض خاص مضامین اور الفاظ مثلاً فضا بہاریں وغیرہ کا مرادف ہو گیا ہے کہ ہر فیشن پرست شاعر انھیں لکھنا طرۂ امتیاز سمجھتا ہے۔ حضرت ماہر القادری اسی قبیلہ کے لوگ ہیں انھوں نے ایک مضمون رسالہ شاہکار میں لکھا تھا جس میں وہ سب الفاظ جمع کر دیے تھے جن پر آج کل کے نااہلوں نے شاعری کا مدار قائم کر رکھا ہے۔ مگر یہ قبولیت عارضی ہے۔

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز

غریب نوازی کے لئے غریب کا وجود لازمی ہے اس لئے اگر تو نے میری پرسشِ حال کی تو کیا غضب ہو گیا اس پر اگر کوئی حسد کرتا ہے اور مجھ پر عنایات کرنے سے تجھے طعنے دیے جاتے ہیں تو یہ کوئی پرواہ کرنے کی بات نہیں۔ ع۔ ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔

اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

پہلے مصرعہ میں خبرِ مرگ ہے اور دوسرے میں ان کی صفتِ خاص بیان کر کے اس پر افسوس!

(۷۰)

مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

دامِ خالی چڑیاں پکڑنے کا پنجرہ جس کو دہلی کی زبان میں پھٹک کہتے ہیں۔ اسے کہیں دبکی اور کہیں ٹکی بھی بولتے ہیں یہ پنجرہ دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے ایک میں گرفتار شدہ جانوروں کو رکھتے ہیں اور دوسرا حصہ دام نئے پرندوں کو پکڑنے کے لئے خالی رہتا ہے جس میں گرفتار شدہ کی آواز اور دانے پر جانور آکر پھنس جاتے ہیں۔ صیاد نے قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس دام کو خالی رکھا جس سے اس کا قصدِ شکار ظاہر ہے۔ شاعر اپنے ذوقِ اسیری کو یہ دیکھ کر خوشخبری سناتا ہے کہ چلو منہ مانگی مراد ملی۔

جگرِ تشنۂ آزار ـ تسلی نہ ہوا
جوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس

خوں طبِ یونانی کی تحقیق کے مطابق جگر میں پیدا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں ہمارے تشنۂ آزار جگر کو حسرت تھی کہ اپنا سرمایۂ خوں دریا دلی کے ساتھ جراحتوں پر نثار کرے جس کے لئے ہم نے دشت وحشت میں ہر کانٹے کی جڑ کے پاس ایک خون کی ندی بہادی لیکن پھر بھی اس دریا دل حریص کی تسلی نہ ہوئی اور لذتِ آزار باقی کی باقی رہی۔ یعنی ہم نے دشت کے ہر کانٹے کو اپنے جسم میں پورا پیوست کیا اور خوب لذتِ آزار لی کہ ہر کانٹے کی جڑ میں خون کی ندی بہادی لیکن ہمارے جگر کی ہمت اور تشنۂ آزاری کو پھر بھی تسلی نہ ہوئی "تشنۂ آزار تسلی نہ ہوا" جو مصنف نے تشنۂ آزار کو تسلی نہ ہوئی کی جگہ لکھا ہے یہ تسلی نہ شد کا ترجمہ ہے لیکن گو غالب کے لئے درست ہو مگر اردو شاعری اس ترکیب کی متحمل نہیں۔

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

اسی مضمون کو پہلے یوں لکھ آئے ہیں۔

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت

میں بھی رک رک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

غم خوار کا رہ رہ کر نصیحت کرنا کند چھری سے بار بار حلال کرنے کے برابر ہے اس سے بہتر تو یہ تھا کہ ایک تیز سا بسولا اس کے پاس ہوتا جو مجھے مار دیتا اور میرا آسانی کے ساتھ کام ہو جاتا۔

دہنِ شیر میں جا بیٹھئے لیکن اے دل
نہ کھڑے ہوجیے خوبانِ دل آزار کے پاس

شیر کے منہ میں جا بیٹھنا اتنا خطرناک نہیں جتنا کہ خوبانِ دل آزار کے پاس دم بھر کھڑا رہنا۔ یعنی یہ کہ ان کی صحبت دنیا بھر کی مصیبتوں سے بدتر ہے ان کے پاس نہ کھڑا ہونا چاہیے بلکہ اُن سے دور بھاگنا چاہیے۔

دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

تیری دید کی خوشی سے ولولۂ شوق چمن میں ایسی بے اختیار قوت نامیہ پیدا کرتا ہے کہ پھول جو گوشۂ دستار میں لگانے کے لئے توڑے جاتے ہیں وہ شاخِ گل کی فوری نمو سے دم کے دم میں ترے گوشۂ دستار تک پہونچ جاتے ہیں۔ دوسری جگہ یوں لکھتے ہیں

سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما غالب
اگر گل سرو کی قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

غالبِ وحشی سر پھوڑ کر مر گیا ہائے اس کا وہ عالم جبکہ تیری دیوار کے پاس آ کر بیٹھا تھا جس سے کیفیاتِ وحشت و یاس کا تقاضا ظاہر ہو رہا تھا۔

(۷۱)

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگا دے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

آئینہ فولاد کے جوہر بلحاظ سبزی خس سے مشابہ ہیں۔ کہتے ہیں کہ معشوق کے

سبزۂ خط سے آئینہ کی خس جوہر کو تری پہونچتی رہتی ہے اس لئے کوئی حادثہ پیش نہیں آتا ورنہ معشوق کی آتشِ رخسار خانۂ آئینہ میں آگ لگا دیتی۔ "تری" یا "نمی" کے لئے لفظِ "تراوت" کا استعمال اب درست نہیں۔

فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِّ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خارِ آتش

خارِ شمع موم بتی کے دھاگے کو کہا۔ فروغِ حسن فروغِ شعلہ۔ عاشق شمعِ سوزاں۔ مطلب یہ کہ جس طرح کہ شمع کا دھاگہ جو اس کے پاؤں میں گھس کر سر تک پہونچ گیا ہے بغیر فروغِ شعلہ کے نکل نہیں سکتا۔ یعنی جب تک شعلہ شمع کو جلا کر ختم نہ کر دے رشتۂ شمع جو خار پا ہے نکل نہیں سکتا یعنی جب تک آگ نہ نکالے شمع کے پاؤں کا کانٹا نکلنا ممکن نہیں۔ اسی طرح عاشق کی مشکل کا حل فروغِ حسن سے ہوتا ہے یعنی صرف حسنِ ذات کے فروغ ہی سے جو آتشِ عشق کی صورت میں طالب پر مؤثر ہوتی ہے عاشقِ صادق کی مصیبت حل ہوتی ہے جو اسے خارِ حسرت سے چھڑاتا اور فنا فی الذات کے درجے تک پہونچاتا ہے۔

(۷۲)

جادۂ رہ۔ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

شام یوم الہلال کی کیفیت بیان کر رہا ہے جبکہ آفتاب مغرب میں غروب ہوتا ہے اور ہلال اس کے سامنے۔ شام کے وقت آفتاب کی شعاع نظارہ سوز نہیں ہوتی بلکہ بہت صاف نظر آتی ہے۔ اس کو بوقت رخصت جادۂ رہ قرار دیا ہے اور ماہِ نو کو فلک کا آغوشِ وداع ٹھہرایا ہے جو اس نے آفتاب کو مل کر رخصت کرنے کے لئے وا کیا۔ اس شعر میں کوئی شانِ تغزل نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی قصیدہ کی تشبیب کا شعر ہے۔

(۷۳)

رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیٔ شمع
ہوئی ہے آتشِ گل۔ آبِ زندگانیٔ شمع

آتشِ گل شعلۂ رخسار۔ زندگانیٔ شمع ضد شمع مردہ۔ کہتے ہیں معشوق کے شعلۂ رخسار سے شمع کا ہمیشہ چراغ جلتا ہے اس لئے یہ آتشِ گل ہی شمع کے لئے آبِ حیات ثابت ہوئی۔ حاصل یہ کہ جس بزم میں معشوق جلوہ گر ہو اور اس کے رخسار کی تابانی ہو وہاں شمع کا نہایت سہانا منظر ہوتا ہے گویا اس سے اس میں جان پڑ جاتی ہے۔ یا شمع سے مراد عاشق اور اس کا سوزِ عشق۔ مطلب یہ کہ شعلۂ رخسار سے عاشق کے سوزِ عشق کو آبِ زندگانی حاصل ہوتی ہے۔

زبانِ اہلِ زباں میں ہے۔ مرگ۔ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیٔ شمع

اہلِ زبان خاموشی کو مردہ کہتے ہیں اس کی تصدیق شمع کی زبانِ حال سے محفل میں ہو گئی کہ خاموشی واقعی موت ہے۔ یعنی شمع خاموش بھی مردہ کہلاتی ہے۔ اہلِ ایرانی بجھی ہوئی شمع کے لئے شمعِ خاموش اور شمعِ کشتہ کا استعمال کرتے ہیں۔ مصنف نے ان دونوں باتوں سے مضمون اختراع کیا ہے۔

کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ قصّہ تمام
بہ طرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیٔ شمع

اہلِ فنا اہل اللہ جو فنا فی الذات ہوں۔ فسانہ خوانی قصہ تمام کرنے کی لفظی مناسبت سے لائے۔ جس طرح عاشقِ الٰہی نورِ ذات سے لو لگا کر اپنا قصہ تمام کرتے ہیں اسی طرح شمع کی فسانہ خوانی بھی شعلہ کی ایمائے سے ہے گویا کہ وہ بھی بطرزِ اہلِ فنا اپنا قصہ تمام کر رہی ہے۔

(۹۵)

غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

اے شعلے تیرے لرزنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ شمع کو حسرتِ پروانہ کا غم ہے جس سے وہ ایسی ضعیف و ناتواں ہوگئی ہے کہ تجھے بھی نہیں سنبھال سکتی۔ یہاں اے شعلہ کا طرزِ بیان اگر اردو سمجھا جائے تو ہائے مختفی سے غلط ہوگا لیکن اے جس طرح اردو کا لفظ ہے فارسی کا بھی ہے اس لئے جہاں اے شعلہ فارسی کا صحیح طرزِ بیان ہوگا وہاں اردو ہوکر اے شعلہ بھی درست ہوگا کہ ترکیب فارسی موجود ہے میرے اس شعر پر ؎

(ناطق) پتہ تو کوچۂ گیسو سے لانا اب کے چکر میں
وہاں میرا دلِ گم گشتہ بھی اے شانہ آتا ہے

مولانا آسی لکھنوی نے "اے شانہ" کے لئے بھی اعتراض کیا تھا اور میں نے بھی جواب دے دیا لیکن یہ سوچ کر کہ دوسرا کون مجھ سے پوچھنے آئے گا اور میں کس کس کو جواب دے سکوں گا میں نے اپنے شعر کو غزل سے نکال دیا۔

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے
بہ جلوہ ریزیِ باد۔ و بہ پرفشانیِ شمع

اہتزاز کرنا یہ عالمِ سرور وجد میں آنا جنبش کرنا۔ یہاں روح کے خیال یار سے اہتزاز کرنے کو جلوہ ریزی باد و پرفشانیِ شمع سے تشبیہ دینا مقصود ہے کہ شعلہ شمع کی زندگی ہوا پر منحصر ہے۔ اگر اس کے ماحول میں ہوا نہ ہو تو شمع بجھ جاتی ہے۔ مصنف نے اس بات کو لفظِ قسم سے ادا کیا جس سے لطفِ بیان بہت بڑھ جاتا ہے۔ یہاں "بہ جلوہ" میں بہ قسمیہ ہے کہتے ہیں قسم ہے ہوا کی جلوہ ریزی کی اور قسم ہے پرفشانیِ شمع کی کہ تیری ہوائے خیال سے روح وجد میں آجاتی ہے۔ یہاں دوسرا مصرعہ پورا فارسی کا ہے اس لئے سب کچھ درست ورنہ اردو میں سوائے واللہ باللہ کے نہ بہ کا۔ برائے قسم استعمال ہے نہ واؤ کا۔ بلکہ ان دونوں میں بھی باللہ کو خواص ہی بولتے ہیں البتہ واللہ عام ہے۔

نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ
شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیِ شمع

گل خزانیِ شمع شمع کشتہ کا گل جو شمع کے لئے نشانِ خزاں ہے۔ شمع سے مراد داغِ غمِ عشق۔ کہتے ہیں داغِ غمِ عشق کے عالمِ نشاط کی بہار کا کیا پوچھنا جبکہ خود شگفتگی اس چراغ کے گل خزانی پر مرجاتی ہے۔ حاصل یہ کہ فسردگیِ عشق کا وہ عالم بہار ہے کہ تمام عالم کی شگفتگی اس پر نثار تو پھر اس غمِ عشق کی شگفتگی کی جو بہار ہو سکتی ہے اس کا عالم قابل بیان نہیں۔

جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ میرے داغِ بدگمانیِ شمع

میرے دل پر شمع کی بدگمانی کیوں نہ نقش ہو جائے کہ یہ مجھے دیکھ کر بالینِ یار پر جلی جاتی ہے۔ یا یہ کہ شمع مجھے دیکھ کر بالینِ یار پر جل رہی ہے گل ہونے اور ٹلنے کا نام نہیں لیتی جس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے بدگمان ہے اور مجھے یار کے ساتھ تنہا چھوڑنا نہیں چاہتی۔ اچھا یہ بات میرے دل پر نقش ہوگئی کبھی سمجھ لوں گا۔

(۷۴)

وہمِ رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش
مجبور۔ یاں تلک ہوئے۔ اے اختیار حیف

وداعِ ہوش بہ عالمِ مجبوری ہوتا ہے کہ کسی کو اس پر اختیار نہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ میرے ہوش بہ خوفِ افشارِ راز وداع نہیں کرتے حیف اے اختیار اب تو یہاں تک مجبوری آگئی کہ بے اختیاری بھی اپنی نہ رہی۔

(۷۴)

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف

اِن کا سانس تپِ عشق سے گرم ہو کر شعلہ باری کر رہا ہے مگر بد قسمتی سے نفس کی شعلہ باری میں جو حرارت ہے وہ خاطر خواہ نہیں اس لئے اسے نامکمل کہا اور اس پر دل جل رہا ہے کہ یہ کمبخت رہ رہ کر چرکے دیتی ہے ایک دم نہیں جلا دیتی۔ شاعر اسی پر افسوس! کرتا ہے کہ اگر ایک دم جل جاتا تو ہر سانس کی مصیبت سے نجات پاتا۔

(۷۵)

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

لڑکے دیوانے کو پتھر مارتے ہیں لیکن انھیں اس بات کی پرواہ کہاں کہ لگے ہاتھوں نمک بھی چھڑک دیں جس سے جراحت اور لطفِ جراحت حاصل ہو جائے اس لئے کہتے ہیں کہ اگر پتھر ہی میں نمک ہوتا تو بڑا مزہ ہوتا کہ دونوں کام ایک ساتھ ہو جاتے۔

گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

زخمِ دل کے لئے وجہ ناز اگر کوئی چیز ہے تو گردِ راہِ یار جیسی بے بہا جنس ہے ورنہ دنیا میں نمک تو کوئی نادر الوجود چیز نہیں جس پر فخر کیا جائے۔ نمک زخم کو پھاڑتا ہے اور ایذا و تکلیف کا فوری باعث ہوتا ہے لیکن اگر زخم میں مٹی بھر دی جائے تو اس سے تکلیف بڑھتی بھی ہے اور دیرپا بھی ہوتی ہے۔ یہ اپنے زخم میں گردِ راہِ یار بھرنا چاہتے ہیں کہ درد دیرپا و راحت فزا حاصل ہو جو میسر نہیں آتی نمک تو بہت ملتا ہے۔

مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہو جیو
نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

یہاں لف و نشر مرتب ہے۔ مجھ کو ارزانی رہے بلبل کا درد اور تجھکو مبارک ہو خندۂ گل کا نمک یعنی عشاقِ اہلِ درد کے لئے سامانِ درد مبارک ہو اور تجھ معشوقِ خندہ رو کے لئے خندۂ گل کی نمکینی۔ آج کل مبارک ہو لکھتے ہیں مبارک ہو جیو نہیں لکھا جاتا اور بولا بھی نہیں جاتا۔

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک

کنارِ آبجو آج کون سا ایسا معشوقِ گل اندام گرمِ جولاں تھا کہ جس کے حسد سے موجِ دریا زخمِ دریا بنی ہوئی تھی کہ جس میں پڑ کر گردِ ساحل نے نمک پاشی کا کام کیا۔ یعنی ان کا معشوق جو کنارِ آب جو گرمِ خرام تھا تو اس سے دریا کو ساحل پر حسد ہو رہا تھا اور اس عالمِ حسد میں موجِ دریا زخمِ دریا ہو رہی تھی جس پر گردِ ساحل جو اڑ کر پہونچی تو گویا اس نے ایک دشمن ہو کر نمک پاشی کا کام کیا۔

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توقیرِ درد
زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سر تا پا نمک

دہانِ زخم کو خنداں باندھتے ہیں۔ خندہ ظالم زخمِ دل مظلوم کے لئے سراسر نمک پاشی ہوتا ہے۔ کہتے ہیں لذتِ درد بڑھانے کے لئے مجھے نمک کا احسان اُٹھانے کی ضرورت نہیں جو غیر ہے کیونکہ میرا زخمِ خنداں خود خندۂ قاتل کے مانند سر تا پا نمک ہے کہ خندۂ زخمِ مظلوم کے لئے زخم کے درد انگیز ہونے کی علامت ہے جو ہنس ہنس کر خود نمک پاشی کرتا ہے یعنی تکلیف کو بڑھاتا ہے۔

(۹۷)

دادِ دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ
یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک

واہ واہ جہاں کہیں وہ نمک دیکھتا ہے میری یاد کرتا ہے اور میرے زخمِ جگر کی داد دیتا ہے۔ یا یہ کہ اس کا نمک دیکھ کر میرے زخمِ جگر کی یاد کرنا میرے لئے دادِ عشق ہے جس پر شاعر ناز کرتا ہے کہ میری واہ واہ ہو رہی ہے۔

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے
دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگیں ہیں اعضا نمک

افسوس! تم ایسی حالت میں عاشقِ مجروح کو چھوڑے جاتے ہو کہ ہنوز نہ دل کی زخموں سے سیری ہوئی ہے نہ اعضا کے زخموں کی نمک سے۔

یاد ہیں غالبؔ تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

عورتیں کہا کرتی ہیں کہ نمک نہ گراؤ ورنہ قیامت کے دن پلکوں سے چننا پڑیگا لیکن یہاں شعر کی یہ تخئیل نہیں۔ کہتے ہیں کہ غالبؔ تمہیں غلبۂ ذوقِ درد کے وہ دن بھی یاد ہیں جب نمک زخم سے گرتا تھا تو میں اسے پلکوں سے چن لیتا تھا۔ یعنی ایک وقت مجھ پر ایسا گزرا ہے کہ زخموں پر نمک پاشی سے مجھے بڑا ذوق تھا۔ اور میں نمک کی بڑی قدر کرتا تھا۔

(۷۶)

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

کسی مہم کا سر ہونا اس میں کامیاب ہو جانا۔ آہ کے لئے دودِ آہ بھی لکھا جاتا

ہے اور دھواں بوجہ پریشانی زلف سے مشابہ ہے۔ کہتے ہیں یہ صحیح ہے کہ اگر آہ کریں گے تو شاید اس کا اثر ہو جائے گا اور تیری زلف سر ہو جائے لیکن یہ معلوم ہے کہ آہ کو اثر کرنے کے لئے ایک عمر یعنی مدت دراز درکار ہے۔ مطلب یہ کہ آہ جب تک تیری زلف کو سر کرے گی یعنی تجھ پر اس کا اثر ہوگا اس وقت تک جیتا کون رہے گا۔ یہ تو ایک بڑے طولانی زمانے کی بات ہے۔

(ناطق) ہم کہاں ہوں گے دعاؤں میں اثر ہونے تک
کچھ نہ کچھ ہو تو رہے گا ہی مگر ہونے تک؟

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

ابرِ نیساں کا قطرہ جسے سواتی کا پانی کہتے ہیں صدف کے پیٹ میں چلا جائے تو خلیج فارس وغیرہ کے سمندروں میں موتی ہو جاتا ہے یہ قطرہ کو صدف کے پیٹ میں جانے کو گہر ہونے کی تمنا میں جاتا قرار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں دریا جہاں قطرہ گہر ہونے کو چلا ہے وہاں ہر موج کے جال میں سو نہنگوں کے حلق کا ایک ایک حلقہ موجود ہے دیکھئے اس غریب پر اپنے مقصد میں کامیاب ہونے تک کیا کیا گزرتی ہے حاصل یہ کہ طوفانِ حیات میں انسان کو انسان کامل ہونے تک لاکھوں مہلک مصائب کا سامنا ہے دیکھئے ان سے کیونکر جاں بر ہوتا ہے اور کیونکر گوہر نایاب بن کر نکلتا ہے۔

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

خونِ جگر ہونا کام تمام ہونا مر جانا۔ کہتے ہیں کہ عاشقی میں کار برآری کے لئے صبرِ غیر متعین کی ضرورت ہے یعنی ایک عمرِ طویل درکار ہے کہ نہ اتنے روز انسان جیے گا نہ مقصد برآری ہوگی اور ادھر تمنا نے بیتاب کر رکھا ہے ایسی حالت میں دل کے لئے جینے کو کیا صورتِ تسکین پیدا کروں اور کس شغل میں عمر گزاروں۔

(ناطق) کٹ جائے انتظارِ اجل ہی میں زندگی وہ دن کوئی بتلائے تو میں دن گنا کروں

(۷۶)

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

تم جو کہتے ہو کہ خبر پانے پر ہم تمہاری خبر ضرور لیں گے یہ بالکل درست لیکن تم کو خبر ہونا بھی ایک بڑی دور کی بات ہے جب تک تمہیں خبر ہو گی اس وقت تک تو کہیں ہمارا پتہ بھی نہ ہوگا۔

(ناطق)　تلاشِ گم گشتۂ محبت سُنا ہے مدنظر ہوئی ہے
یہاں تو کب کی خبر بھی آئی وہاں اب آکر خبر ہوئی ہے

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

پرتوِ خورشید کو جس میں شبنم جذب ہو جاتی ہے ۔ چشم عنایت سے تعبیر کیا۔ کہتے ہیں جس طرح پرتوِ خورشید سے شبنم فنا کی تعلیم پاتی ہے اسی طرح میں بھی تیری ایک نظرِ عنایت سے فنا کے درجے کو پہونچ جاؤں گا۔ مرشدِ کامل کی ایک نگاہ طالب کو فنا کے درجے تک پہونچانے کے لئے کافی ہے ۔ چنانچہ اس معاملہ میں حضرت خواجہ باقی باللہ صاحب اور دہلی کے ایک بھٹیارے کا قصہ مشہور ہے جسے انھوں نے ایک ہی نشست میں خود اپنے درجے تک پہونچا دیا تھا۔

(ناطق)　اے برقِ حسن اِک نگہہ گرم کے لئے
آتش بجان ہے دشت میں تنکا گیاہ کا

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے ایک رقصِ شرر ہونے تک

(ذوق)　ہنگامہ گرم ہستی ناپائیدار کا　چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

جس طرح کہ شمع بزمِ ماتم ہی نہیں بلکہ بزمِ عیش میں بھی یعنی دنیا کی دونوں حالتوں میں تڑکا ہونے تک جلتی ہے اور صرف کشتہ ہونے پر اس کا سوز جاتا ہے اسی طرح غمِ ہستی کا بھی انسان کے لئے موت کے سوا کوئی علاج نہیں۔ یعنی آدمی کو جیتے جی غمِ ہستی سے نجات نہیں مل سکتی۔ میں نے اپنی نظم پروانہ و شمع میں یہ شعر لکھا ہے

دل لگی کی بات ہے یہ بھی زمانے کے لئے
مجھ کو شادی میں بُلاتے ہیں جلانے کے لئے

(۷۷)

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

حقیقت حال تو یہ ہے کہ دعا قبول نہیں ہوتی لیکن اگر تو اس دھوکہ میں پڑا ہوا ہے کہ دعا قبول ہو جاتی ہے تو آئندہ کی مایوسی سے بچنے کے لئے تو صرف یہی ایک دعا مانگ کہ یا اللہ مجھے دلِ بے مدعا دے کیونکہ تجھے اپنی دعا قبول ہونے کا یقین ہے اور اس طرح جب دلِ بے مدعا کی دعا مانگے گا تو بے مدعا ہو جانا اپنے ہاتھ کی بات ہے تو سمجھے گا کہ دعا قبول ہوئی اور خود بے مدعا ہو جائے گا تو پھر دوسری دعا مانگنے کی ضرورت نہ رہے گی اور دوسری دعا نہ مانگے گا تو اجابت کا یقین باقی رہے گا اور عدمِ اجابت کا صدمہ نہ اُٹھانا پڑے گا۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

حسرتِ دل سببِ گنہ ہے اور سبب کے ذکر سے سبب کی طرف خیال ضرور رجوع ہوتا ہے اِس لئے یا اللہ تو اگر میرے گناہوں کا حساب کرے گا تو غضب ہو جائیگا کہ اس وقت مجھے وہ بھی ایک ایک حسرت یاد آجائے گی جس جس کے نہ نکلنے کا

داغ میرے دل پر ہے اور ہزاروں صدمے تازہ ہو جائیں گے۔ اسی مضمون کو آگے چل کر یوں لکھا ہے۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

(۷۸)

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

بلبل کے اس رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر پھول ہنستے ہیں کہ اس سادہ لوح کو وفائے گل کے فریب نے مٹا رکھا ہے اور وہ بھی کس قدر۔ اس سے پہلے مصرعہ ثانی کو اول لکھ کر دوسرا مصرعہ یوں لکھ آئے ہیں۔ ع
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل

ہوائے گل پھولوں کی ہوا جو خوشبو میں بسی ہوئی ہوتی ہے اور جس کو سونگنے کی آرزو کی جاتی ہے۔ شاعر اس فکر کو دام سے تعبیر کرتا ہے کہ قوت شامہ میں جا کر پھنسنا قیدِ نسیم ہے۔ مطلب یہ کہ نسیم کو آزادی مبارک ہو کہ ہر طرف ہوائے گل کے لئے جو جال بچھا تھا اس کے حلقے ٹوٹے پڑے ہیں۔ یعنی دنیا پر ایک عالمِ بے دلی طاری ہے کسی کو بوئے گل کا دماغ نہیں اس لئے اب نسیم کو قیدِ مشام سے آزاد پھرنا مبارک ہو۔

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

مر گیا فریفتہ ہو گیا نالہ سے اثر مقصود ہوتا ہے اور مطلوب کا کسی خوش آئند شئے دھوکے میں نالہ پر فریفتہ ہونا عاشق کی خوش نصیبی ہے موجِ رنگ کو نالۂ لب خونیں نوائے گل ٹھہرایا۔ کہتے ہیں کہ ہر کوئی نالۂ گل بر موجِ رنگ کے دھوکے میں فریفتہ ہو گیا۔ دوسرے مصرعہ کا بیان لفظِ " اے وائے " کے ساتھ حسرتاً ہے یعنی شاعر نالۂ گل پر سے اپنے نالۂ بے اثر پر تاسف کرتا ہے کہ وہ تو دنیا بھر کو موجِ رنگ کا دھوکہ دے کر فریفتہ کر گیا لیکن اپنا نالہ کچھ نہ ہوا اور کچھ نہ کر سکا۔ " سو " اب متروک ہے۔

خوش حال اس حریفِ سیہ مست کا کہ جو
رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بہ پائے گل

سایہ کا استعمال کسی شخص یا چیز کے ساتھ بیانِ قربت کے لئے ہوتا ہے کہا جاتا ہے کہ " فلاں شخص تو فلاں شخص کے ساتھ سایہ کی طرح لگا رہتا ہے۔" حریف سے مراد عاشق۔ کہتے ہیں زہے نصیب اُس حریفِ سیہ مست کے جو معشوق کے قدموں پر علی الدوام اس طرح سر رکھے ہوئے ہو جس طرح کہ سایۂ گل گل کے پاؤں پر۔

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار
میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل

بہار پھولوں کو تیرے گلے کا ہار یا ہم بستر ہونے کے لئے پیدا کرتی ہے اس لئے گلانِ عطر بیز اپنے دم سے میرے رقیب ثابت ہو رہے ہیں۔ پیدا کرنے کے لئے ایجاد کرنے کا لفظ ہر جگہ موزوں نہیں ہوتا چنانچہ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

اِن کی صراحی میں شراب نہیں اور شراب نہ ہونے سے سیرِ گل کا دولہ پیدا نہیں ہوتا اور یہ دونوں باتیں بہار اور بادِ بہار کی قدر کرنے کے لئے ضروری ہیں اس لئے مجھے شرمندگی رہتی ہے کہ ایک شراب نہ ہونے سے دل ٹوٹ گیا ہے اور

موسم بہار کی قدر نہیں کر سکتا۔ یا یہ کہ اس موسم میں میں اپنے لئے یہ دونوں شغل ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ایسا نہ کروں تو موسم بہار سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ دوسری جگہ لکھا ہے۔ ع۔ کیونکر نہ کھایئے کہ ہوا ہے بہار کی۔

سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

سطوت دبدبہ۔ ان کے معشوق کا حسن غیور ہے کہ وہ اپنی خودداری میں دوسرے کو شامل نہیں ہونے دیتا اور اس کے مقابلے میں رنگِ ادائے گل کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس لئے اس کا اثر میری نگاہ میں پھول کی رنگینی اور رنائی کا خون کر رہا ہے۔ یعنی اس کو اس سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گل درقفائے گل

ایک گل جو دوسرے گل کے بعد عالمِ وجود میں آتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ معدوم کو موجود سے تیرے جلوہ کا دھوکا ہوتا ہے۔ یعنی پھول ملکِ عدم سے گل ہائے موجودات کو جب دیکھتے ہیں تو انھیں اس طرف تیرے جلوہ کا دھوکا ہوتا ہے اور عدم سے وجود میں آتے ہیں جو سلسلہ کہ اب تک جاری ہے بعض نسخوں میں گل درقفائے گل کی جگہ بلبل قفائے گل ہے اس طرح شعر بہت صاف ہے شرح کی ضرورت نہیں۔

غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گل جیبِ قبائے گل

ہم آغوشی آرزو آرزوئے ہم آغوشی۔ گل نے اپنے گریبان کا پھول بنالیا یعنی دل میں جگہ دی۔ کہتے ہیں میں اس معشوق کی آرزو رکھتا ہوں جو شاہدِ شاہداں ہے۔

(۷۹)

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

شمع اتنی ہی دیر تک روشن رکھی جاتی ہے جب تک قیامِ بزم رہے۔ کہتے ہیں ہمارے بزمِ ماتم خانہ میں جو شمع روشن کی جاتی ہے وہ برق ہوتی ہے کیونکہ آزادوں کو دم بھر سے زیادہ غم نہیں ہوتا جس مدت کے لئے بجلی کی ایک چمک کافی ہے یعنی ہمارا ماتم خانہ کسی غم میں اتنی ہی دیر رہتا ہے جتنی دیر کہ بجلی کی ایک چمک کیونکہ ہم آزادگانِ غمِ ہستی کو غمِ دنیا زیادہ دیر تک ستا نہیں سکتا۔

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بت خانہ ہم

خیال ارادہ ذات۔ اِنَّمَا اَمْرُہٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ـــــ یک بت خانہ بیانِ تخصیص یعنی بت خانۂ وجود جس میں اشکال وہمی کو حقیقت سمجھکر ان سے وابستگی رکھی جاتی ہے جو پرستشِ باطل یعنی بت پرستی سے کم نہیں مصنف کہتے ہیں ؎

کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم کر دیا کافرِ اصنامِ خیالی نے مجھے

ہم موجوداتِ عالم۔ مطلب یہ کہ خیال کا گنجفہ باز یعنی ذات واجب محفلوں کو قائم اور برہم کرتا رہتا ہے اس لئے ہم کیا ہیں نیرنگیِ بت خانۂ خلق کی ورق گردانی اسی مضمون کا ایک شعر پہلے لکھ آئے ہیں۔

ذرہ ذرہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلےٰ آشنا

اُف رے بنانے والے کی جلدی مٹانے میں
لاگت ہی جیسے کچھ نہیں لگتی بنانے میں (ناطق)

(۱۵۱)

باوجودیک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

یک جہانِ ہنگامہ جوشِ ہنگامہ ۔ پیدائی ظہور ۔ چراغانِ شبستانِ دل شعاعِ امید ۔ خصوصیتِ پروانہ مناسبت چراغاں سے بھی ہے نیز اس لئے کہ یہ اہلِ تمنا میں سب سے زیادہ بے حقیقت ہستی ہے ۔ مطلب یہ کہ باایں ہمہ ہنگامۂ ہستی ہماری نمود ایسی بے حقیقت ہے جیسی کہ دلِ عاشق اور وہ بھی پروانہ کی شعاعِ امید ۔ حاصل یہ کہ ہنگامہ ہستی عکس ہے نورِ ذات کا حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں ۔

ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمّتِ مردانہ ہم

تکیہ گاہ ہمت مردانہ کیا ہے قناعت اور جب ہماری ترکِ جستجو بربنائے ناتوانی ہے کہ ہوس ہنوز باقی ہے تو ہمارا وجود تکیہ گاہِ ہمت مردانہ کے لئے وبال ہوا کہ یہاں تو قناعت کی ضرورت ہے نہ ناتوانی کی ۔

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

ہم اپنے سینۂ پرخوں کو قید خانہ سمجھتے ہیں کیونکہ وہ لاکھوں تمنائیں جن کے نکلنے کی امید نہیں اس میں دائم الحبس ہیں ۔

(۸۰)

بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر
متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

دلبستگی کو بلحاظِ پابندی خانۂ زنجیر سے تعبیر کیا ۔ مطلب یہ کہ خانۂ زنجیر سے

حاصل ہونے والی پونجی سوائے صدائے زنجیر کے کچھ نہیں جیسے نالۂ زنجیر کہتے ہیں اسی طرح اگر تو دلبستگی کا نتیجہ چاہتا ہے تو نالہ کر ۔ حاصل یہ کہ عالم کے ساتھ دلبستگی رکھنے کا نتیجہ سوائے سوز و شغب اور ہنگامہ کے کچھ نہیں ۔

(۸۱)

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

(ناطق) لینے والے نہ تھے غربت کی اجل پر نہ سہی ملنے والا تو وہاں کوئی دلِ زار نہ تھا
یہ عالم بیکسی اگر وطن میں مرتے تو بڑی ہنسی ہوتی لوگ نام رکھتے اچھا ہوا کہ عالمِ غربت میں مر گئے کوئی ہنسی اڑانے والا نہ ہوا ۔

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجو میرے دعویِٔ وارستگی کی شرم

مرغِ دل کے لئے اس کی زلفوں کا جال بچھا ہوا ہے یا اللہ اس وقت میرے آزادی کے دعوی کی شرم رکھنا کہیں دل اس بلا میں نہ جا پھنسے ۔

(۸۲)

لوں وام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش ولے
غالبؔ یہ بیم ہے کہ کہاں سے ادا کروں

وام قرض ۔ بیم خوف ۔ کہتے ہیں کہ اس بے خوابی کے عالم میں جہاں میرے نام کی نیند اڑ گئی ہے میں اپنی سوتی ہوئی قسمت سے ایک میٹھی نیند قرض لے لیتا لیکن ڈر ہے کہ اگر لوں تو پھر دوں گا کہاں سے کیونکہ میرے نام کی تو یہ نعمت

ہے ہی نہیں۔

(۸۳)

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

اس پوری غزل میں شاعر اپنے زمانۂ مایوسی کو بیان کرتا ہے یا ایامِ جوانی پر بہ عالم پیری تاسف ہے۔ کہتے ہیں وہ دن ہی چلے گئے جب فراق فراق اور وصل وصل تھا اب تو یہ عالم ہے کہ نہ اضطرابِ شوق ہے نہ لطفِ ملاقات۔

(داغ) جب جوانی کا مزا جاتا رہا زندگانی کا مزا جاتا رہا

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

(حسن دہلوی) دل ہی نہ رہا امید کیسی جڑ کٹ گئی نخلِ آرزو کی

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خط و خال کہاں

(داغ) چمن سے تھی محبت لیکن اب یہ بد دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

تھی وہ اِک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

ایک شخص جو ہمارا شاہد رعنا تھا اس کے تصور کی بدولت خیال میں بھی رعنائی تھی لیکن اب جب مسبب ہی نہ رہا تو سبب کہاں سے رہتا۔

(ناطق) نگاہِ بے محابا اے بلائے دورِ محرومی
کہیں گم گشتہ ناوک بھی کلیجے میں اُترتے ہیں

ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

حال بمعنی طاقت۔ کہتے ہیں نہ جگر میں حال باقی ہے نہ دل میں قوت پھر اب لہو کیا روئے یہ تو بڑے دل گردے کا کام ہے۔

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

عشق کے جوئے خانے میں سیر بازی کے لئے کس برتے پر جائیں یہاں تو درہم داغ ہے نہ سودائے زلف نہ جنسِ دل وغیرہ وغیرہ۔

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

کہاں مجھ سا آزاد منش اور کہاں فکرِ دنیا یا اللہ یہ کیا وبال ہے جس میں ناچار سر کھپا رہا ہوں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

غلبۂ پیری ہے تمام قوئ جسمانی مضمحل ہو گئے اے غالب اب وہ عالمِ جوانی کا اعتدالِ عناصر کہاں۔

(۸۴)

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

تم نے جو ہم سے وفا کی تو ایک اچھا کام کیا اور خود کا اچھا ہونا ثابت کیا اب جو

غیر اس کو جفا کہتے ہیں تو بکا کریں تم اس کی پرواہ نہ کرو کیونکہ یہ بات ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے کہ دنیا اچھوں کو بُرا کہا کرتی ہے۔

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

خدا جانے وہاں جا کر کیا کہیں اور کیا منہ سے نکلے۔ یا دیکھیے وہ سُن کر کیا کہتے ہیں سیدھا جواب ملتا ہے یا اُلٹا۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مَے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

جو لوگ کہ مَے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں وہ پرانے خیالات کے آدمی ہیں ان کے منہ نہ لگو کیونکہ غم و اندوہ ان سے زائل نہیں ہوتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مصیبت تو الگ رہی خیر اندوہ و مصیبت بھی چڑھے ہوئے نشہ کو اُتار دیتی ہے۔ یا یہ کہ یہ دونوں چیزیں انسان کی مصیبت میں اضافہ کر دیتی ہیں اور بربادی تک پہونچا دیتی ہیں ان کے فوری سرور پر نہ جاؤ اور مآل پر نظر کرو۔

دل میں آ جائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

جب مجھے غش سے فرصت ہوتی ہے تو نالہ دل میں آ موجود ہوتا ہے یعنی نالے کا خیال پیدا ہوتا ہے بس یہی اس کی رسائی ہے رسائی اس کے سوا اور کس چیز کا نام ہے۔ الغرض ہم ناکامِ تمنا بہ عالمِ ناتوانی یہ بھی نہیں جانتے کہ دل میں آ پہونچنے کے سوا نالے کی رسائی کی اور بھی کوئی شکل ہوتی ہے۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

چونکہ بہ ظاہر قبلہ کی طرف منہ کر کے سجدہ کیا جاتا ہے اس سے یہ خیال قائم ہو گیا ہے کہ قبلے کو سجدہ ہوتا ہے۔ قبلہ اول جہات میں ہے اور چونکہ ہمارا مسجود سرحدِ ادراک سے اُس طرف ہے اور حدِ ادراک سے دور ہے اس لئے یہ قبلہ جس کی طرف ہم سجدہ کرتے ہیں وہ قبلہ نہیں جس کی طرف سجدہ کرنا مقصود ہے بلکہ قبلہ نما ہے کیونکہ سجدہ تعین جہت چاہتا ہے جو قبلے سے کر لی گئی ہے اگر نعوذ باللہ قبلہ مسمار بھی ہو جائے تو ہم اسی کو سجدہ کرتے رہیں گے جیسے کرتے ہیں اس لئے اہلِ نظر کے نزدیک قبلے کی حقیقت قبلہ نما سے زیادہ نہیں۔

پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
خارِ رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں

مہر گیا موہنی بوٹی اس کے متعلق عقیدہ ہے کہ پاس رکھنے سے تسخیر کے لئے مفید ہوتی ہے۔ کہتے ہیں جب سے کہ ہمارے پاؤں کو دیکھ کر تجھے رحم آیا ہے اس وقت سے ہم تری راہ کے کانٹوں کو جنھیں چبھا ہوا دیکھ کر تجھے رحم آیا اور مہربان ہوا مہر گیا کہنے لگے ہیں۔

اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائیگا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

دل میں ایک شررِ سوزاں کی موجودگی پر جو ہم ہوا کے خواستگار ہیں اس سے یہ مطلب نہیں کہ اُسے بجھا دینا چاہتے ہیں کیونکہ یہ ذرا سی چنگاری تو گھبرانے کی چیز نہیں بلکہ اس خواہش سے ہماری غرض یہ ہے کہ چنگاری کو ہوا لگ کر آگ بھڑک اُٹھے۔ آگ جلانے کے لئے دھونکی جاتی ہے۔

دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

کسی کی کسی بات پر نامِ خدا کہنا ماشاءاللہ یا سبحان اللہ کا استعمال کرنا یعنی توصیف۔ کہتے ہیں معشوق کی ہر بات پر جو ہم نامِ خدا کہتے ہیں اس سے دن بدن

اس کا غرور اور گھمنڈ بڑھتا جا رہا ہے دیکھئے بالآخر ہمارا یہ کہنا اور اس کی نخوت کا بڑھنا کیا رنگ لائے اور ہم پر کیسی مصیبت آجائے۔

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مرگیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

وحشت اور شیفتہ کا مرثیہ کہنا بر بنائے شیفتگی و آشفتہ نوائی ہے ورنہ ان حضرات سے مصنف کی کوئی خصوصیت نہیں دونوں صاحب مومن خاں کے شاگرد تھے اور اچھا کہنے والے نواب شیفتہ میرٹھ کے ایک مشہور شاعر اور رئیس تھے جن کے پوتے نواب محمد اسمٰعیل خاں گو شاعر نہیں لیکن اپنی سیاسی کارگزاریوں کے لئے تمام ہندوستان میں مشہور ہیں۔ قدردانِ سخن تھے اور میرے کرم فرما۔ کہویں اب کہیں نہیں بولتے کہیں کہتے ہیں۔

(۸۵)

آبرو کیا خاک اُس گل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگ پیراہن جو دامن میں نہیں

یہ خیال شاعر عالمِ وجود میں بے آبروئی ننگِ وجود ہے۔ اور یہ عالمِ جنوں گریباں کا پھٹ کر دامن تک آجانا اپنے مقام پر ہوتا ہے۔ کہتے ہیں جس طرح پھول کا باغ سے جدا ہونا اس کی بے آبروئی کا سبب ہے اسی طرح دیوانگانِ عشق کے لئے گریباں کا دامن تک نہ پہونچنا بے آبروئی ہے جو اُسے ننگِ پیراہن ثابت کرتا ہے۔

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

آنکھوں سے ٹپک کر جو خون دامن میں آیا ہے اس کی مقدار بہت کم ہونے کی

کی وجہ سے گریہ کی متقاضی ہو کہ خوں باری کیجئے یہ اس کا جواب دے رہے ہیں کہ جو دامن میں نہیں آیا وہ خون ضعف کی وجہ سے رنگ ہو کر اڑ گیا جس کا ثبوت رنگ پریدہ ہے اور چہرے پر مردنی چھائی ہوئی ہے۔ اس لئے یہ کہتے ہیں کہ اب میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں تقاضائے گریہ کیونکر پورا ہو تن کا استعمالِ مفرد اب نہیں۔

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہ آفتاب
ذرے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

روزنِ دیوار سے گزرنے والی شعاعِ مہر میں بکثرت ذرات نظر آتے یہ اُن کی نسبت کہتے ہیں کہ روزنِ دیوارِ یار کے ذرات اصل میں نہیں بلکہ نگاہ آفتاب کے اجزا نظارۂ جمال کے لئے جمع ہو گئے ہیں یعنی آفتاب عالمتاب بھی نہایت بیتابی کے ساتھ انھیں روزنِ دیوار سے جھانک رہا ہے۔

کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

گہری تاریکی میں ذرا سی روشنی بھی بہت معلوم ہوتی ہے جگنو کی تاب کوئی روشنی نہیں لیکن برسات کی اندھیری راتیں یہی بہت غنیمت اور سہانی معلوم ہوتی ہے۔ شاعر اپنے زندانِ غم کے اندھیرے کے اندھیر کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کے روزن میں رکھی ہوئی روئی کا گالا سفیدائے صبح کا عالم دکھا رہا ہے اسی مضمون کا ایک شعر اور لکھا ہے ؎

بیاں کیونکر ہو ظلمت گستری اپنے شبستاں کی (غالب)
شبِ مہ ہو جو رکھدیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

خانۂ خودی کو ویران کرنے والے عشق کی ہستی انجمنِ ہستی کی رونق ہے اگر اس برقِ سوزاں کا وجود محفلِ موجودات میں نہ ہو تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اہلِ دین

کا عقیدہ ہے کہ دنیا اہلِ باطن سے چلتی ہے۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

دشمن ظاہر بیں میرے زخم سلوانے پر چارہ جوئی کا طعنہ دیتا ہے اس بیوقوف کو کیا معلوم کہ زخم سوزن میں بھی لذت درد ہے بیں تو زخم سلوانے کے بہانے سے زخم سوزن سے لذتِ درد حاصل کر رہا ہوں۔

(ناطق) درد کی لذت ہے فکرِ چارہ سازی کا سبب
زخم منہ پھاڑے ہوئے بیٹھے ہیں سوزن کیلئے

بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

چونکہ ہم ایک بہارِ ناز کے کشتہ ہیں اس لئے ہمارے مدفن کی گرد بھی جلوۂ گل ہے اسی مضمون کا ایک شعر پہلے لکھ آئے ہیں۔

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کس قدر یا رب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

میں وہ سراپا ذوقِ درد ہوں کہ میرے خون کا ہر قطرہ جسم کے اندر ایک نئے ناسور کا مادہ ہے یعنی میرا ہر قطرۂ خوں ناسور ہونے کے لئے آمادہ ہے اور میرے تمام جسم میں ایک ذوقِ درد بھرا ہوا ہے۔

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگِ مینا کی گردن میں نہیں

موج اور رگ میں مماثلت صوری ہے۔ کہتے ہیں کہ ساقی کو اپنے میخانے کی

کثرتِ بادہ پر جو گھمنڈ تھا اسے مری قلزم آشامی نے مٹا دیا کہ میری کثرتِ مے نوشی کی بدولت اب کسی طرف بھی گردنِ مینا میں شرابِ احمر موجیں مارتی ہوئی نظر نہیں آتی یعنی مجھ بلانوش نے سب پی کر صاف کر دی۔ اب ساقی کس برتے پر نخوت کرے گا۔

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود؟
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

ناتوانی غریب کس طرف سے سر نکالے فشارِ غم نے تو میرے جسم کو اس طرح شکنجہ میں کسا ہے کہ اب اس میں قد کے جھکنے کی بھی گنجائش نہیں رہی۔

(ناطق) ہوا جاتا ہے بے بس اضطرابِ خاطرِ محزوں
کشاکش ہائے زورِ ناتوانی دیکھتے جاؤ

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

تکلف لازمہ ہے قدر و شان کا۔ مشتِ خس جب تک گلخن میں پہونچ کر فنا نہ ہوا اس کے لئے بے قدری لازمی ہے۔ شاعر اپنے بے حقیقت حال کی مثال مشتِ خس سے دے کر کہتا ہے کہ غربت میں بے قدری کی کیا شکایت کروں آخر وطن ہی میں میری کون سی عزت تھی یہاں تو قسمت میں جیتے جی یہی لکھا ہے اس لئے مجھے تا بہ مرگ ناقدری کا گلا نہیں۔ اس مضمون کو ذرا بچا کر یوں لکھ آئے ہیں۔

(غالب) فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

(۸۶)

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا
گر اِک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں

ادائے معشوق کی تعریف یہ ہے کہ عاشق کی جان لیوا ہو اس تخیّل کو ادا کرنے کے لئے سب سے بڑا لفظ قضا ہے لیکن قضا ایک ہی ہوتی ہے یعنی انسان ایک مرتبہ مرتا ہے اور وہاں ادائیں لاکھوں اب اس کے ناز کی تعریف کا حق کیونکر ادا ہو کیونکہ اگر ایک ادا ہوتی تو اسے اپنی قضا کہہ کر چھوٹ جاتا۔

حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ برائے دل
ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں

معشوق کے حلقہ ہائے زلف برائے دل بری دل کی طرف چشم ہائے کشادہ ہیں جن کا ہر تارِ نگہِ سرمہ سا کی شان رکھتا ہے جو دل کے اڑانے کی فکر میں ہیں۔

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

فریادی کے طرف خیال نہ کئے جانے کو کہتے ہیں شنوائی نہیں شاعر نے اسی معنی میں یہاں نہ شنیدن کا استعمال کیا ہے یعنی میں تو لاکھوں نوا ہائے دلخراش سے گلہ پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا ہوں لیکن تیرے وہاں وہ لاپرواہی ہے کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ لفظ نہ شنیدن یعنی مصدر کا استعمال اس طرح بلا ترکیب فارسی مستحسن نہیں۔ اس نشنید پر یاس عظیم آبادی نے اسے لالہ بھیروں پرشاد کا شعر کہا تھا اور میں نے رسالہ "خیال" ہاپوڑ میں جواب بھی دیا تھا مگر بس وہ جواب ہی تھا۔

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بیوفا کہوں

تیری نسبت میرا کیا گمان ہے یہ پوچھ کر جو تو چاہتا ہے کہ مجھے شرمندہ کرے ظالم ایسا نہ کر کیونکہ خدا نہ کرے کہ میں اور تجھے اپنے منہ سے بے وفا کہوں حالاں کہ کمبخت گمان یہی ہے۔ "منفعل نہ چاہ" "منفعل مخواہ" کا تو ضرور ترجمہ ہے لیکن یہ اردو کا درست طرزِ بیان نہیں۔

(۸۷)

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

میرا آپ کے یہاں سے یا آپ کی بزم سے نکل کر چلا جانا وقت کا ہاتھ سے نکل جانا نہیں جس کے لئے مایوس ہو جاؤ۔ ابھی میں تو ہاں جی کا چاکر ہوں جب بلا لوگے حاضر ہو جاؤں گا۔

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں

میں لاکھ بہ عالمِ ضعف سر اُٹھانے کے قابل نہیں اس پر بھی اغیار کے سبک سری طعنہ آمیز باتوں کو برداشت کر سکتا ہوں ان کا کوئی گلا نہیں اور ان کی کوئی پرواہ نہیں۔

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

زہر میرے لئے کوئی ایسی بری اور ناگوار چیز نہیں جیسے تیرے ملنے کی قسم کہ کھا ہی نہیں

سکتا یہ تو مجھے آج مل جائے تو کھا لوں لیکن کیا کروں ملتا ہی نہیں۔

(۸۸)

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

اگر آپ خود ہی بہ بہانۂ مے نوشی ہم سے حجاب کو نہ اُٹھائیں گے تو پھر مجبوراً ہمیں کو کسی دن بہ عذرِ نشہ بے تکلفی اختیار کرنا پڑے گا۔

غرّۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

(سعدی) مَنہ دل بریں دیرِ ناپائیدار
ز سعدی ہمی یک سخن یاد دار

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

فاقہ مستی کی بدولت یقین تھا کہ ٹکے ادا نہ ہو سکیں گے اس لئے قرض کی پیتے وقت ہم سمجھتے تھے کہ اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ کلاری کے ہاں فضیحت ہونا پڑے گا اب جو ایسا وقت آ گیا تو کچھ اندیشے کی بات نہیں یہ تو ہم پہلے سوچے بیٹھے تھے۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

نغمہ بہ عالمِ سرور ہوتا ہے لیکن یہاں شاعر نے غم کے لئے استعمال کیا جو سازِ ہستی کی مناسبت سے ہے۔ نغمۂ غم سے مراد مرثیہ یا اسی قسم کی نظم یا نالہ سمجھئے۔ کہتے بہر حال حیات کو موت پر فطرتِ انسانی ترجیح دیتی ہے اور دیکھا گیا ہے کہ بدترین

مصیبت یا مرض میں بھی انسان کے لئے موت کا خیال تکلیف دہ ہوتا ہے اکثر مصیبت زدہ لوگ مزاج پرسی کے جواب میں کہتے ہیں "شکر ہے زندہ ہیں" اسی خیال کو مصنف نے یہاں نظم کیا ہے۔

(ناطقؔ) نوائے سازِ ہستی نالۂ پیہم سے پیدا ہے
ابھی تارِ نفس پر چل رہی ہیں انگلیاں میری

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

ہماری دست درازی نے اس سراپا ناز کو ایک دن خلافِ عادت ہاتھ چلانے پر مجبور کر دیا اب جو اس نے ہماری کافی مرمت کر دی تو اس کا گلا کیا کریں بعض لوگ اسے غالبؔ کا بدترین شعر کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "معشوق پر پیش دستی کرنا چہ معنی دارد" اس کے دو جواب ہو سکتے ہیں اول تو یہ کہ لفظِ "پیش دستی" کے معنی مار پیٹ ہی کے نہیں۔ "پیش دستی" چھیڑ چھاڑ کو بھی کہتے ہیں جو معشوقوں کے ساتھ عام طور پر کی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ہم نے انھیں کچھ چھیڑا اور انھوں نے ہماری پٹائی کر دی۔ یا یہ باوجود سراپا ناز کے بیان عام ہوگا جو معشوق سے قطع نظر ہر ایک کے لئے استعمال ہو سکتا ہے اور شعر میں پست خیالی باقی نہیں رہتی۔

(۸۹)

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اِک چھیڑ ہے وگرنہ مُراد امتحاں نہیں

ہم پر جفا کرنا ان کی ایک چھیڑ یا دلگی ہے امتحاناً نہیں کیونکہ اس کا تو انھیں یقین ہے کہ یہ کسی طرح ترکِ وفا نہ کرے گا۔

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

وہ لطفِ خاص سے میری مزاج پرسی فرماتے ہیں یعنی میرے ساتھ مراعات کرتے ہیں کس طرح ان کی اس خاموش عنایت کا شکریہ ادا کیا جائے۔

(سعدی) میانِ عاشق و معشوق رمزیست کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

ستمگر کو ہم برائے ستم عزیز ہیں تو اب وہ باایں ہمہ ستم اگر ہم پر مہرباں نہ سمجھا جائے تو نامہرباں بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ خود ہمیں اس کے ستم عزیز ہیں۔

بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

ہمیں ایک لطف صحبت درکار ہے جس کی طلب بوسۂ دہن سے کی گئی تم دہن کے عدم کا عذر پیش کرتے ہو تو اچھا ہم وہی لطف گالیوں سے حاصل کر لیں گے تمہیں زبان کے لئے تو یہ بہانا نہیں ہو سکتا۔ یا یہ کہ سوال بوسہ پر خاموش کیوں ہو یہ نہیں منظور نہیں تو چڑ کر گالی ہی دو۔ ہم سمجھ لیں گے کہ دہن معدوم ہے اس لئے بوسۂ دہن نہ دے سکے تو اس کی تلافی ذوق دشنام سے کر دی گئی۔

(داغ) سو ہاتھ کی زباں ہے تری گو دہاں نہیں
میں وہ غریب ہوں مرے منہ میں زباں نہیں

معشوق کے دہن کو معدوم ماننا اصطلاحِ شاعری ہے۔

ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے
ہر چند پشت گرمیِ تاب و تواں نہیں

پشت گرمی مدد ہمت۔ پڑھئے اگلے شعر کے ساتھ۔

جاں۔ مطرب ترانۂ ہل من مزید ہے
لب پر وہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

مطربِ ترانہ گیت گانے والا۔ پردہ سنج باجہ بجانے والا۔ دونوں شعروں کا مطلب یہ ہے کہ باوجودیکہ اس کی گرمیِ عتاب جان کو گھلائے ڈالتی ہے اور تاب و تواں ہمیں ذرا ہمت نہیں دلاتے تو بھی لبوں سے الاماں کی آواز نہیں نکلتی یعنی ہم امن طلبی نہیں کرتے بلکہ "جاں مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے" ہل من مزید دوزخ کی وہ آواز جو قیامت کے روز جب گنہگار اور پتھر اس میں ڈالے جائیں گے تو وہ اور مانگتا ہوا پکارے گا کہ ہل من مزید یعنی ابھی بھوک نہیں بھری یا سیری نہیں ہوئی اور لاؤ یا اور کچھ ہو تو لاؤ۔

خنجر سے سینہ چیر اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

اگر تیغ عشق سے تیرا دل دو ٹکڑے نہیں اور خون جگر سے پلکیں خونچکاں نہ ہوں تو ایسے ناکارہ سینہ کو چیر اور دل کو پھاڑ ڈال یعنی دردِ عشق کے بغیر زندگی بیکار ہے اس سے چھری مار کر مر جانا بہتر۔

ہے ننگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

آذر فشاں آتش فشاں۔ یہ شعر ما سبق والے تخیل کی دوسری شکل ہے۔ اور دونوں شعر مل کر قطعہ بھی۔

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

سو گز زمیں ایک دس گز لانبا اور دس گز چوڑا مختصر قطعہ۔ کہتے ہیں بیاباں نوردی جنوں میں خانہ ویرانی کا خیال عبث ہے کیونکہ گھر کی سو گز زمین کے بدلے میں اتنا

بڑا صحرائے لق و دق جو جنون کی جاگیر ہے دیوانہ کو کچھ مہنگا نہیں پڑتا۔

کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں
گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

بتوں کو جو عمر بھر سجدے کرتا رہا ہوں ان کا نشان میری پیشانی پر موجود ہے جو مشاغل کا پتہ دے رہا ہے اب مجھ سے کیا پوچھتے ہو میری سرنوشت میں کیا لکھا ہے۔

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

روح القدس حضرت جبرئیل علیہ السلام جو مقرب ترین ملائکہ ہیں عیسائی انہیں تثلیث کا ایک رکن قرار دے کر ہولی گھوسٹ کہتے ہیں جو روح القدس کا ترجمہ ہے۔ انسانِ کامل بہ نسبت ملائکہ کے ذاتِ باری سے اقرب ہے۔ خیر البشر کی ذاتِ واجب کے ساتھ ایک ایسی شان ہے جس میں کوئی مقرب فرشتہ بھی برابری نہیں کر سکتا۔

(مولانا روم) گفتۂ او گفتۂ اللہ بود — گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اسی پر شاعر بنیادِ خیال قائم کر کے کہتا ہے کہ اگرچہ روح القدس میرا ہمزباں تو نہیں تاہم اس سے مجھے کچھ اپنے کلام کی داد ملتی ہے کیونکہ اسرارِ ذات کو انسان کے بعد سب سے زیادہ وہی پہچاننے والا ہے۔

جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

بہا قیمت۔ ابھی تو غالب زندہ ہے اس لئے معشوق یہ بات نہیں بتاتا کہ بوسہ کی قیمت جان ہے جب نیم جاں ہو جائے گا تو اس وقت ترسانے کے لئے کہے گا کہ بوسہ کی قیمت جان ہے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ غالب نیم جاں اس وقت پوری جان کا مالک نہ ہونے کے صدمہ سے پھڑ پھڑا کر مر جائے گا اور بوسہ سے محروم رہے گا۔

(۹۰)

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

جب مجھ دشت نورد کے پاؤں میں چھلّے دار زنجیر بھی ایک چکر بن کر رہتی ہے تو پھر کون سی تدبیر مانعِ دشت نوردی ہوگی۔

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

تصویر کا ذکر بیانِ حیرت کے لئے آتا ہے نگاہِ حیرت وہ بھی دیدۂ تصویر کی یعنی حیرت در حیرت اور چونکہ دیدۂ تصویر میں بینائی نہیں اس لئے تارِ نگہ معدوم تو جادہ بھی معدوم۔ کہتے ہیں میرا شوق اس دشتِ حیرت در حیرت میں دوڑاتا پھر رہا ہے جس میں راستہ کا کہیں پتہ نہیں۔

حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

وفا نام ہے جاں دہی کا اس لئے اس کے راستے کا جادہ تلوار کی دھار ہوئی جو ایک وار میں کام تمام کر دیتی ہے اور انسان امتحانِ وفا میں پورا اتر جاتا ہے لیکن چونکہ تلوار کے گھاٹ آدمی دم بھر میں پار اتر جاتا ہے اس لئے افسوس اظہار کرتے ہیں کہ عاشقی میں راہِ وفا پر چلنے سے لذتِ آزار کی حسرت رہی جاتی ہے جو مر مر کر یا چرکے کھا کھا کر جینے سے حاصل ہوتی ہے۔

(ناطق) آرزو رہ گئی مر مر کے جیا کرنے کی
اے فلک میں ابھی مرجانے کو تیار نہ تھا

(۱۵)

رنج نومیدیِ جاوید گوارا رہیو
خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

زبونی کش ذلت بردار یہاں اسے بمعنی ممنونِ احسان ہونا استعمال کیا کیونکہ کسی کا احسان اُٹھانا ایک ذلت ہے۔

(جلال) جس نے جو احسان کیا اِک بوجھ مجھ پر رکھدیا
سر سے تنکا کیا اُتارا سر پہ چھپّر رکھدیا

کہتے ہیں اگر نالہ تاثیر کا احسان مند ہونا نہیں چاہتا تو میں بھی خوش ہوں کیونکہ اس طرح اسے ناکامیِ جاوید کی تکلیف برداشت کرنا ہوگا یا یہ کہ مجھے ہمیشہ کی ناامیدی کا رنج گوارا ہے اور میں اِس خودداری سے خوش ہوں اگر نالہ تاثیر سے عاجزی کرنا نہیں چاہتا کیونکہ عاجزی اور التجا سے ذلت کی شان پیدا ہوتی ہے جس سے محرومیِ جاوید ہزار درجہ بہتر ہے۔

سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہوجائے
لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں

جب کسی سے ایسی حرکت سرزد ہو جس کے لئے اسے مارنا ضروری ہوجائے تو کہا کرتے ہیں کہ تیرا سر کھجا رہا ہے یا جسم کھجا رہا ہے یعنی یہ کہ تو مار کھانا چاہتا ہے۔ کہتے ہیں جب زخمِ سر اچھا ہوجاتا ہے تو خود سر کی کھجلی سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ پھر پتھر کھانے کی حسرت ہے اور اسے اس کا مزا یاد آگیا۔ زخم جب بھرتا ہے تو اس میں خارش ہوتی ہے یا یہ کہ لذتِ سنگ کیا بیان کروں کہ جب زخم اچھا ہوتا ہے تو سر خود بخود کھجانے لگتا ہے یعنی اسے پتھر کی خواہش ہوتی ہے۔

جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

خجلتِ تقصیر سے یہاں مراد تقصیر کرلینے کے بعد والی خجلت نہیں بلکہ تقصیر کرنے سے

جھجکنا اور شرمانا مراد ہے۔ کہتے ہیں اس وقت قصور کرنے سے شرمانے کے برابر کوئی قصور نہیں جب معشوق کی نگہ کرم یا اس کا کرم بیباکی اور گستاخی کی اجازت دے۔

(ناطق) مبارک حجلۂ خلوت میں ان سے لطف کی باتیں
مبارک مست کو حدِ ادب سے بڑھ کے بڑھ جانا

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

(ناسخ) شبہ ناسخ نہیں کچھ میر کی اُستادی میں
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

مراد میر تقی میر سے ہے جو ہر زمانے اور ہر طبقے میں اردو کے مسلم الثبوت شاعر اور استاد مانے گئے ہیں۔ میر کا خاندان اس وقت گلاوٹھی میں ہی پایا جاتا ہے یہ لوگ جامع مسجد کے عقب میں آباد ہیں مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ کب یہ لوگ یہاں آکر آباد ہوئے اور میر سے ان کے اجداد کی کیا نسبت تھی۔

(۹۱)

مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

مردمک آنکھ کی پتلی جو پتلی بلحاظ سیاہی کے سویدائے دل سے مشابہ ہے نگاہیں بلحاظ خطوطِ نظر مشابہ ہیں نفس آہ سے۔ یہ بلحاظِ نارسائی آہوں اور نگاہوں کو ایک بتا رہے ہیں یعنی جس طرح کہ نارسا آہیں سویدائے دل کے لئے بار ہیں اسی طرح سویدائے دلِ چشم کے لئے نارسا نگاہیں۔ ایک [illegible]

(مخفی) کور بہ چشمے کہ لذت گیرِ دیدارے نہ شد
کندہ باد آں دست کاندر گردنِ یارے نہ شد

(۱۱۱)

(۹۲)

برشگالِ دیدۂ عاشق ہے دیکھا چاہیے
کھِل گئی مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن

دیکھا چاہیے کو یہاں انھوں نے بمعنی دیکھیے استعمال کیا ہے یا بمعنی دیکھنا چاہیے حالانکہ لفظ دیکھا چاہیے کا استعمال اس معنی میں نہیں ہوتا اردو میں بیشتر یہ لفظ مستقبل کے لئے بیانِ شک میں ہوتا ہے جس طرح کہیں کہ "دیکھا چاہیے" یہ کام ہوتا ہے یا نہیں۔ کہتے ہیں دیکھیے یہ برشگالِ دیدۂ عاشق کہ پھول کی طرح سے دیوارِ چمن خود سو جگہ سے کھِل گئی یعنی یہ کہ برشگال دیدۂ عاشق کا اثر تباہ کن ہوتا ہے۔ یا شاید انھوں نے اس خیال سے بھی لکھا ہو کہ موسمِ برشگال کا تو صرف یہی اثر ہوتا ہے کہ پھول کھِلتے ہیں لیکن برشگالِ دیدۂ عاشق سے دیوارِ چمن تک پھول کی طرح کھِل جاتی ہے۔

الفتِ گل سے عبث ہے دعویٰ وارستگی
سرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

سرو آزاد بھی گرفتارِ چمن ہے اس سے ثابت ہوا کہ الفتِ گل سے کوئی آزاد نہیں ایسا دعویٰ کرنا غلط یعنی یہ کہ حسن پسندی سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔ اللّٰہ جمیلٌ و یحب الجمال۔

(داغ) سرو آیا چمنِ دہر میں شمشاد آیا
بندۂ قیدِ بتاں بن کے ہر آزاد آیا

---

(۹۳)

عشق تاثیر سے نومید نہیں
جاں سپاری شجرِ بید نہیں

جاں سپاری جاں سپردن سے ہے جس کے معنی جان دہی کے ہوتے ہیں مگر انھوں نے یہاں اس لفظ کو اس مفہوم میں استعمال کیا ہے جس میں شعرا جاں نثاری کو استعمال کرتے ہیں۔ کہتے ہیں جاں نثاری کوئی بید کا درخت نہیں جس سے پھل کی امید نہ ہو بلکہ یہ تو نخلِ وفا ہے جسے کبھی نہ کبھی ضرور بار آور ہونا چاہیے قرآن میں آتا ہے اللہ بھلائی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا اس لئے عشق تاثیر سے نومید نہیں۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ یہاں سپاری کا بھی استعارہ ہے میں نے کہا ہوگا۔

سلطنت دست بدست آئی ہے
جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

جام اور خاتم کے ساتھ جمشید کی خصوصیت ہے جس میں جام تو سامانِ عیش ہے جس پر جمشید کا سکہ نہیں اور خاتم اس کی مہر جو اسی کے نام سے ہوئی۔ سلطنت وجہ عیش۔ جامِ مے سامانِ عیش۔ کہتے ہیں کہ سامانِ عیش کو نگین و نام کی طرح کسی کے ساتھ خصوصیت نہیں یہ تو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جانیوالا مال ہے۔

(ناطق) اے بادہ کش گئی ہے مے عیش کس کے ساتھ
ہر اک نے لے کے جام کو آگے بڑھا دیا

ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

ذرات اگر نظر آتے ہیں تو صرف اُسی شعاعِ خورشید کی بدولت جو روزنِ دیوار سے پار ہو ورنہ نہیں نظر آتے یہ ذرات کے پرتوِ خورشید کی بدولت نظر آنے کو ذرات کے لئے سامانِ وجود ٹھہراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نورِ ذات کی تجلی کائنات کے لئے اسی طرح سامانِ وجود ہے جس طرح کہ ذرے کی نمود کے لئے پرتوِ خورشید یعنی ہمہ از اوست۔

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

جان دینے میں اور کوئی تو بھید کی بات نہیں ہمیں صرف اس کا ڈر ہے کہ خودکشی کی وجہ سے جہاں میں کہیں رازِ معشوق نہ افشا ہو جائے جسے بہر حال چھپانا چاہتے ہیں۔ یہاں جس طرح مصنف نے لفظ بھید استعمال کیا ہے یہ طرزِ کلام زیادہ موزوں نہیں۔ شاید انھوں نے راز اور افشا کی مناسبت سے اس قافیہ کو یوں استعمال کر دیا۔

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیِ جاوید نہیں

انسان کو اگر محرومیِ جاوید نصیب ہو تو یہ کچھ غم کی بات نہیں کیونکہ بوجہ لطفِ عیش سے نا آشنا ہونے کے اس کی پرواہ بھی نہ ہوگی مثل مشہور ہے کہ "ساون سوکھے نہ بھادوں ہرے" البتہ ڈر کا معاملہ راحت کے بعد مصیبت ہے کہ اس حالت میں زندگی وبالِ جاں ہو جاتی ہے دیکھو اس شعر کی شرح ؎

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
مدام کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

ہمیں اتنی بھی اُمید نہیں جس کے سہارے جی سکیں۔

(ناطق)
مرنے سے فائدہ کیا جینے سے کیا نتیجہ
ہم کیا کریں گے مر کر ہم کیا کریں گے جی کر

(۹۴)

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

سبز قدم کے خیال کو شاعر خیابانِ ارم تک ترقی دے رہا ہے۔ حضرت موسیٰ اور فرعون کے قصے میں لکھا ہوا ہے کہ جب حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لیکر مصر سے نکل رہے تھے اور حضرت جبرئیل ایک گھوڑے پر سوار ان کی رہبری کرتے تھے تو جس جگہ حضرت جبرئیل کے گھوڑے کا سُم پڑتا تھا وہاں فوراً گھاس نکل آتی تھی گویا راستہ بھر گھاس کی چھوٹی چھوٹی کیاریاں بن گئی تھیں۔ اس نقشِ قدم کی تاثیر حیات کو دیکھ کر سامری نے مٹھی بھر مٹی اُٹھالی تھی اور اسی مٹی کے اثر سے اس کا سونے کا بنا ہوا بچھڑا جب مٹی اس کے منہ میں ڈال دی گئی تو رمبھانے لگا تھا۔ کہتے ہیں جس راستے میں تیرے نقشِ قدم نظر آتے ہیں وہاں جنت کی کیاریاں ہی کیاریاں نظر آتی ہیں یعنی تیرا ہر نقشِ قدم ایک خیابانِ ارم ہے۔

دل آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے
سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

خالِ کنجِ دہانِ دلبر کے عاشق اپنے سویدائے دل میں جو عکس ہے خال کا سیرِ عدم دیکھتے ہیں کیونکہ کنجِ دہن معدوم ہے اور سویدائے دل اس کے خال کا ہم شبیہ ہو کر سیرگاہِ عدم بنا ہوا ہے۔

۱۱۵

ترے سروِ قامت سے اِک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

تیرا سروِ قامت قیامت سے قدِ آدم نکلتا ہوا ہے کیونکہ فتنۂ قیامت مجسم نہیں۔

تماشہ کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

اے آئینہ کے نظارہ میں محو ہو جانے والے ذرا لگے ہاتھوں اس چشمِ تمنا کا بھی تو تماشہ دیکھ لے جس نے ہمیں تصویرِ حیرت بنا رکھا ہے تماشہ کر تماشہ کن کا ترجمہ ہے جو اردو کا درست طرزِ بیان نہیں۔

سراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے
کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

تف گرمی۔ گرمیِ نالہ سے دل میں پڑنے والے داغ کو نالہ دوشیں کا نقشِ قدم اور اس کا پتہ بنایا ہے۔ کہتے ہیں داغِ دل سے گرمیٔ نالۂ شب کا پتہ لے کیونکہ رات کو گزر جانے والے کا سراغ صبح کے وقت اس کے نقشِ قدم سے لگایا جاتا ہے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

انھوں نے فقیروں کا بھیس بنایا ہے کسی نے پوچھا کیوں اس کا جواب ہے کہ ہم نے اہلِ کرم کا تماشا دیکھنے کے لئے یہ روپ بھرا ہے۔

۹۵

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

ایمان کی بات یہ ہے کہ مجھے عذابِ جہنم میں راحت ملتی ہے کیونکہ افروختگیِ نارِ معشوق کی آتش مزاجی سے ملتی ہوئی ہے جس پر میں شیدا ہوں اور اس کا انداز نارِ جہنم میں ہونا میرے لئے باعثِ راحت ہے یا نارِ جہنم بہ شانِ التہاب خوئے یار سے ملتی یعنی حاصل ہوتی ہے کہ یہ خداوندِ جبار کا مقامِ غضب ہے تو اب میرے لئے کفر کی بات ہو گی اگر اس کی ایک صفت سے راحت نہ حاصل کروں۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تخیلِ شعر میں ایک شبِ ہجر کی طوالت ہزاروں سال کی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں میں خرابِ خانۂ دنیا میں کب سے ہوں اس کا حساب کیا بتاؤں کیونکہ اگر فرقت کی راتوں کا بھی شمار میری زندگی میں لگا لیا جائے تو لاکھوں برس کا زمانہ ہو جاتا ہے ؎

کیا کیا درازیِ شبِ غم جاں نواز ہے
عاشق کی عمر خضر سے بھی کچھ دراز ہے

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

اس لئے کہ پھر عمر بھر مجھے عالمِ انتظار ہے جس میں عاشق کو نیند حرام ہو جاتی ہے انھوں نے یہ چال کی کہ خواب میں جو آئے تو آنے کا پختہ وعدہ کر گئے اس طرح

مجھے نیند سے چونکا کر بے خوابیِ دوام کے حوالے کر دیا۔

قاصد کے آتے آتے خط اِک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

میں ان کی حیلہ جوئی سے خوب واقف ہوں اور جانتا ہوں جو عذرات نامۂ شوق کے جواب میں پیش کئے جائیں گے اس لئے ایسا کیوں کروں کہ قاصد کے آنے کے بعد خط پڑھوں اور اس کا جواب لکھوں اتنی دیر رائگاں جائے گی اس لئے قاصد کے آتے آتے جواب الجواب لکھ رکھتا ہوں کہ قاصد کے آتے ہی پھر واپس کر دوں۔

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

ان کی بزم میں آج یہ نئی بات کیسی کہ مجھ تک دورِ جام آیا کہیں ساقی نے شراب میں زہر تو نہیں ملا دیا۔

جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

میں دوست کے متعلق یہ بدگمانی کیوں کروں کہ وہ دشمن کے فریبِ وفا میں آگیا ہے یا آجائے گا کیونکہ جب وہ خود وفا ہی کا قائل نہیں تو پھر وفاداری کا دھوکہ اس پر کیا چلے گا۔

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

پہلا مصرعہ استفہام انکاری ہے۔ کہتے ہیں وصل میں میرے اضطرابِ شوق کو دیکھ کر وہم نے تمھیں کس پیچ و تاب میں ڈال دیا اجی گھبراتے کیوں ہو میں خوفِ آمدِ رقیب سے مضطرب نہیں وہ یہاں کیا کھا کر آئے گا۔

(داغ) اضطرابِ شوق کا عالم کہوں کیا اس گھڑی
جب کسی کافر کے وا بندِ قبا ہونے لگے

مولانا شوکت میرٹھی نے جہاں غالبؔ کے ساتھ اور بہت سی ناانصافیاں کی ہیں وہاں اس شعر کے متعلق بھی آپ فرماتے ہیں کہ غالبؔ نے یہ غزل جس مشاعرے میں پڑھی اس میں امام بخش صاحب صہبائی بھی تشریف رکھتے تھے جنھوں نے مشاعرے کے بعد مصنف سے پوچھا کہ "تم نے اس شعر پر کیا معنی پہنائے ہیں" تو غالبؔ نے جواب دیا کہ "مولانا آپ ان باتوں کو کیا جانیں نہ کسی کے عاشق بنے نہ معشوق میں نے تو اس میں اپنا ایک واقعہ نظم کیا ہے کہ ایک خانگی سے مجھے رابطہ ہو گیا تھا اسے کسی بہانے ڈھب پر چڑھایا مگر آمدِ رقیب کے خوف سے شہوت غائب ہو گئی اس نے خیال کیا کہ غالبؔ نامرد ہے میں نے اس کے دفعیہ کے لئے یہ شعر پڑھا۔ بہت ممکن ہے کہ ایسا ہوا ہو اور مصنف نے اپنی حاضر جوابی اور شوخ طبعی کی بنا پر مولانا صہبائی کو یہ جواب دے دیا مگر اس سے شعر پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ اس شعر کا یہ زیادہ موزوں مطلب ہو گا کہ معشوق کو وصل میں خوفِ رقیب ہے وہ گھبرا رہا ہے کہ کہیں آنہ جائے اس کی تسلی کے لئے کہتے ہیں کہ تمھیں اس وہم نے کسی پیچ و تاب میں ڈال۔ کھا ہے جس سے میں پریشان ہو رہا ہوں (یہاں اس کا گزر کہاں)۔

میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ تھا کہ مجھے حظِّ وصل حاصل ہو ورنہ کہاں میں اور کہاں وہ اور چونکہ یہ ایک نعمتِ غیر مترقبہ مل گئی تھی اس لئے فرطِ اضطراب میں ایسا بھولا کہ معشوق کو جاں بھی نذر نہ دی حالانکہ یہ اُس کا نذرانہ تھا۔

تیوری چڑھی ہوئی ہے جو اندر نقاب کے
ہے اِک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

طرفِ نقاب کی پڑی ہوئی شکن نقاب کے اندر چڑھی ہوئی تیوری کا پتہ دیتی ہے

یعنی حجابات ظاہری سے اندازِ لطف و قہر آشکارا ہیں۔

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

معشوق کا انداز کے ساتھ نگاہ چرانا ہزاروں لگاؤ کے برابر ہے اور اس کا غصے میں بگڑنا ہزاروں بناؤ کی شان پیدا کرتا ہے ؎

(راسخ) عجب جوبن برستا ہے کسی سے جب وہ لڑتے ہیں
ادائیں بھی بلائیں لیتی ہیں جس دم بگڑتے ہیں

قطعہ

وہ نالہ دل میں خس کی برابر جگہ نہ پائے
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں
وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو شراب میں

انتہائے بدقسمتی کا بیان ہے کہ ایسے ایسے حربے ہوں اور یوں لوہا لوٹ جائے۔

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

گو پہلا جوشِ مے پرستی نہیں رہا لیکن پھر بھی گاہے ماہے موقع محل کو دیکھ کر سنتِ رندی ادا کر دیتا ہوں۔

---

(۹۶)

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

آج بایں خیال ترک مے نوشی نہ کر کہ یہاں پینے والے کو فردائے قیامت میں محرومی ہو گی کیونکہ ایسا خیال ساقیِ کوثر کی شان میں بدظنی ہو گی جن کی ذات پاک رحمۃ للعٰلمین ہے۔ اور جن کے کرم سے عاصیوں کو مایوسی نہیں ہونا چاہیے۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

کل یعنی روزِ ازل میں معلم الملکوت نے جس کا شمار فرشتوں میں تھا خود کو ہم سے اچھا کہا تھا تو اسے راندۂ درگاہ کر دیا گیا پھر آج یہ کیا غضب ہے کہ وہی ہم شیطان کے تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں اور ذلیل ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ شیطان انسان کے جسم میں حلول کر کے اسی طرح دورہ کرتا ہے جس طرح کہ خون۔ یا یہ کہ شیطان کو طعنہ دیتے ہیں کہ آج یہ کس کرتوت کا نتیجہ ہے کہ ہماری ذلیل ترین حالت تک نوبت پہونچ گئی اور ہم پتھروں اور جانوروں کی پرستش کر رہے ہیں حالانکہ کل تک تو ہمارے اندر خلیفۃ اللہ ہونے کی ایسی شان موجود تھی کہ فرشتہ بھی ہماری جناب میں گستاخی نہیں کر سکتا تھا اور فرشتوں کو ہمارے متعلق اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کا سوکھا جواب ملا تھا۔

(ناطق) یہ بنارِ دیر نگاہ کر یہ نہیں حقیقتِ بندگی
جو بیانِ اہلِ مجاز ہے تو ہمیں بتوں کے خدا ہوئے

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

ایک اہلِ باطن بن کر تعجب کرتے ہیں کہ اگر آلاتِ موسیقی میں وہی جاں بخش آواز سمائی ہوئی ہے تو پھر اہلِ دل بوقت سماع مرغ بسمل کی طرح کیوں تڑپنے لگتے ہیں۔

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

(ناطق) سمندِ عمر رواں پر مدار کیا غافل
چلے چلے نہ چلے یہ کسی کے بس میں نہیں

(عزیز) کہاں لے جا رہی ہے کیا کہوں عمرِ رواں میری
وہیں منزل سمجھ لو سانس رک جائے جہاں میری

جو گھوڑا اپنے بس کا نہیں اور جس کی لگام اپنے ہاتھ میں نہیں جس کو ایڑ مارنے کا مقدور نہ ہو وہ کہاں جا کر تھمے گا یہ کون کہہ سکتا ہے۔

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

انسان کے لئے اس کی حقیقت فنا فی الذات ہو جانا ہے چنانچہ پہلے لکھ آئے ہیں۔ ؏

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا

اس مقام پر پہونچنے کے بعد غیر اور غیریت کا خیال باقی نہیں رہتا جس قدر اس مقام سے دور ہو گا اسی قدر اوہامِ غیر پریشان کرتے رہیں گے اور اپنی حقیقت سے دور رہے گا۔

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

حیرت کرتے ہیں کہ جب تمام عالم بوجود واحد موجود ہے تو پھر نظارہ کیا یعنی کیا کہئے کہ کس نے دیکھا کس کو دیکھا اور کیونکر دیکھا۔

(ناطق) بیانِ بیخودی ہے نظم ناطق کہا کس نے کہا کیونکر کہا کیا

یہ ذکر اُن سے دلِ درد آشنا کیا وفا کیسی وفا کس کی وفا کیا

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

جس طرح قطرہ و موج اور حباب کا فرق محض اعتباری ہے ورنہ یہ کوئی مستقل ہستیاں نہیں بلکہ ایک وجودِ بحر ان مختلف صورتوں پر مشتمل ہے اسی طرح یہ عالم کثرت بھی صرف وجودِ وحدت کے لئے ہے اور بس۔ موجودات کا فرق محض اعتباری ہے ورنہ اس کی کوئی اصلیت نہیں۔

(اسیر) خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی

(ناطق) چلی جاتی ہے لیکن دیکھئے یہ چال دنیا کی
جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے

شرم اِک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

یہ عالمِ حجاب گو ان کی بے حجابی خود اپنی ہی ذات سے سہی تو بھی بڑی بے حجابی کی بات ہے کیونکہ وہ ادائے ناز جس کا نام شرم ہے اپنے ساتھ بے حجاب ہونے میں بھی باقی نہیں رہتی حدیثِ نبوی کے مطابق حیا کا بہترین درجہ یہ ہے کہ انسان خود اپنے نفس سے بھی حیا کرے۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

نقاب حجابِ کثرت آئینہ عالمِ وجود جس میں عکسِ ذات موجود ہے آرائشِ جمال کثرت آرائی وحدت۔ کہتے ہیں پروردگارِ عالم گو روزِ ازل سے عالم آرائی میں مشغول ہے جو فی الحقیقت آرائشِ ذات ہے تو بھی اب تک اس کا جی نہیں بھرا اور ہر وقت عالمِ وجود میں محو ہے جس کے اندر نت نئی گلکاریاں کرتا رہتا

ہے۔ یا یہ کہ نقاب کی نوبت عروسانِ دہر کو آرائش کامل کے بعد آتی ہے یہ کہتے ہیں کہ سنور چکے گھونگھٹ نکال کر بیٹھ گئے پھر بھی ان کا دل خود آرائی سے نہیں بھرتا اور نقاب میں آئینہ رکھ کر فکر آرائش میں محو ہیں۔ یا یہ شعر اپنے ماسبق شعر کے ساتھ مل کر قطعہ ہوگا یعنی ان کی بے حجابی کس قدر بڑھ گئی کہ حالتِ حجاب یہ ہے کہ دم بھر آرائشِ جمال سے فرصت نہیں ملتی اور ہر وقت آئینہ کے ساتھ نظر بازیاں ہوتی رہتی ہیں حالانکہ شرم ایک ایسی ادائے خاص ہے کہ انسان کو ہر حالت میں اس کا پاس چاہئے چاہے اپنی ذات ہی سے معاملہ کیوں نہ ہو۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

کوئی شخص سو رہا ہے اور سوتے ہوئے یہ خواب دیکھتا ہے کہ میں سو کر اٹھا تو فی الحقیقت وہ بیدار نہیں بلکہ سو ہی رہا ہے اور خواب میں ہے اسی طرح ہم نے جس حالت کا نام شہود رکھا ہے وہ غیب غیب ہے کیونکہ عالمِ ذات حسیات سے ورار الورا ہے اس لئے اگر انسان کسی منزل شہود پر پہونچ جائے تو وہ یہ نہ سمجھے کہ تکمیلِ منزل ہوگئی بلکہ ہنوز منزل دور ہی سمجھے اور مدارجِ تصوف میں کہیں دھوکہ کھا کر رک نہ جائے۔

غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

بوتراب سے بوئے دوست آتی ہے اس سے پتہ چلا کہ وہ ندیم دوست ہیں اس لئے یہ معلوم کرکے کہ ان کا طریقۂ بندگی ندیم حق بنانے والا ہے میں بھی انھیں کی پیروی کرتا ہوں یعنی میرے طرزِ عبادت یا ریاضت میں علوی نسبت ہے۔

---

(۹۷)

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

زمانۂ جاہلیت میں اہلِ عرب کسی کا ماتم کرنے کے لئے کرائے کے رونے والے بھی بلا لیتے تھے ہندوستان میں بھی یہ رسم پہلے تھی اور اب تک مارواڑ میں موجود ہے۔ کہتے ہیں اتنی مقدرت نہیں کہ ایک نوحہ گر کو ساتھ رکھ کریں اور وہ دونوں کا فرض ماتم ادا کر دیں اس لئے اب حیران ہوں کہ میں تنہا اس عالمِ پریشانی میں دل کو روتا پھروں کہ جگر کو کیونکہ دونوں کا ماتم تنہا مجھ سے نہیں ہو سکتا اور تنہا ماتم کرنے میں رسوائی ہے کہ اہلِ عالم بے بضاعتی کا طعنہ دیں گے۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

مجھے رشک اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کے سامنے تیرے گھر کا نام لوں اور پتہ پوچھنا ضروری ہے اس لئے سب سے یہی پوچھتا ہوں کہ کدھر جاؤں اور خیال یہ ہے کہ ہزاروں میں کوئی آدمی تو تیرے گھر جانے کے لئے کہے گا بس جو ایسا کہے گا اسی سے پتہ پوچھ لوں گا۔ "کدھر کو جاؤں" کا استعمال اب تک دہلی اور اس کے نواح میں موجود ہے لیکن زبانِ اردو کا عام استعمال آج کل ایسے موقع پر "کدھر جاؤں" ہوگا۔

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ ترے رہگزر کو میں

اس بات کا علم میرے لئے غضب ہوگیا کہ کوچۂ رقیب تیرا رہگزر ہے کیوں کہ تہِ درویش بہ جانِ درویش مجھے اس بری جگہ کے تیرے لئے ہزار چکر لگانے پڑے۔

118

ہے کیا جو کس کے باندھئے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

شعرا معشوق کی کمر کو معدوم باندھتے ہیں اور کسی مہم کے لئے کمر بستہ ہونے کا بھی استعمال ہے۔ معشوق کے لئے بہ عالمِ ناز کی ظلم کرنا یا قتل عاشق بھی ایک مہم ہے کہتے ہیں تمہاری قتل کی دھمکی سے میری بلا ڈرے کیونکہ میں تمہاری کمر کی حالت خوب جانتا ہوں وہاں رکھا ہی کیا ہے جو باندھو گے اور کمر ہی نہ باندھ سکو گے تو قتل کی مہم کیونکر سر کرو گے۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

جن پر میں نے اپنا نام و ننگ سب کچھ قربان کر دیا تو اب وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے اگر یہ بات معلوم ہوتی کہ انھیں بے التفاتی کے لئے میرا یہ فعل ایک بہانہ ہو جائے گا تو میں گھر کو نہ لٹاتا۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اِک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

نیا مسافر ہوں راہبر کی پہچان نہیں قطع منزل کی جلدی ہے اس لئے ہر ایک تیز رو کے ساتھ تھوڑی دور چلتا ہوں اور جب کوئی اس سے زیادہ تیز رو مل جاتا ہے تو پہلے کو چھوڑ کر دوسرے کے ساتھ ہو لیتا ہوں۔ یا یہ کہ جویائے راہِ حق ہوں رہبرِ کامل کی پہچان نہیں اس لئے جس کسی کو سرگرمِ سعی دیکھتا ہوں اسی کو پیروی کرنے لگتا ہوں۔

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اُس بُتِ بیداد گر کو میں

اس بتِ بیداد گر سے جو میرا طرزِ عرضِ نیاز ہے اِس کو احمقوں نے پرستش سمجھ لیا

ہے اب اس کا کیا علاج۔

پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

پہلے تو یہ ہوا کہ میں کوئے یار میں خود کو بھول آیا اور پھر بے خودی میں راہِ کوئے یار بھی بھول گیا اب وہاں اپنی خبر کو کیونکر پہونچوں۔

(ناطق) ڈھونڈھتا پھرتا ہوں خود کو اُف رے از خود رفتگی
بھول آئی ہے کہیں میری بد اوسانی مجھے

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دِل پذیر متاعِ ہنر کو میں

میں سمجھتا ہوں کہ جنسِ ہنر مرغوبِ خلائق ہے کیونکہ خود میں اسے پسند کرتا ہوں اور یہ حسن ظن ہے کہ سب کو اپنے جیسا سمجھتا ہوں یہ ناقدر دانیِ اہلِ دہر پر طعنہ ہے۔

غالبؔ خدا کرے کہ سوارِ خدنگِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

ممدوح کے لئے دعا کرتے ہیں کہ وہ شاہدِ مقصود پر قادر ہو۔

(۹۸)

ذکر میرا بہ بدی بھی انھیں منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

غیر جو میری بدگوئی کرتا ہے اس سے کچھ بعید نہیں کہ اس کی بنی بنائی بات بگڑ جائے کیونکہ معشوق تو میرے نام ہی سے چڑھتا ہے اسے کسی طرح میرا ذکر سننا گوارا نہیں بس ایسا سمجھئے کہ بعض لوگ کریلے کے نام سے چڑھتے ہیں اور اگر ان کے سامنے کریلے کی برائی بھی اس کا نام لے کر کی جائے تو اُس آدمی سے ناراض ہو جا

ہیں جو ایسا ذکر کرے۔

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق
مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

(غالب) ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل
تماشائے بہ خوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

(ولہ) انھیں منظور اپنے زخمیوں کو دیکھ آنا تھا
اٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھیے شوخی بہانے کی

مصنف نے اپنے اس مجموعہ میں کئی مضامین کو بار بار لکھا ہے۔

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

لوگ جو کہتے ہیں کہ عالم ہے یہ ہمیں منظور نہیں کیونکہ ہستیِ عالم شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے اور معشوق کی کمر کا وجود اصطلاحِ شعر میں موہوم ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ وجودِ ذات میں عالمِ وجود کی ہستی ایک خیالِ موہوم سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

بحرِ حقیقت سے جو قطرہ ہمارے ظرفِ عالی کو ملا ہے وہ بھی ایک دریائے حقیقت ہے لیکن ہم کو منصور کی طرح تنک ظرفی دکھانا منظور نہیں جو ذرا سے میں اُبل پڑا اور انا الحق پکارنے لگا۔

حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی
عشقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

پُر عربدہ۔ جنگجو۔ گوں لائق۔ کہتے ہیں اب جسم میں بحالتِ رنجوری عشق کی ہنگامہ مستی کے لائق پہلے والی طاقت باقی نہیں رہی اس لئے خرابی اور بربادی

کی تمنا سے اظہارِ افسوس! کرتے ہیں یعنی شوریدگیِ عشق میں طاقت نے جواب دیدیا اور بربادی کی حسرت رہ گئی۔ لفظ "گوں" کا جس طرح مصنف نے استعمال کیا ہے اردو اب اس کی متحمل نہیں۔

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمھیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

یعنی حور ہی ایک ایسا معشوق ہے جو عبادت کرنے یعنی آسانی سے مل سکتا ہے ہمیں تو تم قیامت میں بھی حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ ہم جزائے عمل نہیں۔

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل میں کسی طرح سے معذور نہیں

اگر تو مجھ پر مہربانی کرنے سے معذور ہے تو ظلم کر ظلم سے تجھے کس نے روکا ہے میرے لئے تغافل سے ظلم بہتر ہے۔

(غالب) اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

صاف دردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

یارانِ ہم مشرب کی حالت پر افسوس! کرتے ہیں کہ ہم لوگ صفائی سے پیمانۂ جم کا تلچھٹ چاٹنے میں بھڑے ہوئے ہیں اور اس شراب سے محروم رہ گئے جو افشردۂ انگور نہیں یعنی بادۂ حقیقت۔

(اکبر) اس مے کی نہیں حسرت دل جس سے ہے ناواقف
اس مے کی تمنا ہے دل ہی میں جو کھنچتی ہو

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

مشہور نہ ہونا میرے خفائی ہونے کی دلیل ہے۔ ظہور اور خفا میں تقابل ہے تو میں خفائی ظہوری کا مدِ مقابل ہو گیا۔ لفظ "یں" کا اس طرح مخفف استعمال میں درست نہیں سمجھتا۔

(۹۹)

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

مجھے نالے سے مقصود شکایت بیداد نہیں بلکہ تقاضائے جفا ہے کیونکہ تو اس سے چڑ کر مجھ پر اور ظلم کرے گا کیونکہ تو ستم ایجاد ہے اور تجھے کسی طرح رحم نہیں آتا۔

ضد نہ بڑھ جائے گی پھوٹیں گے جو کان اس بت کے
پھوڑ دے گی دلِ مضطر کا مقدر فریاد (ناطق)

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

فرہاد اور جوئے شیر کا قصہ مشہور ہے جسے لاکر اُس نے عشرت گہِ خسرو کی زینت کو بڑھایا جو شیریں کا شوہر تھا۔ کہتے ہیں واہ یہ بھی اچھی بات ہے کہ غیرتِ عشق اور آرائشِ خلوت خانۂ رقیب ہم فرہاد کو بحیثیت ایک نیک نام عاشق کے نہیں مانتے۔

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

گھر میں ایک ہی خوبی تھی دشت میں دو آرام ہیں اس لئے اب گھر یاد نہیں آتا۔

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

لطمہ طمانچہ تھپیڑا۔ سیلی تھپڑ۔ کہتے ہیں سمجھ دار لوگوں کے واسطے طوفانِ حوادث

ایک درسگاہِ عالم ہے جس کی ہر موج کا تھپیڑا استاد کے تھپڑ کا کام کرتا ہے یعنی وہ اس سے سبق حاصل کرتے ہیں۔

وائے محرومیِ تسلیم و بداحالِ وفا
جانتا ہے کہ مجھے طاقتِ فریاد نہیں

میرا ضبط بربنائے تسلیم و وفا ہے مگر معشوق یہ سمجھتا ہے کہ اس میں فریاد کی طاقت نہیں افسوس ہے اس کی ناشناسی اور دونوں اوصاف کی ناقدری پر۔ یہاں غالبؔ نے معشوق کا ذکر نہیں کیا صرف جانتا ہے لکھ دیا جس سے یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کون مگر سیاق کلام سے معشوق نکل آتا ہے اس قسم کی اعتراضات آج کل کے شعراء بہت کرتے ہیں جن میں کوئی جان نہیں۔

رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے
گر چراغانِ سرِ رہ گزرِ باد نہیں

ہوا کے رخ پر رہنے والا چراغ نہ اپنی لو قائم رکھ سکتا نہ اس کا کوئی بھروسہ ہوتا ہے کہ کب بجھ جائے گا۔ کہتے ہیں اگر عالم فانی نہ ہوتا تو موجوداتِ عالم رنگِ تغیر سے متاثر نہ ہوتے جسے رنگِ تمکین کے الفاظ سے بیان کیا حاصل یہ کہ العالمُ مُتَغَیِّرٌ وَکُلُّ مُتَغَیِّرٍ حَادِثٌ فَالعَالَمُ حَادِثٌ۔

سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
مژدہ اے مرغ! کہ گلزار میں صیاد نہیں

گلزار میں صیاد نہیں بلکہ گلچیں کو شوق سبد ہوا ہے جس کی عادت مرغانِ گرفتار کو پھولوں کے ٹوکرے میں بند کرنے کی ہے اس لئے مرغِ گرفتار کو مژدہ کہ دوریِ گل کی نوبت نہیں آنے والی۔ یہ مضمون کچھ ہے نہیں۔

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں

معشوق کا دہن گو موجود نہیں لیکن ہر عرضِ مدعا پر نہیں کہہ دینے سے اس کا ثبوت ہوتا ہے کیونکہ بات منہ سے نکلتی ہے تو دمِ ایجاد معشوق کو بجائے دہن نہیں دی گئی گویا قدرت نے نفی سے اثبات کو پیدا کر دیا۔ یا یہ کہ دہن جو معدوم ہے اس کے ثبوت کے لئے معشوق کو دمِ ایجاد نہیں ملی تو نفی سے اثبات ٹپکی۔ حاصل یہ کہ اس بے دہن کی نہیں سے ہاں نکلتی ہے۔ اثبات تذکیر و تانیث میں مختلف فیہ ہے۔

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

بلحاظ ہجومِ عاشقاں ترے کوچے کی آبادی بہشت سے بڑھی ہوئی ہے شہر کی آبادی عمارات سے زیادہ اس کی چہل پہل پر ہوتی ہے یہ نہ ہو تو عمارات کا حاصل کیا۔

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

پردیس میں کون اپنا بیٹھا ہے جہاں آپ کس مپرسی کی شکایت کرتے ہیں شاید آپ کو یارانِ وطن کی بے مہری یاد نہیں رہی۔

سیر ہوں الفتِ یارانِ وطن سے ناطقؔ
عین راحت ہے یہ غربت کی مصیبت مجھ کو

(۱۰۰)

دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

ہم تو اس شرم سے سب کچھ دے بیٹھے کہ اُن سے کیا تکرار کریں اور کس چیز کے لیے انکار کریں مگر وہ یہ سمجھے کہ خوب بنایا۔ یا یہ کہ ہمیں تمنا تو خود ان کی تھی لیکن بتقاضائے شرم جو جھگڑا نہ کیا تو وہ یہ سمجھے کہ ہم نے دونوں جہاں کی نعمتیں دے کر اسے سمجھا لیا۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

کیونکہ منازلِ سلوک کی کوئی انتہا نہیں اس لئے راستے میں حسب حیثیت گامزن ہونے کے بعد ہر مقام پر کچھ لوگ رہ جاتے ہیں۔

(حافظ) عاقلاں نقطۂ پر کارِ وجود اند ولے
عشق داند کہ دریں دائرہ سرگردانند

(ناطقؔ) آنے والے بے پتہ ہیں جانے والے بے خبر
کس سے پوچھوں منزلِ مقصود کتنی دور ہے

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں

کسی کی غم خواری اسی وقت تک کارآمد ہو سکتی ہے جب تک کہ غم جانگداز یعنی مرض مہلک نہ ہو ورنہ یوں تو اہلِ بزم شمع کے بھی ہوا خواہ ہوتے ہیں لیکن اسے بغیر کشتہ ہونے کے کوئی سوز و گداز سے بچا نہیں سکتا۔

(۱۰۱)

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

ہمیں لمبی چوڑی باتیں نہیں آتیں یعنی ہم لفاظی کو نہیں جانتے اس لئے وہ ہمیں اظہارِ عشق میں قاصر دیکھ کر عاشق ہی نہیں سمجھتا اور غیر کی میٹھی باتوں نے کچھ ایسا اثر کیا ہے کہ اس کی بات جم گئی۔

۱۰۲

قیامت ہے کہ سُن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

غضب کی بات ہے کہ وہ یعنی میرا معشوق عاشق نوازی کو ننگِ شانِ دلبری سمجھتا ہے۔ "سُن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا" اب کوئی نہیں کہہ سکتا "سُن کر ہونا چاہیئے" ایک مصنف ہی نہیں ان کے دیگر معاصرین نے بھی اس ترکیب کا استعمال کیا ہے۔

دلِ نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے غالبؔ
نہ کر سرگرم اس کافر کو الفت آزمانے میں

(داغؔ) غش آ نہ جائے دیکھ کے قاتل کو موجِ خوں
نازک مزاج کا کہیں ہلکا لہو نہ ہو

۱۰۳

دل لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی داد یاں

چلو ہم نے اپنی بیکسی کی اسی دنیا میں داد پالی کیونکہ دل لگا کر انھیں بھی کنجِ تنہائی میں بیٹھنا نصیب ہوا۔ "دل لگا کر لگ گیا اُن کو" میں ذم کا پہلو نکلتا ہے جس سے اجتناب کرنا ضروری ہے لیکن ایسے الفاظ بلا قصد نکل جاتے ہیں جس میں شاعر کو معذور سمجھنا چاہیئے اور ایسے مواقع پر اعتراض کرنا کوتاہ فہمی یا ضد کی دلیل ہے۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیاں

اجزائے آفرینش تمام آمادۂ زوال ہیں چنانچہ یہاں مہرِ گردوں کی ہستی بھی اس چراغ سے زیادہ نہیں جو ہوا کے جھروکے میں رکھا ہوا ہو اور جس کے لئے ہر لحظہ یہ خیال ہوتا ہے کہ اب نہیں تو اب بُجھا۔

(ناطقؔ) ایک تھپیڑ ہے ہوا کا بے خبر ہر ایک سانس
زندگی کا بس انھیں جھونکوں میں گُل ہوگا چراغ

۱۰۴

یہ جو ہم ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

انتظار ہے کہ صبا ہی دیوار پھاند کر اس کی خوشبو کا سندیسہ لے آئے یا قاصد ہی دروازے سے آنکلے۔ آیہ۔ اِنِّی لَاَجِدُ رِیحَ یُوسُفَ لَوْلَا اَنْ تُفَنِّدُوْنِ۔

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

یہ مہمان عزیز آیا ہے کس اجڑے ہوئے گھر میں۔ خیال ہوتا ہے کیا واقعی وہ آگئے کیا میرے ہی گھر میں آئے ہیں گھر کو دیکھتا ہوں تو سمجھتا ہوں وہ نہیں کوئی اور آیا ہوگا اور انھیں دیکھتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ میرے گھر میں نہیں کہیں اور آئے ہوں گے۔
مصنف کا یہ شعر اس قدر مشہور ہے کہ خواص ہی نہیں عوام بھی ایسے موقع پر آنکلنے اسے پڑھ دیتے ہیں۔

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں میرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

زخمِ جگر کا طول و عرض وجہِ حیرت ہے اس لئے نظارۂ خلق سے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں اس کے دست و بازو کو جس سے یہ کارِ نمایاں ہوا ہے نظر نہ لگ جائے۔

"نظر لگنا" اردو کا عام محاورہ تھا مگر اب خواص سے اس کا استعمال اٹھتا جا رہا ہے وہ ایسے مقام پر "نظر ہونا" بولتے ہیں ؎

طولِ زخمِ جگر نہ ہو جائے — تجھکو قاتل نظر نہ ہو جائے

میرے نزدیک "نظر ہونے" سے "نظر لگنا" زیادہ موزوں لفظ ہے مگر اہلِ زبان کے استعمال کا کوئی علاج نہیں اور اس میں کسی کی رائے نہیں چلتی۔

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

تیری ٹوپی میں کیسے کیسے جواہر ٹکے ہوئے ہیں یہ کوئی دیکھنے کی بات نہیں ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ لعل وگہر کا بھی کیسا بلند نصیب ہے کہ انھوں نے تیرے طرف کلہ میں جگہ پائی ؎

بہ زیور ہا بیارایند خوباں را بہ ہر وقتے
تو سیمیں تن چناں خوبی کہ زیور ہا بیارائی

(۱۰۵)

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

قیامت کا تو مجھے ضرور اعتقاد ہے لیکن یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ اضطراب وطول میں وہ شبِ فراق سے بھی زیادہ ہے۔ لفظ "زیاد" کا جس طرح انھوں نے یہاں استعمال کیا ہے اب درست نہیں "زیادہ" بولنا چاہیئے۔

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

مے نوشی کے تکلفات میں ابر و باد بھی ہیں جن کے دن کو نہ ہونے سے بزمِ رنداں گرم نہ ہو سکی تو کیا برائی ہے چلو آج رات کو یہ انتظام کریں گے کیونکہ ابر نہ ہونے

سے چاندنی اچھی چھٹکے گی اور اس طرح نہیں تو اِس طرح لطف حاصل ہو جائیگا۔

ہے شبِ ماہ کی بہار شیشہ ہے اور انتظار (ناطق)
ہرج نہ ہو تو آیئے کام نہ ہو تو کام ہے

جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

رسم ہے کہ جب کوئی اپنا یا دوست آتا ہے تو اسے مرحبا کہا جاتا ہے اور جب جاتا ہے تو خیر باد۔ یہ کہتے ہیں میں وہاں ایسا اجنبی ہوں کہ ان الفاظ کی وہ میرے لئے ضرورت نہیں سمجھتے۔ یا یہ کہ میرے لئے ان کے لبوں پر کوئی دعا ہی نہیں۔ اس میں اول تو پورا کہیں کو اور خصوصاً کو حشو ہے مگر ان کے وقت میں ایسا بولا جاتا تھا کہ کہاں کو جاتے ہو جواب فصیح نہیں البتہ اگر جاتے ہو نہ بولیں تو کہاں کو بولتے ہیں مثلاً ؎

بغل میں داب کر تاب و تواں کو — کہاں کو لے دلِ مضطر کہاں کو

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

وہ مجھے فتنہ انگیز اور فسادی کہہ کر یاد کرتے ہیں۔

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

بعض اشیاء کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ تو عید بقر عید ہی کو میسر آتی ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فلاں گھر میں روز نعمتیں کھائی جاتی ہیں۔ کہتے ہیں گدائے میکدہ ایسا نامراد نہیں کہ اسے عید ہی کے دن شراب میسر آئے پھر نہ ملے اس کوچہ میں تو عید کے علاوہ اور دن بھی یہ نعمت مل جاتی ہے۔

جہاں میں ہوں غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

124

جہاں میں نہ کوئی ایسا ہوتا ہے جسے کوئی غم نہ ہو نہ کوئی ایسا جسے کوئی خوشی نہ ہو کہا کرتے ہیں کہ رنج و راحت کا جوڑا ہے بقولِ شاعر

درین حدیقہ بہار و خزاں ہم آغوشست
زمانہ جام بدست و جنازہ بردوشست

یہ کہتے ہیں جہاں کا ایسا حال ہے تو ہوگا ہمیں اس سے کیا مطلب کیونکہ یہاں تو ایسا نامراد دل ملا ہے جس نے کبھی خوشی کی شکل بھی نہیں دیکھی۔

(ناطقؔ) نکالی ہے نرالی چھیڑ انھوں نے دلفگاروں سے
خوشی کیا چیز ہے یہ پوچھتے ہیں غم کے ماروں سے

(ولہ) جو سرور آمادہ ہو دل میں وہ کیفِ غم نہیں
رنج و راحت اب ہمارے واسطے تو کم نہیں

تم ان کے وعدوں کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالبؔ
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

غالبؔ جان بوجھ کر تم اس قول فراموش سے وعدے کی یاد دہانی کیوں کیا کرتے ہو آخر اس سے کیا فائدہ کہ تم کہتے ہو کہ تم نے وعدہ کیا تھا اور وہ کہہ دیتا ہے کہ ہمیں تو یاد نہیں۔

۱۰۶

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

تیرے توسن کو صبا باندھنے سے ہمارے توسنِ فکر کی ہوا بندھ جاتی ہے یعنی ہم اس سے سبک رو خیال پیدا کر لیتے ہیں۔ یا یہ کہ تیرے گھوڑے کی صبا رفتاری کو باندھنے سے ہمارے مضمون کی ہوا بندھ جاتی ہے یعنی اڑ کر بلند ہو جاتا ہے۔

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اِک اپنی ہوا باندھتے ہیں

آہ کا اثر کچھ نہیں ہوتا اور ہوتا بھی ہوگا تو دیکھا نہیں مگر ہم جو آہ کرتے ہیں تو خیال یہ ہے کہ شاید اس سے ہوا بندھ جائے۔ کہا کرتے ہیں کہ کسی کی آہ لینا اچھا نہیں۔ کسی نے نہیں دیکھا کی جگہ کس نے دیکھا ہے بہت مقبول طرز بیان ہے۔

تیری فرصت کے مقابل اے عمر
برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

(ناطقؔ) گو اس میں کو دکھا دے وہ تیزیاں کہاں
برقِ جہاں کہاں رہی عمرِ رواں کہاں

قیدِ ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

قیدِ ہستی سے مصنف کی مراد ہے قیدِ غمِ ہستی چنانچہ ایک جگہ لکھا۔

(غالبؔ) قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

بے سر و پا بے ثبوت لغو غیر مربوط

(داغؔ) کیوں دعویٔ رقیب سراپا نہ ہو غلط
جب اس کی بات کا کوئی سر ہو نہ پیر ہو

عام خیال یہ ہے کہ رونے سے دل کی بھڑاس نکل جاتی یا طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے۔

(شوقؔ نیموی) کچھ آنسو دیدۂ گریاں سے ٹپکے
بخارِ دل سرِ مژگاں سے ٹپکے

یہ بھی خیال ہے کہ گڑگڑانے اور رونے سے مقصد بر آتی ہو جاتی ہے جس کی تردید عرفیؔ نے یوں کی ہے

(عرفیؔ) عرفیؔ اگر بہ گریہ میسر شدے وصال
صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

مطلب یہ کہ اشک کے متعلق جو خیال باندھ رکھا ہے کہ اس کے نکلنے سے طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے یہ محض بے سر و پا ہے کیونکہ انسان کو جیتے جی غمِ ہستی سے رہائی نہیں

ملتی۔ واللہ اعلم۔

نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

پھول جو ایک مرتبہ کھلنے کے بعد پھر غنچہ نہیں ہوتا اس کی وجہ بتاتے ہیں کہ گل کی واشدگی سرمستیِ رنگ کی بدولت ہے اور جب یہ مستِ رنگ ہوا تو "مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں"۔ یا یہ کہ نشۂ رنگ سے سرمست ہو کر پھول کھل جاتا ہے اور کیوں نہ کھلتا کہ مست کو بندِ قبا کا ہوش نہیں رہتا۔

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

آبلہ پائی باعثِ واماندگی ہے ؎

عشق کی راہ میں ہے چرخ مکوکب کی یہ چال
سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

پاؤں کو مہندی لگنا بھی مانعِ رفتار ہوتا ہے۔

(راسخ) فلک دیتا ہے دھوکہ رہروانِ تیرہ قسمت کو
شفق مہندی لگا دیتی ہے پائے شامِ غربت میں

مطلب یہ کہ اہلِ تدبیر کی وضع واماندگی ملاحظہ فرمایئے کہ آبلہ پائی پر حنا کا ازدیاد ہوتا ہے یعنی واماندگی کا علاج واماندگی سے کرتے ہیں حالانکہ چاہیئے تو یہ تھا کہ کوئی تدبیر واماندگی کو فوراً دور کرنے کی کی جاتی مگر ان کی عقلِ وامانده کو ایسی بات کہاں سے سوجھے۔

سادہ پُرکار ہیں خوباں غالب
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

معشوقوں کا پیمانِ وفا باندھنا اور ہم سے باندھنا پُرکاری کی دلیل ہے کیونکہ باندھ رہے ہیں یعنی کر رہے ہیں اور کبھی ان کی سادگی کی یہی دلیل ہے کیونکہ ہمیں

باندھنے کی ضرورت کیا ہم تو پہلے ہی سے ان کے بال باندھے غلام ہیں۔

(۱۰۷)

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

غالبؔ کی بدنصیبی یا سخت جانی کو دیکھتے ہوئے تو ہمیں ایسی امید تھی کہ زمانہ اس کی جان کے لئے بہت سے آزار پیدا کرے گا لیکن خدا جانے کیوں کمی ہو رہی ہے۔ یا یہ کہ اس کے اعمال تو برباد ہو جانے کے لائق تھے لیکن خدا کا غضب جو نازل نہیں ہوتا تو یہ اس کی مہربانی ہے یا یہ کہ یہ نادان ہیں بھلے بُرے کی تمیز نہیں سارے کام اُلٹے کرتے ہیں جن سے مصیبت میں ہمیشہ مبتلا رہنا چاہیئے مگر ایسا نہیں ہوتا۔ یا دفعِ ملال کرتے ہیں کہ ہم پر تو زیادہ مصیبت آنا چاہیئے تھا مگر کم آئی چلو غنیمت ہے۔ توقع زیاد کوئی اچھی ترکیب نہیں اور شاید ایسا کبھی نہیں بولا گیا۔

(۱۰۸)

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں؟
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

سنگِ درِ یار پر رشک کرتے ہیں کہ ہم سے وہی اچھا جو ہمیشہ ترے دروازے پر ڈھئی دیئے پڑا رہتا ہے۔

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

گردش کے لئے تو پیالہ و ساغر کی وضع ہوتی ہے میری قسمت میں یہ چکر کہاں سے آ گیا میں تو انسان ہوں گو مٹی کا بنا ہوا ہوں لیکن میری وضع گردش کے لئے نہیں۔

126

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

تحریر میں جو حرف مکرر آجائے وہ بے ضرورت ہونے کی وجہ سے کاٹ دیا جاتا ہے یا مٹا دیا جاتا ہے کہتے ہیں یا اللہ زمانہ مجھے مٹانے پر کیوں تلا ہوا ہے میں تو لوحِ جہاں پر کوئی حرفِ مکرر نہیں۔

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

سزا اجرِ گناہ۔ عقوبت عذاب تکلیف۔ کہتے ہیں مجھے میرے گناہوں کی سزا میں جو تکلیف دی جا رہی ہے اس کی کوئی حد ہونی چاہیے کیونکہ میں مسلم فاجر ہوں جس کے لئے سزا کے بعد راحت بھی ہے کچھ کافر نہیں جو ابد الآباد تک عذاب میں رکھے جائیں گے۔ لفظ کافر بکسر فا ہے لیکن اردو کی کثرتِ استعمال میں بہ فتح فا آ گیا ہے۔ اور سنگ دل کے لئے تو خواص بھی بہ فتح فا ہی بولتے ہیں۔ غالب کا اسے بہ فتح فا لکھ دینا فصاحت کی سند ہے دیگر شعرا نے بھی ایسا لکھا ہے۔

(راسخ) ساغر ہے مرے آگے وہ کافر بغل میں ہے
ہے سامنے نصیب مقدر بغل میں ہے

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زمرد و دُر و گوہر نہیں ہوں میں

یہ تو معلوم ہے کہ لعل و گوہر کی تمہاری نگہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیوں عزیز نہیں جانتے میرا ان پتھروں میں شمار نہیں میں تو اشرف المخلوقات ہوں۔

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

جب تم مہر و ماہ کو اس قابل سمجھتے ہو کہ اُنھیں اپنے شرفِ قدم سے بہرہ اندوز کرو تو پھر میری آنکھوں سے قدم کیوں بچاتے ہو کیا میرا مرتبہ مہر و ماہ سے بھی کم ہو گیا۔ میں تو اشرف المخلوقات ہوں۔

کرتے ہو مجھکو منع قدم بوس کس لئے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

یہ شعر شعرِ ماسبق کے تخیل کی دوسری صورت ہے۔

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دُعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

وہ دن گئے جب کہتے تھے میں بادشاہ کا نوکر نہیں ہوں اب تو غالب بادشاہ کو دعا دو کہ اُن کا دیا کھاتے ہو۔

(١٠٩)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

زنہار قدم بخاک آہستہ نہی
کیں مردمکِ چشمِ نگارے بودست

کہتے ہیں لالہ و گل کی نمائش ان صورتوں کا عکس ہے جو خاک میں پنہاں ہوئی ہیں اور وہ بھی سب نہیں کچھ۔

(ناطق) فلک پہ چند گل بوٹے جو نکلے بھی تو کیا نکلے
گئی جو خاک میں وہ اچھی صورت پھر نہیں نکلی

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

ہم بھی رنگِ بزمِ عیش جمانے میں مشاق تھے لیکن اب ایسا وقت آگیا ہے کہ کچھ یاد نہیں رہا۔

(غالبؔ) تھی سب اِک شخص کے تصور سے اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

تھیں بنات النعشِ گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

بنات جمع بنت کی یعنی لڑکیاں۔ بنات النعش برج صور کے سات ستارے جنھیں ہندی میں کھٹولا کہتے ہیں اور ہندوا نھیں ست رشی بھی کہتے ہیں اس کی شکل ایسی ہے کہ چار ستارے ایک پلنگ کی شکل کے ہیں اور تین ان کے نیچے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ تین چار کا کھٹولا اُٹھائے ہوئے ہیں۔ جو نعش کی شکل ہے اِن سات ستاروں میں سے دو سامنے والے ستارے جو مغرب کی طرف رہتے ہیں قطبین بھی کہلاتے ہیں جن کو ملا کر اگر بائیں جانب خطِ مستقیم کھینچا جائے تو وہ قطب پر آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ معشوقوں کا عالم دن اور رات ہی کے فرق میں کیا سے کیا ہو گیا کہ بنات النعشِ گردوں جو ابھی تھوڑی دیر پہلے پردے میں بیٹھی تھیں خدا جانے ان کے دل میں کیا بات آگئی کہ رات ہوتے ہی تاریکی کی چادر کو اُتار پھینکا اور ننگی مادر زاد ہو کر سامنے آکھڑی ہوئیں۔ یہ غالبؔ کا تخیل ہے جس میں لفظ بنات سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ جی میں کیا آئی اُس وقت کی زبان ہے جس میں بات محذوف ہے۔

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

خبر لینا امداد کرنا خبر نہ لی مدد نہ کی کام نہ آئے گو بہ وجہ بے خبری حضرت یعقوب علیہ السلام یوسف علیہ السلام کی خبر نہ لے سکے لیکن تعلق قلبی دیکھئے کہ قیدِ یوسف کے اثر سے اِن کی آنکھیں روزنِ دیوارِ زندانِ بلا کی طرح بھیانک اور بے نور ہو کر رہ گئیں۔ ایک تکلف ہے۔ اس شعر میں ذم کا پہلو پیدا ہو گیا اور وہ بھی بدتریں۔ میں یہ خیال ادب اس کی توضیح کرنا مناسب نہیں سمجھتا ناظرینِ کرام پہلے مصرع کو "خبر" نکال کر پڑھ لیں۔ مگر بات یہ ہے کہ زبان ہمیشہ بدلتی رہتی ہے لیکن ذہن کا معاملہ جو اس شعر سے آج کل کی زبان کے مطابق نکالا جا سکتا ہے وہ غالبؔ کے وقت میں نہ تھا اور اگر تھا بھی تو اس کا اِن الفاظ میں استعمال نہیں ہوتا تھا لیکن اگر ہو بھی تو میرے خیال کے

مطابق ذم کا پہلو کہاں نہیں نکلتا اور کیوں مصرع پڑھنے کے وقت "خبر" کو چھوڑ دیا جائے۔ شاعر جہاں اپنے کلام کو تمام کر رہا ہے وہیں تمام ہو گا پہلا مصرع اسی خیال میں یوں بھی لکھا جا سکتا تھا "حالِ یوسف قید میں دیکھا نہ گو یعقوب نے" لیکن اس میں وہ بات نہیں پیدا ہوتی جو غالبؔ کے الفاظ میں ہے غالبؔ کا کمالِ نظم یہی ہے کہ جو شعر جس طرح لکھ دیا ہے یا جو لفظ جہاں رکھ دیا ہے وہ آج بھی کامیابی سے نہیں بدلا جا سکتا۔ ایسا ہی ایک مضمون پہلے بھی لکھ آئے ہیں۔

(غالبؔ) نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

یہ رسمِ عاشقی میں اَن ہونی بات ہے لیکن زلیخا کی خوشی کی وجہ زنانِ مصر کا فریفتہ ہو کر عشقِ یوسف میں زلیخا کو معذور قرار دینا ہے جس پر اس نے یہ کہا کہ دیکھ لو یہ وہی ہے جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کرتی تھیں۔ یہ ایک بیانِ واقعہ ہے ورنہ کوئی تخیل نہیں۔

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں

فراق کی شب تار میں روشنی کی ضرورت ہے اس لئے آنکھوں سے خون کی ندی بہنے دو اشکِ خونی کی چمک اور روانی سے میں یہ سمجھوں گا کہ گھر میں دو شمعیں روشن ہیں۔

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

اگر قدرت نے حشر میں ان پری زادوں کو حوریں بنا دیا تو ہمیں انتقام لینے کا موقع ملے گا کیونکہ حوریں مومنین پر عاشق ہوں گی اس طرح وہاں کا معاملہ یہاں سے برعکس ہو جائے گا اور جس طرح وہ اب یہاں ستاتے ہیں ہم انھیں وہاں ستائیں گے۔ یہاں

ہوگئیں کے استعمال میں کلام ہے۔ ہوگئے کی ضرورت تھی۔

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

تو جس کے بازو پر سر رکھ کر سوئے اور تری زلفیں اس پر پریشاں ہوں وہی عالی دماغ ہے اسی کی نیند خوابِ راحت ہے اور اسی کی راتیں راتیں یعنی یہ کہ تو جس کا ہے سب کچھ اس کا ہے۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سُن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں

میں جو باغ میں گیا تو وہاں مدرسہ کا مزا آگیا کیونکہ میرے نالوں کی آواز پر وہاں بلبلیں چہکنے لگیں۔

(ریاض) تقلید میں بھی کچھ رہے ایجاد کا مزا
لے عندلیب رنگ اُڑا میری آہ کا

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

حیرت کرتے ہیں کہ وہ نگاہیں کیونکر دل کے پار ہوئی جاتی ہیں جو میری کوتاہیِ قسمت کے اثر سے کوتاہ بینی میں سمٹ کر مژگاں تک رہ گئی ہیں یعنی میری طرف اٹھنا یا مجھ تک پہونچنا ہی نہیں چاہتیں۔

(ناطق) نظر بندی بہ مژگاں خوشتر از بندِ نظر بندی
سرِ کوتاہ بیں کوتاہ کیں چشمِ تماشا را

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہوگئیں

آہوں کے پے بہ پے اُبھرنے اور بوجھ ضبط بار بار اُبھر کر ڈوب جانے کی

حرکتِ سوزن سے مشابہت ہوئی اسی تخیل پر کہتے ہیں کہ میری آہوں سے کوششِ ضبط کے ساتھ چاک گریبانِ سینہ کا بخیہ ہوتا رہا۔

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہوگئیں

دعائیں جو آتش غضب کو سرد کرنے کے لئے تھیں وہ سب تو درباں ہی کی بدمزاجی کی نظر ہوگئیں اب بتاؤ اگر میں اندر پہونچ ہی گیا تو ان کی گالیوں کا کیا جواب دوں گا اور نئی دعائیں کہاں سے لاؤں گا۔ کیونکہ اگر اُنھیں بھی یہی دعائیں دوں تو وہ یہ نہ کہیں گے کہ ہماری اوقات کیا درباں کے برابر ہوگئی۔

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

شراب ایک ایسا جاں فزا جوہر ہے کہ جس ہاتھ میں آجائے اس کی لکیروں میں رگِ جاں کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے یعنی زندگی آجاتی ہے۔ اس مضمون کو پہلے یوں لکھ آئے آئے ہیں۔

(غالب) جس قدر روح بناتی ہے جگر تشنۂ ناز
دے ہے تسکیں بہ دمِ آبِ بقا موجِ شراب

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

پابندیِ رسوم شرک فی التوحید ہے اس لئے مللِ باطلہ جن کی بنیاد رسوم پر ہے مٹ کر اجزائے ایماں بن جاتی ہیں یعنی جیسے جیسے ان کا خیال مٹتا جاتا ہے ایمان کامل ہوتا ہے۔

(غالب) نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

(129)

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر آساں ہو گئیں

جب انسان کو تکلیف کی عادت پڑ جاتی ہے تو پھر اس کے لئے تکلیف تکلیف نہیں رہتی۔ کہتے ہیں مجھ پر اتنی مشکلیں پڑی ہیں کہ اب میرے لئے مشکل مشکل نہیں۔

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

اس کا رونا نحس ہے یا سیلاب گریہ درپے دیوار و در ہے۔ یہاں ویران ہو جانا کا محل ہے۔ مگر یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ مستقبل کا بیانِ تیقن ماضی کے ساتھ ہوتا ہے۔

(۱۱۰)

دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

دیوانگی نے گریبان کی وہ دھجیاں اُڑائی ہیں کہ ہمارے گلے میں اب زنار کے نام کا بھی ایک تار باقی نہیں۔ اگرچہ جیب بمعنی گریبان کا استعمال بے ترکیب فارسی اب درست نہیں مگر اس طرزِ بیان میں یہی شعر کا خاص لفظ ہے۔

دل کو نیاز حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

دل حسرتِ دیدار کی نذر ہو گیا اب جو خیال کیا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں یا اب جو نظارہ کا موقع آ گیا تو تابِ دیدار نہیں۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

آسان نہیں تو مشکل ہوگا اور مشکل میری ہمتِ مردانہ کے لئے آسان ہے لیکن مشکل تو یہ آپڑی ہے کہ تیرا ملنا مشکل کی حد سے بھی متجاوز یعنی ناممکن ہے جس میں کسی کا بس نہیں چلتا۔ دیکھو اس شعر کی شرح۔

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تحریر کا (غالبؔ)

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بہ قدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

عشق کے بغیر لذتِ زندگی نہیں اور عشق پُر کار ہیں لذتِ آزار جو ایک معمولی بات ہے یہاں اس کی بھی طاقت نہیں یعنی ہماری بھی کیا زندگی ہے کہ عمر کو گزارنے کا جو سہارا ہے اسی کے برداشت کی طاقت نہیں۔

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

دیوار سے سر مارتے یا سر کو دیوار سے مارتے تو ہمارا وبال اتر جاتا۔

گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

عداوتِ اغیار فرع ہے ہوسِ یار کی اور جب یہاں دل بوجہ ضعف ہوسِ یار ہی کو نہیں سنبھال سکتا تو پھر عداوتِ اغیار کی گنجائش کہاں سے آجائے گی۔ لفظ "ہوس" ضد ہے عشق کی کہ ہوسناکی عاشقی کے خلاف استعمال ہوتی ہے۔

اہلِ ہوس کو دردِ محبت کہاں نصیب
یہ مال راہ میں نہیں ملتا پڑا ہوا (ناطقؔ)

خود مصنف نے لفظ "ہوس" کو عشق کے مقابلہ میں لکھا ہے۔

فروغِ شعلۂ حسن یک نفس ہے
"ہوس" کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

مگر یہاں جو مصنف نے لفظِ "ہوس" لکھا ہے وہ غلط بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ معنی یہ ہو جائیں گے کہ یہاں عشق تو رہا الگ ہوس بھی نہیں۔

ڈرنا لہائے زار سے میرے خدا کو مان
آخر نوائے مرغ گرفتار بھی نہیں

ڈرنالہائے جگر خراش آخر مرغِ گرفتار کی نوائے بے حقیقت ہی تو نہیں جن سے تو نہ ڈرے خدا کو مان کر موقع کی نزاکت کو پہچان اور کسی طرح وقت کو ٹال۔ خدا کو مان بڑا اچھا محاورہ ہے جو خدا کے لئے مان کی جگہ بولا جاتا ہے۔

(ناطق)
ہم ماننے والے تھے کوئی بات بتوں کی
کیا کیجئے جب کوئی کہے مان خدا کو

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی
حالاں کہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

دل کی حالت تو یہ ہے کہ ایک کانٹے کے چبھنے کی بھی برداشت نہیں اور پھر اس پر ہمت یہ کہ یار کی صفِ مژگاں سے مقابلہ کرنے کی ٹھنی ہوئی ہے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ان کی یہ سادگی قاتل عالم ہے کہ بے تلوار اُٹھائے لڑنے نکلے ہیں۔ غالب کا یہ شعر بہت مشہور ہے اور بہت پڑھا جاتا ہے۔

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

غالب کے اس انداز سے جو بارہا ہم نے محفل اور تنہائی میں دیکھا ہمارا یہ خیال

قائم ہو گیا کہ اگر یہ شخص دیوانہ نہیں ہے تو عقلمند بھی نہیں یعنی نیم پاگل ہے۔

(۱۱۱)

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشک یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

میرے جسم کا ایک زخم بھی بخیے کے قابل نظر نہیں آتا اس لئے بحالتِ ناکامی رشتۂ سوزن چشم سوزن میں تار اشک یاس بن گیا ہے "درخور" کا جس طرح مصنف نے یہاں استعمال کیا ہے اس کی اب اردو شاعری متحمل نہیں یہ لفظ اگر اردو شعر میں آسکتا ہے تو صرف ترکیب فارسی کے ساتھ جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے ؎

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشہ خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

ہماری خانہ ویرانی لطف نظارہ یعنی تاک جھانک میں خارج ہو گئی ہے کیونکہ اس سیلاب کا جھاگ جو وجہ خانہ ویرانی ہوا روزنِ خانہ میں برنگِ پنبہ بھرا ہوا رہ کر مانعِ ذوقِ تماشا ہے کہ اب جھانکنے کا موقع نہیں رہا۔

ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرا ہر قطرہ خوں تن میں

میرے خون کے ہر قطرہ پر کاوشِ مژگاں نے معشوق کا نام کندہ کر دیا ہے اور چونکہ یہ کاوش مژگانِ یار کی ایک بیداد تھی اس لئے میں ودیعت خانۂ بیداد کاوش ہائے مژگاں ہوں۔ اسی تخیل کو پہلے یوں لکھ آئے ہیں ؎

بیاں کیا کیجئے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

(111)

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

گھرے اندھیرے میں تھوڑی سی روشنی بھی بہت معلوم ہوتی ہے۔ کہتے ہیں میرے شبستاں کی ظلمت گستری اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ اس میں ذرا سی روئی کی سفیدی بھی چاندنی کا عالم پیدا کر دے گی۔ اس مضمون کو مصنف نے بار بار نظم کیا ہے اور بہت شعر لکھے ہیں۔

نکوہش مانعِ بے ربطیٔ شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

نکوہش طعنہ زنی۔ کہتے ہیں احباب کے خندۂ دنداں نمانے جیب و دامن کے لئے بخیہ کا کام دیا کیونکہ ان کی ملامت اور تمسخر کی بدولت میرا جوشِ جنوں توڑ پھوڑ یا چیر پھاڑ سے باز رہا یعنی میری دیوانگی بھی ہشیاری سے خالی نہیں کہ میں نے جامہ دری سے دوست نما دشمنوں کو ہنسی کا موقع نہیں دیا۔

(ناطق)
چڑائے منہ دہنِ زخم چارہ سازوں کا
کہ اب تو ٹانکے بھی کچھ دانت سے نکال گئے

ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پَر افشاں جوہرِ آئینے میں مثلِ ذرہ روزن میں

جس طرح پرتوِ خورشید ذرہ ہائے روزن میں حرکت یا بے چینی پیدا کر دیتا ہے یا جان ڈال دیتا ہے اسی طرح اس مہروش کے جلوۂ رخسار سے بھی عالم جوہرِ آئینہ کا ہو جاتا ہے۔ یہ مضمون بھی مصنف نے ادل بدل کر بار بار لکھا ہے۔

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

یہ تو میں نہیں کہتا کہ اپنے یارانِ ہم صحبت سے اچھا ہوں یا برا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ یہ

لوگ میری صحبت کے نہیں۔

(حافظ)
چاک خواہم زدنِ ایں دلق ریائی چہ کنم
روح را صحبت ناجنس عذابیست الیم

ہزاروں دل دیئے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

اہلِ دل کے نزدیک مقصدِ دل یا حاصلِ دل سویدائے دل ہے جسے مقامِ انا کہتے ہیں۔ خون کا قطرہ خشک ہو کر سیہ ہو جاتا ہے جو جسم میں رہ کر سویدائے دل سے مشابہ ہوا۔ کہتے ہیں جوشِ جنونِ عشق میں جو مرے جسم کے قطرہ ہائے خوں خشک ہو کر سیہ پڑ گئے ہیں وہ گویا ہر ایک سویدائے دل ہے اور جب ہر قطرہ ایک سویدائے دل ہوا تو گویا ان کے جسم میں ہزاروں دل ہو گئے۔ تن مفرد بمعنی جسم اب اردو میں بہت کم آتا ہے۔

اسدؔ زندانیِ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں
خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

میں وفا کیش اسیرِ محبتِ خوباں ہوں جو ہاتھ انھوں نے کبھی پیار سے میری گردن میں ڈالا تھا وہ طوقِ گردن ہو گیا ہے یعنی احسانِ لطف ہنوز گلوگیر ہے۔

(۱۱۲)

مزے جہاں کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں

ہمیں اپنے خونِ جگر کے سوا جہاں کی اور کسی چیز میں مزا نہیں آتا لیکن بدقسمتی سے جگر میں کچھ باقی نہیں تو اب ہماری زندگی بے مزا ہے۔

(132)

مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

جیتے جی تو ان کمزور بال پر سے وہاں اڑ کر پہونچ جانے کی حسرت نکلنا معلوم البتہ مر کر مٹی ہو جانے پر ہوا اڑا لے جائے تو لے جائے "ورنہ" کی جگہ "وگرنہ" کا استعمال اب درست نہیں۔

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گل رہگذر میں خاک نہیں

کسی بہشت شمائل کی آمد آمد کا یہ اثر ہے کہ رہگذر کی خاک بھی جلوۂ گل کے سوا نہیں۔ اس بیان سے یا تو یہ غرض ہو سکتی ہے کہ انھیں آمد آمد معشوق کی خبر سے جو بہشت شمائل ہے اُس کے خیال میں انھیں ساری رہگذر پھولوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہے۔

(غالب) جلوۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

یا یہ کہ راستے کی گلباریاں یا گلکاریاں دیکھ کر یہ سوال کرتے ہیں کہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے۔

بھلا اُسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

میری آہ یا میرا عرضِ مدعا ایسا بے اثر ہے کہ اس میں خاک اثر نہیں کیونکہ اگر کچھ بھی اثر ہوتا تو معشوق کو نہ سہی مجھی کو اپنے حالِ زار پر رحم آجاتا میں تو اس کی طرح سنگدل نہیں ہوں۔

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

میکشوں کو برباد کرنے والی بات موسمِ بہار کی پاسداری ہے ورنہ شراب خانہ میں کوئی وجہ دلبستگی نہیں۔

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

عشق کا کام ہے غارتگری یہاں گھر کے نام سے حسرتِ تعمیر باقی ہے اور بس۔ تو اب کیا بگاڑوں اور عشق کی پاسداری میں کون سی جائداد کو غارت کر کے شرمندگی اُتاروں۔

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھُلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

عرضِ ہنر ہنر کو پیش کرنا سامنے لانا۔ عرض ہنر سے ہمارے شعر صرف دل لگی کے رہ گئے تو بس معلوم ہو گیا کہ اظہارِ ہنر میں کچھ دم نہیں۔ یا یہ معلوم ہو گیا کہ عرضِ ہنر کا کچھ نتیجہ نہیں اس لئے اب ہم صرف دل بہلانے کیلئے کچھ لکھ لیتے ہیں۔

(۱۱۳)

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

بہ عالمِ یاس یا تختۂ مشقِ ستم ہو کر یہ رو رہے ہیں معشوق پوچھتا ہے کیوں اس کا یہ جواب ہے۔ یا وہ منع کرتا ہے اور یہ چڑ کر جواب دیتے ہیں۔

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اُٹھائے کیوں

دیر میں بیٹھے ہوتے تو برہمن کو اُٹھانے کا حق تھا حرم میں ہوتے تو شیخ اُٹھاتا کسی کے دروازہ پر بیٹھے ہوتے تو دربان اُٹھاتا ہم تو راستہ میں بیٹھے ہیں یہاں کسی کا کیا اجارہ ہے اور یہاں سے ہمیں کیوں اُٹھایا جا رہا ہے۔ اس کا دوسرا اندازِ بیان ملاحظہ کیجیے۔

(ناطق)　لاتا صنم کدے سے تھی کیا مجال واعظ
جی ہاں ہمیں اُٹھاتا ہم راہ میں پڑے تھے

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ جلوۂ ذات حجاب میں پنہاں ہے "آیہ" لاتدرکہ الابصار و ہو ایدرک البصار۔

(ناطق)　عام تھا جلوہ مگر دیدۂ بیدار نہ تھا
سب تھے اور کوئی بھی نظارہ کا حقدار نہ تھا

دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

عکسِ رُخ خواہ وہ تیرا ہی کیوں نہ ہو تیرے سامنے آنے کی کیونکر ہمت کرے کیونکہ یہ بات امورِ معلومہ میں سے ہے کہ دشنۂ غمزہ اور ناوکِ ناز یہ دو تیرے جاں ستاں اور بے پناہ حربے ہیں کہ اِن سے اپنا پرایا کوئی سامنے آ کر نہیں بچتا تو یہ کہتے ہیں کہ تیرا عکسِ رُخ بھی آئینہ میں تیرے سامنے آنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ کچھ ایسا ہی ایک مضمون داغ نے لکھا ہے ؎

ہٹ گئی پڑ کے آئینہ پہ وہ آنکھ　　عکس کا انتظار کون کرے

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات نہیں پا سکتا کیونکہ زندگی اور غم دو جدا جدا چیزیں نہیں اس لئے آدمی جب تک بقیدِ حیات ہے اسے اسیرِ غم ہی رہنا پڑے گا۔

حسن اور اس پہ حسنِ ظن۔ رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے۔ غیر کو آزمائے کیوں

اگر دعویِ الفت میں بوالہوس کے امتحان کی نوبت آتی تو اُسے شرمندگی اُٹھانا پڑتا لیکن معشوق کے اعتمادِ حسن اور اس پر حسنِ ظن نے شرم رکھ لی کیونکہ معشوق کو اپنے اوپر یہ اعتماد ہے کہ جو دیکھے گا وہ ضرور فریفتہ ہو جائے گا اس لئے کسی کو آزمانا نہیں چاہتا اور ہر ایک کے دعویِ الفت پر یقین کر لیتا ہے۔ "خود پر یا اپنے اوپر کی جگہ اپنے پہ لکھنا اب درست نہیں۔

واں وہ غرورِ عز و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

ہمیں پاسِ وضع کی شرم راہ میں ٹوکنے سے روکتی ہے اور انھیں عزت اور ناز کا گھمنڈ بزم میں بلانے سے مانع ہے "چلئے نہ تم خالی نہ ہم خالی"۔ اب سے پہلے شرفار راستے میں کسی کو مل کر ٹوکنے یا سرِ راہ کھڑے ہو کر باتیں کرنے کو معیوب سمجھتے تھے چنانچہ میر تقی میر کا قصہ مشہور ہے کہ جب انھوں نے دربار کی کسی بات سے ناراض ہو کر خانہ نشینی اختیار کر لی تھی تو ایک روز شاہِ اودھ خود انھیں لکھنؤ کے بازار میں گزرتے ہوئے مل گئے بادشاہ نے کچھ گفتگو کرنا اور کشیدہ ہو جانے کی وجہ پوچھنا چاہا تو میر نے یہ جواب دیا کہ راستہ میں باتیں کرنا شرفار کی وضع نہیں۔

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

کوئی انھیں طعنہ دے رہا ہے کہ معشوق غارت گرِ ایمان اور بے وفا ہے تم ایسے کافر کی گلی میں کیوں جاتے ہو یہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہاں یہ سب کچھ سہی مگر ہمیں بھی پروا نہیں جسے دین و دل عزیز ہو وہ نہ جائے ہمیں یہ چیزیں عزیز نہیں۔

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا۔ کیجئے ہائے ہائے کیوں

کہا کرتے ہیں کہ آدمی آدمی کے لئے نہیں رویا کرتا بلکہ اپنے آرام کے لئے روتا ہے اور یہ بھی محاورہ ہے کہ "فلاں شخص کے بغیر کون سے کام بند ہیں یہ کہتے ہیں کہ اگر غالب مر گیا

ہے تو اس کے لئے کیوں روئیے اور کیوں آہیں بھریئے۔ آخر وہ تھا کس کام کا مرگیا جانے دو۔ اگرچہ یہ بات شرح سے متعلق نہیں لیکن دل نہیں مانتا اس لئے لکھے دیتا ہوں کہ گو یہ غزل مرزا غالب کی بہترین غزلوں میں سے ہے لیکن استادی حضرت مرزا داغ دہلوی نے بھی جو اس پر طبع آزمائی کی ہے وہ نہایت ہی قابل قدر ہے اور ان کی پوری غزل غالب کی غزل کے بالکل ہم پلہ ہے کہ اگر اُس کے اشعار اس میں شامل کردیئے جائیں تو کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ غالب کے اشعار نہیں۔ مثال کے طور پر مختصراً میں صرف دو شعر لکھے دیتا ہوں۔

(۱) عشق و جنوں سے مجھکو لاگ ہوش و خرد سے اتفاق
پر یہ کہوں تو کیا کہوں میں نے ستم اُٹھائے کیوں

(۲) جرأتِ شوق پھر کہاں وقت ہی جب نکل گیا
اب تو ہیں یہ ندامتیں صبر کیا تھا ہائے کیوں

کہاں ہیں معترضینِ داغ داغ کی اس غزل کو دیکھیں اور بتائیں کہ غالب کے مقابلہ میں یہاں کس بات کی کمی ہے یہ بات اور ہے کہ داغ کا رجحانِ طبع روزمرہ اور محاورات کی طرف تھا جن کے بیان میں انھوں نے ملکِ سخن پر تنہا حکمرانی کی ہے اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو اپنی خوش بیانی میں لے لیا ہے داغ کے وہاں بازاری اشعار بھی کچھ ہیں لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ بھی وقت اور موقع کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں اور انسانی زندگی کے اس ضروری شعبہ پر بھی حاوی ہو جاتے ہیں داغ کے وہاں عالی خیالی کی بھی کمی نہیں مگر معترضینِ داغ دوسرے اساتذہ کو بڑھانے کے لئے جو بے انصافیاں داغ کے ساتھ کرتے رہے ہیں اسے صرف تنگ نظری کہا جا سکتا ہے مجھے اس معاملہ میں کسی دوسرے معترض کا گلہ نہیں لیکن تعجب ہوتا ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ مولانا حسرت موہانی کی جیسی ہستی بھی داغ کی محاسن کی طرف سے منہ پھیرے ہوئے ہے اور ان کی خوبیوں کو برا ایمان شاکر پیش کر رہی ہے۔ ثاقب کانپوری نے داغ کے ساتھ جو بے انصافیاں کی تھیں ان کا "شہاب ثاقب" لکھ کر میں ایسا جواب دے چکا ہوں جس کا جواب کافی عرصہ گزر جانے پر بھی اب تک نہیں ہوا لیکن افسوس ہے کہ مولانا حسرت موہانی کا میں احترام کرتا ہوں اور ان کے مقابلہ میں قلم اُٹھانا پسند نہیں کرتا کاش

کبھی مجھ سے اور ان سے دوبدو گفتگو کی نوبت آئے۔ آخر میں داغ کا ایک شعر اور لکھ کر میں اس بحث کو ختم کرتا ہوں ملاحظہ کیجئے کیا لکھا ہے۔

(داغ) چکر میں مثلِ سنگ فلاخن ہوں دیکھئے
پھینکے مرے نصیب کی گردش کہاں مجھے[1]

(۱۱۴)

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

میرے سوال کے جواب میں جو تم بوسے کا انداز دور سے کلی کو دکھا کر بتاتے ہو اس کی سند نہیں اچھی پاس آؤ اور بوسہ لے کر بتاؤ کہ یوں لیا جاتا ہے۔ یا میں تمھارا بوسہ لیتا ہوں لینے دو اور بتاؤ کہ کیا اسی طرح بوسہ لیا جاتا ہے۔ بوسہ کے لین دین کو میں نے ترک کر دیا ہے۔

(ناطق) نہ اپنی شاعری کی دسترس ہے بندِ محرم تک
نہ آتا ہے ہمیں مضمون ناطق بوسہ بازی کا

مگر اس میں بھی شک نہیں کہ غالب کا یہ شعر ایسا ہے جس پر ان کا منہ بھی چوما جاتا اور ہاتھ بھی۔ اس زمین میں حضرت بیان یزدانی کا مطلع بھی ملاحظہ کیجئے۔

آئے گا حشر کس طرح اُس نے بتا دیا کہ یوں
بندِ قبا کو کھول کر سامنے آگیا کہ یوں

بیان نے بھی کوئی بات ضرور پیدا کی ہے مگر ان کا مطلع کچھ زیادہ خیر ثقہ ہے اور اس میں تنافر نیز یہاں کے وہاں اور غالب کے مطلع میں کچھ کم ردیف ثانی محل نظر ہے۔ اس میں اپنا مطلع پیش کرتا ہوں ؎

(ناطق) چارہ گروں میں بحث تھی کیجئے یوں دوا کہ یوں
میں نے بھی آج کھا کے زہر ان کو بتا دیا کہ یوں

اس پر جو آپ کے جی میں آئے کہہ لیجئے مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ ردیف کوئی بیکار نہیں۔

[1] جس وقت یہ شرح لکھی گئی تھی مولانا حسرت موہانی بقیدِ حیات تھے۔ (والی آسی)

پرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

دلبری کے متعلق کیا دریافت کیجئے کہ کیسا ہوتا ہے جبکہ بے پوچھے ہی اس کا ہر اشارہ بزبانِ حال یہ بتا رہا ہے کہ یوں دل اُڑا لیا جاتا ہے "سہے" اب متروک ہے "بے کہے" لکھنا چاہئے۔

رات کے وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

اس شعر میں لف و نشر مرتب ہے۔ کہتے ہیں مجھے یہ تمنا ہے کہ وہ یہاں رات کے وقت شراب پیئے ہوئے آئے لیکن خدا نہ کرے یوں آئے کہ رقیب کو ساتھ لئے ہوئے ہو۔

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھئے
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

میں نے جو یہ پوچھا کہ غیر سے رات کو کیا بنی تو اس کے جواب میں ان کا سامنے آکر بیٹھنا دیکھئے اور بیٹھنے کا بے تکلفانہ انداز دیکھئے غضب دیکھئے کہ رات کو تنہائی میں غیر کے ساتھ وہ بے تکلف ہو کر بیٹھے اور اس پر یہ غضب کہ مجھے وہی انداز بزمِ عام میں بتاتے ہیں۔

بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھئے
اس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خاموش بیٹھے کیونکہ پاسِ ادب کے علاوہ اس کی خاموشی کا بھی یہی منشا ہے کہ یوں بیٹھے جس طرح ہم بیٹھے ہیں۔

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

اس ستم ظریف کے نزدیک میں ہی بزمِ ناز میں غیر تھا کہ جب میں نے اس سے یہ مطالبہ کیا کہ بزمِ ناز میں کوئی غیر نہ ہونا چاہیے تو اس نے مجھ کو اٹھا کر کہ دیکھو یوں غیر سے

بزمِ ناز خالی کی جاتی ہے۔

مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

مجھ سے یار نے جو یوں کہا کہ ہوش کس طرح جاتے ہیں تو اس اندازِ کلام کو سمجھ کر میرے ہوش اُڑ گئے اور منہ پر ہوائیاں اڑتی ہوئی دیکھ کر ہوا چلی اور اس نے یہ بتا دیا کہ یوں ہوش اُڑ کر چلے جاتے ہیں۔ یا میں اس سوال کو سن کر کھو گیا تو ہوا نے چلکر بات بتا دی۔

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

حیرتِ نقشِ پا نے مجھے سکھایا کہ یہاں خاکساروں کو اس طرح محوِ حیرت ہو کر پڑا رہنا چاہیے اور یہ وضع میرے کام آئی۔

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

اگر تو چاہتا ہے کہ وصالِ ذات میں بیتابیِ شوق زائل ہو جائے تو فنا فی الذات ہو جا کیونکہ موجِ محیطِ آب میں رہ کر اضطراب سے نجات پانے کی غرض سے فنا فی الما ہونے کے لئے پاؤں مارتی ہے۔ یا یہ کہ اگر تیرے دل میں یہ خیال ہے کہ وصل سے حصولِ مقصد ہو کر ازالۂ شوق ہو جاتا ہے تو یہ درست نہیں دیکھئے کہ موج عین دریا ہوتی ہے مگر بیتابیِ شوق اس سے جاتی نہیں۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

غالب کا کلام اس قول کی تردید ہے کہ ریختہ میں فارسی نظم کی بات نہیں آتی مگر یہی اپنے دیوانِ فارسی میں تحریر فرماتے ہیں کہ ؎

فارسی بین تا ببینی جلوہ ہائے رنگ رنگ   بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

(۱۱۵)

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

دل افسردگی کا سبب تنگ نظری ہے اس لئے آنکھیں کھول کر دنیا کی حالت دیکھ شاید طرح طرح کے مناظر دیکھنے کے بعد وسعت نظر ہو اور تیرا دل اس تماشے سے سیر ہو جائے یا تو دنیا کی رنگینیاں دیکھنے کا عادی ہو جائے۔

بہ قدرِ حسرتِ دل چاہئے ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

تر دامن گنہگار۔ کہتے ہیں ذوقِ معاصی میں میرے دل کی یہ وسعت ہے کہ اگر سات سمندر کا پانی ملے تو کہیں جا کر ایک گوشۂ دامن تر ہو سکے یعنی مجھے کثرتِ معاصی کی حسرت ہے یوں تھوڑے بہت کے لئے گنہ بے لذت کون کرے اور کثرت معاصی کا لطف دنیا کی تنگ ظرفی سے حاصل ہونے کی امید نہیں جس کے متعلق لکھتے ہیں ؎
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
اسی مضمون کا ایک شعر پہلے لکھ آئے ہیں۔

(غالب) دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
(ناطق) رکھتا ہے تلخ کام غمِ لذتِ جہاں
کیا کیجئے کہ لطف نہیں کچھ گناہ کا

اگر وہ سرو قد گرمِ خرامِ ناز آجاوے
کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

قمری کا رنگ راکھ کا ہونے کی وجہ سے اسے خاکستری کہتے ہیں قمری کو غالب نے کفِ خاکستر باندھا ہے۔

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے
اور قمری عاشق سرد ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ اگر میرا معشوق جو سروِ آزاد ہے خرامِ ناز سے گلشن میں آئے تو باغ کی ہر مشتِ خاک قمری کی طرح اُس پر فریفتہ اور نالہ فرسا ہو۔

(۱۱۶)

کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

ترکِ اصنام کا مجھے طعنہ نہ دو کیونکہ کعبے میں جا رہا تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ میں اہلِ بت خانہ کے حقِ صحبت کو بھول گیا ہوں۔

(ناطق) یہ خدا کی شان تو دیکھئے کہ خدا کا نام ہی رہ گیا
مجھے تازہ یادِ بتاں ہوئی جو حرم سے شورِ اذاں اُٹھا
(وله) دل رہے صرف ہجومِ غمِ دلبر کے لئے
تین سو ساٹھ گھر اُجڑے ہیں اسی گھر کے لئے

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

ڈال دو کو آگ لگے ان کے خیال میں خلوص فی العبادت باقی نہیں رہتا حالانکہ چاہئے تو یہ تھا کہ خدا کی یاد میں شراب اور شہد کی لاگ کی ضرورت نہ ہوتی جس کی نہریں جنت میں بہتی ہوں گی۔ حضرت رابعہ بصری کا قصہ مشہور ہے کہ ایک روز آپ جذبے میں ایک ہاتھ میں آگ اور ایک ہاتھ میں پانی لیکر اُٹھیں ہم نے پوچھا کیا ارادہ ہے تو فرمایا کہ جی چاہتا ہے جنت کو آگ لگا دوں اور دوزخ کو بجھا دوں تاکہ اہلِ عبادت یادِ حق میں خلوص پیدا کریں اور ان کی ریاضت میں نفسانی لذائذ کی طمع اور عذاب کے خوف کو دخل نہ رہے۔

(ذوق) کب حق پرست زاہدِ جنت پرست ہے
حوروں پہ مر رہا ہے یہ شہوت پرست ہے

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قطِ قلمِ سرنوشت کو

جب میرے نوشتۂ تقدیر کی بنیاد ہی کجی پر ہے تو پھر راہ ورسم ثواب سے مجھے انحراف کیوں نہ ہو ؎

خشتِ اول چوں نہد معمار کج — تا ثریا می رسد دیوار کج

غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

لہنا حاصل وصول پھل ۔ یہ اردو کا ایک خاص لفظ ہے جو دہلی اور اس کے نواح کے سوا بھی بولا جاتا ہے مگر صرف فصحا رین کہتے ہیں میری سعیِ ناشکور سے مجھے لہنا نہیں یہ کمبخت اگر تا تمام تباہ نہ ہو تو تمام برباد ہو جائے ۔

(۱۱۷)

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

وارستہ بے نیاز ۔ دوستی کا نہ سہی دشمنی کا سہی لیکن آپ واسطہ ضرور رکھیے یہ مضمون دو تین جگہ اور لکھا ہے ۔

(۱)
ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل میں کسی طرح سے مجبور نہیں

(۲)
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

(ناطق)
ہم بے کسوں کو یہ بھی کہاں تھے بھلا نصیب
جتنے ستم ہوئے ترے احسان ہو گئے

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

ضعف سے رنگ اڑ جاتا ہے ۔ کہتے ہیں میرے ضعف نے رنگِ اختلاط کو ایسا اُڑا دیا ہے کہ اب تصویرِ محبت کا سا خوش آئند رنگ بھی دل پر بار ہے یعنی رنگِ محبت بھی دل پر نہیں ٹھہرنے پاتا ۔ حاصل یہ کہ ضعف نے جو نتیجہ ہے عبادت کا میری روح کو رنگِ اختلاط سے مجرد کر دیا ہے اور اب نقشِ محبت بھی اس کے لئے بار ہے کیونکہ مادیت کا اختلاط چاہے کسی شکل میں کیوں نہ ہو روحانیت کی شان تجرد کے منافی ہے ۔

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

یہ شعر غالب کے اس شعر کی دوسری صورت ہے ؎

ذکر میرا بہ بدی بھی انھیں منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

(ناطق)
تمہارے منہ سے گلہ سن کے ہے مجھے شکوہ
عدو کی یاد نہ آئے تو کیوں شکایت آئے

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یہ ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو

کہتے ہیں کہ ہر درد کی دوا پیدا ہوئی ہے اگر یہ بات سچ ہے تو غمِ الفت ہی کی دوا کیوں نہیں ہوگی ضرور ہوگی تلاش کرو ۔ یا یہ کہ اگر یہ بات سچ ہے تو غمِ الفت کی جیسی عام شکایت کی دوا کیوں نہیں ہونا چاہئے لیکن جب اس کی دوا موجود نہیں ہے تو یہ دعویٰ باطل ہو گیا کہ ہر درد کی دوا پیدا ہوئی ہے ۔

(138)

ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

بیکسی نے کسی کا احسانمند ہونے کا موقع نہ آنے دیا کہ جب کسی سے واسطہ ہی نہ پڑا تو کون ان پر احسان کرتا جو شرمندۂ احسان ہوتے اور خود کو کسی کا احسانمند نہ ہونے دینا خود ان کا اپنے اوپر احسان ہے اس لئے اپنے ہی سے شرمندۂ احسان بھی ہیں۔ یا بیکسی نے کسی سے کسی طرح کا واسطہ ہی نہ پڑنے دیا یہاں تک کے شرم بیکسی بھی مجھے صرف اپنی ہی ذات سے ہے۔ "اپنے سے خجالت کھینچتا ہوں" از خود خجالت میکشم" کا ترجمہ ہے لیکن موجودہ اردو کا درست طرزِ بیان نہیں۔

ہے آدمی بجائے خود اِک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

اپنی بزم خلوت کو بھی انجمن سمجھتے ہیں کیونکہ آدمی بجائے خود اِک محشرستانِ خیال ہے اس طرح ہمارا تصور ہزاروں خیالی تصویریں ہمارے سامنے موجود رکھتا ہے۔

(ناطق)
ہو گئی خلوت بھی جلوت اس تصور کے نثار
کنجِ تنہائی بھی اپنا انجمن ثابت ہوا

ہنگامۂ زبونی ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

اہلِ غیرت کے لئے غیر سے اثر پذیری پست ہمتی کا مظاہرہ ہے اس لئے اہلِ زمانہ سے یا..... عبرت حاصل کرنا بھی ہمت مردانہ کے منافی ہے۔ یا انفعال نام ہے اس شرمندگی کا جو کسی گناہ یا خفیف الحرکتی پر حاصل ہو یعنی اپنی بد اعمالیوں سے شرمندگی اُٹھانے کا موقع آنے دینا ہمتِ انسانی کے لئے نہایت ہی ذلیل مظاہرہ ہے چاہیے تو یہ کہ آدمی خود کو ایسی حالت میں رکھے کہ دوسروں کی بد اعمالی سے بھی عبرت حاصل کرنے کے مقام سے بالاتر ہو حاصل یہ کہ انسان بدکرداری سے ایسا دور رہے کہ خود کرکے شرمندگی اٹھانا تو رہا درکنار اسے دوسروں کی شرمندگی سے عبرت حاصل کرنے

کا بھی موقع نہ آئے۔

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

وارستگی یا بے نیازی اس بات کا بہانہ نہیں ہو سکتی کہ تو بیگانۂ خلق ہو جائے بلکہ اگر وحشت کرنی ہے تو خود اپنے آپ سے کر یعنی خودی کی پرواہ چھوڑ دے۔ "اپنے سے کر" اس معنی میں اب نہیں بولا جاتا ایسے موقع پر "خود سے کر" مستعمل ہے "آپ سے کر" آج کل "اپنے والے سے کر" کی جگہ ضرور بولا جاتا ہے۔ "اپنے سے کر نہ غیر سے" میں ان لوگوں کے خیال کے مطابق ذم کا پہلو نکلتا ہے جو شعر کے باقی الفاظ کی پرواہ نہیں کرتے۔

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

ہر انسان کو یہ افسوس رہتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں کچھ نہ کیا چاہے اس کی عمر عبادت جیسے مبارک شغل ہی میں کیوں نہ صرف ہوئی ہو یہ شعر غالب کے مندرجہ ذیل شعر کا بہترین بیان ہے۔

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

اس کی بزم میں آبیٹھے ہیں تو اب اس ڈر سے ہمارا اُٹھنا محال ہے کہ مار کر نکالے جائیں گے ابھی چاہے ہمارے سر پر قیامت ہی کی مصیبت کیوں نہ آجائے مگر ہم ٹلتے نہیں دوسرا شعر تقریباً اسی مضمون کا لکھا ہے۔

(غالب)
اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

(داغ)
حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے
اور ہوں گے تری محفل سے اُبھرنے والے

(ناطق) میں جیتے جی تو آپ کی محفل سے اُٹھ چکا
ہاں یہ کہ قتل کر کے جنازا اُٹھایئے

(۱۱۸)

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیا ہے نواسنجانِ گلشن کو

نواسنجانِ گلشن اگر میرے نالہ و شیون کو پسند نہیں کرتے تو بھی میرے وجود سے ان کا کیا نقصان ہے میں گرفتارِ قفس ان کی ہمنوائی کا تو دعویٰ نہیں کرتا ان کے لطفِ صحبت میں تو مخل نہیں۔

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

دشمن کے لئے دوست کی ہمدمی حاصل کرنا اگر آسان نہیں تو نہ ہو میرے واسطے یہ بات کیا کچھ کم رنج دہ ہے کہ خدا نے اسے دوست کی آرزو دی اور اس کا دل اس کی محبت سے لبریز کیا۔ "لفظ رشک" کے معنی یہ ہیں کہ انسان کسی کی کوئی خوبی یا کوئی چیز دیکھ کر یہ تمنا کرے کہ ایسی ہی میرے پاس بھی ہوتی اس معنی میں اس لفظ کا یہاں استعمال غلط ہوگا مگر اصطلاحِ شعر میں یہ لفظ عام طور پر "حسد" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اس لئے مصنف پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

نہ نکلا آنکھ سے تیری اِک آنسو اس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو

سوزن نکیلی ہونے کی وجہ سے مژگاں سے مشابہت رکھتی ہے۔ کہتے ہیں سنگدل تیری آنکھ سے اُس زخم پر ایک آنسو بھی نہ نکلا جس کو سیتے وقت مژگانِ سوزن نے بھی خون کے آنسو بہائے یعنی فولاد کا دل بھی پانی ہو گیا۔

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

فراق میں دستِ جنوں اور وصل میں دست شوق بن کر۔ "لفظ جاناں" کا اس طرح استعمال اب درست نہیں۔

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

تو جب قتل عام پر آتا ہے تو خون کی ندی بہ جاتی ہے جو ایک ناقابل دید نظارہ ہے ہم نے تیرے گھوڑے کا اس خون کی ندی سے تیر کر نکلنا ابھی نہیں دیکھا ہے اس لئے قتل گہ کا دیکھنا آسان سمجھتے ہیں۔

ہوا چرچا جو میرے پانوں کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جنبش جوہر نے آہن کو

وجہ بیتابی شوق جنبش زنجیر ہے کہ پھر ایسے اُچھل کود کے جوہر دکھانے کا موقع کہاں ملے گا۔ "لفظ کاں" کا اس طرح بلا اضافت اور بلا اعلانِ نون استعمال اب درست نہیں۔

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آئے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

مجھ نامراد کو ہر سامانِ اُمید سے شکلِ یاس نظر آتی ہے اس لئے کسی صورتِ امید پر کیا خوشی کروں جب حالت یہ ہو کہ تباہی میری مساعی کے درپئے ہے۔

(ناطق) جو جائیں آگ لینے ہم تو دوزخ سرد ہو جائے
جو ہم پانی کو جائیں آگ لگ جائے سمندر میں

(140)

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

ایمانداری اردو محاورے میں کہتے ہیں وفاداری کو جو بشرطِ استواری ہو مطلب یہ کہ وفاداری پر ثابت قدم رہنا یہ ایسی عزت کی بات ہے کہ اگر برہمن وفاداری کے ساتھ بتخانہ میں مرجائے جس کے لئے مذہب عدم ایمان کا فتویٰ دیتا ہے تو اسے کعبے میں جو اہلِ ایمان کے خدا کا گھر ہے دفن ہونے کی عزت دی جائے۔

(ناطق) بتوں کو چھوڑ دینا اہلِ ایماں کی نشانی ہے
جسے ایمان واعظ نے کہا وہ بے ایمانی ہے

یہاں میں نے "بے ایمانی" کی "یائے اول" کو تقطیع میں نہیں لیا جس پر اعتراض ہو سکتا ہے مگر کیا کیجئے کہ روزمرہ میں بھی اس کی یائے اول کسرۂ الف میں دب کر ختم ہو جاتی ہے۔

شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

(نظیر اکبرآبادی) دکھ پانے والے بچے جو دنیا میں آتے ہیں
لچھن سب ان کے پہلے ہی پہچانے جاتے ہیں

مثل مشہور ہے ہونہار پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں۔

نہ لٹتا دن کو تو کیوں رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

انسان کے پاس جب کچھ نقد ہوتا ہے تو وہ سفر میں بے فکر ہو کر نہیں سوتا کہ اسے چوری کا ڈر لگا رہتا ہے اور جب کچھ پاس نہ رہے تو آرام کی نیند سوتا ہے۔ یہ دن میں لوٹ لئے گئے پاس کچھ نہ رہا اب رات کو آرام سے سونے کا سامان ہو گیا۔

(ناطق) مٹ گیا چوری کا کھٹکا ہٹ گیا بارِ گراں
اب کھلا ناطق کہ رہزن مجھ پہ احساں کر گیا

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویاں ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

جب ہم جگر کاوی کر کے جواہرِ سخن جیسی بے بہا دولت کو حاصل کر سکتے ہیں تو کیوں پتھر ڈھونڈھنے کے لئے معدن کنی کرنے کو جائیں کہ وہ دولت فانی ہے اور یہ دولت باقی ہے
لِاَنَّ الْمَالَ یَفْنِیْ عَنْقَرِیْبٍ ۔ وَاَنَّ الْعِلْمَ بَاقِیٍ لَا یَزَال ۔

مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالب
فریدون و جم و کے خسرو و داراب و بہمن کو

فریدوں۔ جم۔ کیخسرو و داراب و بہمن ملک ایران کے بڑے باوقار بادشاہ ہوئے ہیں یہ سب سہی مگر حضرت سلیمان سے ان بادشاہوں کو کوئی نسبت نہیں اور میرا بادشاہ سلیمان جاہ ہے اس لئے وہ ان سب سے عالی مقام ہے۔ اردو میں جب چند ناموں کے درمیان عطف لانا ہو تو صرف آخر میں حرفِ عطف کو لایا جاتا ہے مگر مصنف نے یہاں ہر نام کے بعد واوِ عطف کا استعمال کر دیا ہے یہ بیانِ فارسی ہو سکتا ہے۔

(119)

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

پانو دھو کر پینے کی رسم ہندوستان میں قدیم سے ہے یہاں چیلے اپنے گرو کے پانو دھو کر پیتے آئے ہیں اور یہ رسم تو اب تک پورب کے حصے میں موجود ہے کہ جب بھانجی کی شادی ہوتی ہے تو ماموں اپنی بیوی کے ساتھ گانٹھ باندھ کر جوڑے سے لڑکی کا پانو ایک لگن میں رکھ کر دھوتا ہے اور میاں بیوی دونوں اس میں سے چلو میں لے کر ایک ایک گھونٹ پیتے ہیں۔ یہاں مصنف نے معشوق کو بوجہ احترام اس درجے تک پہونچا دیا کہ پانو دھو کر پئے جائیں مگر کہتے ہیں کہ اس کی ضد کا یہ عالم ہے کہ میرا پانو دھو کر پینا بھی گوارا نہیں۔ مصنف کے اس شعر کو آج کل حسنِ تخییل یا خوبیِ بیان نہیں سمجھا جاتا مگر جب یہ

ایک رسم کا حامل ہے تو اب کیا برائی رہ گئی۔ "لفظ پانو" کی کتابت پہلے دہلی میں "الف نون واؤ" سے تھی اور لکھنؤ میں "الف واؤ نون" سے لیکن اب یہ دیکھا جاتا ہے الف واؤ نون کی کتابت عام ہو چلی ہے۔ نون غنہ فی الحقیقت کوئی مستقل لفظ نہیں اور نہ تنہا اس کی آواز ہوتی ہے یہ حرف ہائے مخلوطہ کی طرح اپنے ماقبل حرف علت کے ساتھ مل کر آواز دیتا ہے تو اب یہ دیکھنا چاہیے کہ یہاں نون کی آواز الف کے ساتھ نکلتی ہے یا واؤ کے ساتھ میں جب اس پر غور کرتا ہوں تو یہ آواز الف ہی کے ساتھ نکلتی ہے اس لئے غالب کا طرز کتابت درست معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اس معاملہ میں بعض اہل علم حضرات سے گفتگو کی تو ان کا یہ خیال پایا گیا کہ نون کی آواز الف کے ساتھ ہی نکلتی ہے اور واؤ کے ساتھ بھی اس لئے اس کا طرز کتابت یوں ہونا چاہیے "پاؤں"۔ اور دیکھا بھی یہی گیا ہے کہ بعض لوگ اس طرح لکھتے ہیں۔

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

ایک غیر معلوم بوڑھیا کے یہ کہہ جانے پر کہ شیریں مر گئی بے سوچے سمجھے اور بے تحقیق کئے جان دے دینا کوہکن کا کمال سادگی ہے اور اہل کمال کے پانوں پڑا کرتے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں اس بڑھیا کو بد دعا دیتے ہیں جو خسرو کی طرف سے جھوٹی خبر مرگِ شیریں پہونچانے کے لئے آئی تھی۔

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو

یہ ہماری آوارہ گردی کی سزا ہے کہ اسیر ہو کر راہزن کی غلامی کر رہے ہیں یعنی راہِ حق سے انحراف کا یہ نتیجہ ہے کہ شیطان کے پھندے میں پھنس گئے۔ "پانوں دابتے ہیں" کا استعمال اب بھی نواحِ دہلی میں موجود ہے لیکن ملک کے دوسرے حصوں میں "پاؤں دبانا" بولا جاتا ہے۔

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا فگار ہیں مجھ خستہ تن کے پانو

فکرِ درماں خود درد سے زیادہ مصیبت ہے کہ میں جو اپنے زخموں کے لئے مرہم کی فکر میں دور دور مارا مارا پھرا ہوں تو اب سارے جسم سے زیادہ پانو زخمی ہو گئے ہیں۔

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو

جو حرکت کہ بیش از معمول کی جائے وہ کچھ دنوں کے بعد بلا قصد بھی صادر ہونے لگتی ہے۔ کہتے ہیں میرا ذوقِ دشت نوردی دیکھئے کہ بعد مردن بھی کفن میں پانوں کو حرکت باقی ہے۔ میرے پانوں کفن کے اندر کے محلِ استعمال میں جو مصنف نے میرے اندر کفن کے پانو لکھا ہے اس طرزِ بیان کو مستحسن نہیں سمجھا جاتا اسے بدترین تعقید کہتے ہیں کہ یہاں معنی بھی کچھ الٹے ہو جاتے ہیں۔

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو

ہر طرف موسم بہار میں کثرتِ گل کا یہ عالم ہے کہ مرغِ چمن پرواز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے پانوں پھولوں میں الجھ جاتے ہیں۔ یا یہ کہ ہوائے موسمِ بہار میں گل آفرینی کا مادہ اس کثرت سے بھرا ہوا ہے کہ جب اس کی فضا میں مرغِ چمن اڑنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے بال و پر الجھتے ہیں۔

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پانو

اس بتِ نازک بدن کے پانوں دکھنے کا اس کے سوا کیا سبب ہو سکتا ہے کہ رات کو کسی کے خواب میں گیا ہو گا یہ معشوق کے لئے انتہائے نزاکت اور عاشق کے لئے

انتہائے غیرت ہے۔۔

غالب مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

خسرو حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ جنھیں حضرت سلطان الاولیا نے یہ دعا دی تھی کہ تو بلبلِ ہندوستان ہوگا آپ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کے چھوٹے بھائی تھے اور آپ کا مزار حضرت سلطان الاولیا کے مزار کے سامنے ہے ہندوستان کے اولیا میں آپ کا شمار ہے اور آپ کا مرتبہ فارسی نویسی میں کسی ایرانی استاد سے کم نہیں اردو شاعری کے آپ موجد ہیں اور آپ کا کلام اردو جس شکل میں بھی موجود ہے ہر دور میں مقبولِ عام رہا ہے اور ہے آج تک بچے اور بڑے سب آپ کے کلام سے لطف حاصل کرتے ہیں۔ کہتے ہیں میں حضرتِ امیر خسرو کے معتقدین میں سے ہوں تو میرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہوگا۔

(۱۲۰)

واں اسکو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار
یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

معشوق اکثر ہولِ دل کی شکایت کیا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں میں ان کی ہولِ دل کا حال سُن کر شرمندہ ہوجاتا ہوں کہ کہیں یہ میری آہ کا اثر نہ ہو۔ اس شعر میں ایک لطفِ بیان بھی ہے کہ جہاں اُنھیں ہولِ دل کی مصنوعی شکایت ہے وہاں ہمیں بھی اپنی آہ کی ہوا باندھنے کا موقع ہاتھ آگیا رہا شرمساری کا عذر تو یہ ایک مذاق ہے۔

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم کو دیکھ
آئینہ تا کہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

دمِ واپسیں جو شخص سامنے ہوتا ہے اس کا عکس مردے کی آنکھ میں رہ جاتا ہے اس لئے اکثر مقتول کی آنکھ سے قاتل کا پتہ لگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آئینہ ہونا

عیاں ہونا ظاہر ہونا۔ مطلب یہ کہ ذوقِ ستم میں اسے اپنی بھی پرواہ نہیں رہتی اور یہ بھی نظر نہیں آتا کہ اپنے بچت کی صورت نکالے تا کہ رازِ قتل دیدۂ نخچیر سے آئینہ نہ ہو۔ یا یہ کہ وہ صرف دیدۂ نخچیر کے آئینہ میں منہ دیکھنا پسند کرتا ہے اور تاوقتیکہ یہ آئینہ نہ ہو وہ اپنا منہ کبھی نہیں دیکھتا۔

(۱۲۱)

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صد رہ آہنگ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو

ہمارا یہ ارادہ ہے کہ سو طریقے سے یار کی زمینِ قدم کو بوسہ دیں اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کے کوچہ میں پہنچ کر ہمیں بار بار غش آتا ہے اور ہم گر کر زمین بوسِ قدم ہوجاتے ہیں "پئے ہم" کا استعمال مصنف کی خصوصیت ہے۔

غش کھا کے داغ یار کے قدموں پہ گر پڑا
مدہوش نے بھی کام کیا ہوشیار کا (داغ)

دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے
کس قدر ذوقِ گرفتاری ہم ہے ہم کو

مجھے اور میرے دل کو باہم مل کر گرفتار ہونے کا بڑا شوق ہے اسلئے میں اور وہ مجھے گرفتارِ وفا رکھتا ہے۔

ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن
تیرے کوچہ سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو

اگر یہاں نقش بالاضافت پڑھا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ تیرے کوچہ کی افتادگی میں بہ عالمِ ضعف نقشِ پائے مور ہمارے لئے ایک طوق گراں بنا ہوا ہے تو اب تو ہی بتا کہ یہ پہاڑ لے کر ہم تیرے کوچہ سے کہاں بھاگ سکتے ہیں۔ یہاں "پائے مور" کی جگہ "پے سمور" بھی "پئے ہم" کا جواب ہے۔ اگر نقش بلا اضافت لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ناتواں ہونے

کے لئے ایک خطِ نقش بھی روک دینے کو کافی ہوتا ہے تو تیرے کوچہ کی زیبائش اور نقش و نگار سے چھوٹ کر یہ عالمِ ضعف ہم کہاں بھاگ سکتے ہیں۔

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

اگر تم یہ جان کر تغافل کرو کہ ہم اس سے بے التفاتی کر رہے ہیں تو کچھ امید کی بھی شکل ہو گی کیونکہ اس سے تعلق کا پتہ چلتا ہے یہ بے پروائی کا طرز چشم غلط انداز ہمارے لئے زہر کا کام ہے جس سے نہ التفات کا پتہ چلتا ہے نہ بے التفاتی کا اور اس لئے اس نے ہمیں عجب امید و بیم کی حالت میں ڈال رکھا ہے۔

رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں
نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہم کو

مرغِ سحر کا نالہ میرے لئے دو دھاری تلوار کا کام کر رہا ہے جس کی ایک باڑ تو اس بات کا رشک ہے کہ اسے بھی میرا سا پر درد نالہ کرنا آتا ہے اور دوسرے خود اس کی بانگِ حزیں کا درد۔ یا رشک ہم طرحی کا مطلب یہ کہ افسوس! مجھے ایسا پُردرد نالہ کرنا نہیں آتا۔

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ ولیکن ناچار
پاسِ بے رونقیِ دیدہ اہم ہے ہم کو

دل کے خون کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی لیکن مجبوری یہ آپڑی کہ ہم آنکھوں کو بے رونق نہیں دیکھ سکتے جنھیں لالہ زار بنانے کے لئے خونباری کے سوا دوسری تدبیر نہیں۔

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

ہنسنا اس جواب کے لئے کہ ترے ہی سر کی قسم ہم ترا سر اُڑا دیں گے۔ خوب طرزِ بیان ہے۔

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

معشوق کی نازکی کا یہ عالم ہے کہ مجھ فغاں کش کی خاموش صورت کو دیکھکر بھی اسے فغاں تصور کرتا ہے۔ مثل ہے کہ فقیر کی صورت سوال ہے اور میری کمزوری کا یہ عالم کہ تغافل بھی مجھ پر ستم کا کام کرتا ہے یعنی دو پلے برابر ہیں کہ اُدھر خموشی فغاں بن جاتی ہے اور یہاں تغافل ستم۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

ہمیں سیر و تماشا کی ہوس نہیں اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ لکھنؤ کیوں آئے یہ حسنِ طلب ہے پڑھئے اگلا شعر۔

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لکھنؤ آنے سے مقصود بالذات لکھنؤ آنا نہیں بلکہ اس سلسلہ میں یہاں آئے ہیں کہ سیر نجف اشرف اور طوافِ حرم کے لئے ہمیں جانا ہے اور یہاں کے اہلِ ہمت احباب سے اس سلسلہ میں امداد حاصل کرنا ہے۔ پڑھئے اگلا شعر۔

لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

ہمارا جادۂ راہ کافِ کرم کی کشش ہے کہ ہمیں سیرِ نجف اور طواف حرم کے ارادے میں امداد حاصل کرنے کی توقع کسی اہلِ کرم کے پاس لکھنؤ لائی ہے اور کہیں لئے جاتی ہے۔ یہ شرح اس لئے کی گئی کہ دہلی سے مکہ و نجف جاتے ہوئے لکھنؤ راستہ میں نہیں پڑتا بلکہ یہ شہر جانب مخالف میں ہے بقول سعدی ؎

ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی کین رہ کہ تو میروی بترکستان است

(۱۲۲)

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

تمہارے اور غیر کے درمیان میں جو رسم و راہ ہو وہ تم جانو ہم اس میں کچھ نہیں بولتے لیکن کہنا صرف یہ ہے کہ اگر کبھی کبھی ہماری بھی خبر لے لیا کرو تو اس میں کیا حرج ہے۔ اس شعر میں جو مصنف نے دوسری ردیف کا استعمال کیا ہے وہ اب اردو کا درست طرزِ بیان نہیں سمجھا جاتا اس لئے اگر کوئی شاعر آج ایسا لکھے تو قابلِ گرفت ہوگا ایسے مقام پر یا تو "کیا گناہ ہے" یا "کیا گناہ ہوگا" بولا جائے گا۔

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

میرے قتل پر قیامت کے مواخذہ سے بچ نہیں سکتے کیونکہ اگر دشمن بحیثیت قاتل ہونے کے دارو گیر ہوگی تو تم گواہی میں پکڑے جاؤ گے۔ جس میں خاموش اعانت جرم بھی نکلتی ہے۔

کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناشناس ہیں؟
مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

یہ کہنے پر کہ ناحق شناسی اور بے گناہ کُشی انسانیت سے بعید ہے تم یہ جواب دیتے ہو کہ ہم تو ماہ و خورشید ہیں اچھا سہی تو یہ بتاؤ کہ کیا وہ بھی بے گناہ کش و ناحق شناس ہیں۔

اُبھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

اس کی نقاب میں ایک تار ابھرا ہوا دیکھ کر میں اس رشک سے مرا جاتا ہوں کہ یہ کسی کا تارِ نظر تو نہیں جو اندر پہونچ کر رہ گیا۔

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

خوشی تو میکدہ کی تھی لیکن جب وہیں نہ رہ پائے تو بادلِ ناخواستہ جہاں کہیے پڑ کر دن گزار دیں۔

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تِری جلوہ گاہ ہو

حدیث میں آتا ہے کہ اہلِ جنت جلوۂ ذات کو اس طرح صاف دیکھیں گے جس طرح چودھویں رات کے چاند کو دیکھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں جنت کی جتنی تعریفیں کی جاتی ہیں وہ سب خوش آئند ہیں لیکن ہمارے کام کی بات اس کا تری جلوہ گاہ ہونا ہے اس لئے اور کچھ ہو یا نہ ہو خدا کرے یہ بات ضرور ہو۔ دیکھیے اس شعر کی تہ

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

غالب کبھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یارب اور مرا بادشاہ ہو

مجھے بادشاہ کی زندگی اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔

(۱۲۳)

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو
کہے سے جب نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

وہ دن گئے جب یہ فکر رہتی تھی کہ کیونکر اُن سے مطلب کی گفتگو کا موقعہ نکالیں اب تو موقع نکل چکا کہہ چکے اور جب اس سے کوئی نتیجہ نہ نکلا تو بتاؤ یہ عالم یاس اب کیا کریں۔

اظہارِ رازِ عشق میں دو دقتیں ہوئیں (داغ)
پہلے تو بیان چاہیئے پھر ان جا ہیئے

یہاں مصنف نے کہو کے قافیہ میں گفتگو کو نظم کیا ہے یہ درست نہیں۔ فارسی کے شعراء

نے اس قسم کے مستقل اور مختلف قافیوں کو ایک غزل میں نظم کر دیا ہے۔ چنانچہ حافظ کے وہاں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں لیکن اردو شاعری اسے روا نہیں رکھتی۔

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

بہ عالم ناکامی ہمارے نزدیک اب صرف اس فکرِ ذہنی کا نام وصال رہ گیا ہے کہ نہ ہو تو کہاں جائیں یا کیا کریں اور ہو تو کیونکر ہو

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گومگو تو کیونکر ہو

خلوت بھی ہے اور مقصد بھی دونوں طرف ایک لیکن یہاں ادب ہے اور یہی کشمکش ادب تو کس طرح مطلب کی بات نکالیں اور ادھر حیا ہے اور یہی حیا کی گومگو تو کیونکر بات بنے اور کس کی طرف سے اقدام ہو۔

تمہیں کہو کہ گزارہ صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

اگر سب بتوں کی تمہاری سی عادت ہو تو تمہیں کہو کہ دنیا میں صنم پرستوں کا کیونکر گزارہ ہو لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کا گزارا ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ تمہاری عادت دنیا کی حسینوں سے نرالی ہے۔ خو کا قافیہ بھی یہاں درست نہیں۔

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

جب تم آئینہ میں اپنے عکس ہی کو دیکھ کر جس میں کچھ جان اور تابِ مقابلہ نہیں اُلجھ پڑتے ہو تو بتاؤ اگر شہر میں تمہارے مقابلہ کے ایک دو حسین ہوں تو اس عادت سے تمہارا کیا حال ہوگا۔ یا یہ کہ تمہاری عادت اپنے عکس سے بھی لڑنے کی ہے تو بتاؤ کہ اگر شہر میں ایسے ہی دو چار رسانے سے لڑنے والے پیدا ہو جائیں تو شہر والے

غریب کیا کریں۔

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

میرا روزِ سیاہ عام راتوں کے مقابلہ میں اس قدر تاریک ہے جس قدر دن کے مقابلے میں رات تو اب جسے ایسا دن نصیب ہو تو وہ رات کو خواہ مخواہ دن کہے گا۔

(ناطق) دن ہے یا رب یا مرا روزِ سیاہ
شب کو جو دن تھا یہ اس کی رات ہے

ہمیں پھر ان سے امید اور انھیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ دو تو کیونکر ہو

وہ ہماری بات ہی نہ پوچھیں تو ہمیں ان سے پھر کیونکر امید ہو اور ہم سے مل کر انھیں ہمارا حال معلوم نہ ہو تو ہماری کیا قدر کریں یہ سب باتیں تو گفتگو ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں مصنف نے اردو کے قافیے کو بھی غلط لکھ دیا کہ اس لفظ کی کتابت دو۔ ہ کے ساتھ ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کتابت سے زیادہ تلفظ کا خیال کرتے تھے اور سنا بھی جاتا ہے کہ اکثر لوگ اس لفظ کے تلفظ میں "ہ" کی آواز نہیں نکالتے۔

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

ہمارا یہ گمان غلط نہ تھا کہ ان کے خط کا آنا باعثِ تسلی ہوگا لیکن دیدۂ دیدار جو تسلی نہ ہونے دے اور اپنی ضد لگائے تو اب اس کا کیا علاج اور تسلی کیونکر ہو اس سے ملتے ہوئے مصنف نے کئی اشعار اور لکھے ہیں مثلاً

غالب (۱) باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

(۲) نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

اس نکیلی مژہ کو دیکھ کر تمہیں بتاؤ ایسا نشتر یا زہریلا ڈنک رگِ جاں میں گھسا ہوا ہو تو مجھ کو بےچینی کیوں نہ ہو۔

مجھے جنوں نہیں غالب ولے بقولِ حضور
فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

میری بیقراری بربنائے جنوں نہیں بلکہ یہ تو خود بادشاہ سلامت کا فرمان ہے "فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو"۔ یہ غزل فرمائشی ہے اور مصرعہ شاہ ابوظفر کا دیا ہوا۔

(۱۲۴)

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

(ناطق) دلِ گم گشتہ کے مذکور پر کھوئے گئے ہم بھی
وہ جب یوں کہہ گئے ہنس کر کہ اب ملتے ہو کس دل سے

مصنف کا مطلب یہ ہے کہ جب دل ہی نہیں تو دردِ دل کیوں ہو اور درد دل ہی نہ ہو تو پھر فغاں کا سبب کیا اور منہ سے کیوں چیخ و پکار کی جائے۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

وہ اپنی بے وجہ روٹھ جانے کی عادت کو نہیں چھوڑتے تو ہم اپنی بے خطا معافی نہ مانگنے کی وضع کیونکر ترک کر دیں کوئی وجہ ہو تو پوچھیں بے وجہ پوچھ کر کیوں خفیف ہوں۔

کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

جب کسی کمبخت میں طاقتِ ضبط نہ ہو تو میرا رازداں کیوں بنے ہائے غم خوار کی اس محبت کو آگ لگے کہ اس نے میرے غمِ نہاں پر بےچینی کا اظہار کر کے مجھے رسوا کیا۔

(ناطق) دردِ دل ہونا تھا افشا ہائے یوں اغیار پر
سر پکڑ کر رو رہا ہوں گریۂ غم خوار پر

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

عشق و وفا تو جیتے جی کے جھگڑے ہیں جب انھیں باتوں سے تنگ آ کر سر پھوڑ لینے کی باری آئے تو پھر کہیں بھی مر رہیں گے اس میں تیرے ہی سنگِ آستاں کی خصوصیت کیوں۔
اس مضمون کے موافق و مخالف مصنف نے اور بھی شعر لکھے ہیں۔

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

رودادِ چمن میں یہ بھی ہے کل کہ اس اسیرِ قفس کا آشیانہ بجلی کی نظر ہو گیا جس کی وجہ سے ہمدم روداد بیان کرتے ہوئے پس و پیش کرتا ہے یہ اسے سمجھا رہے ہیں کہ مجھے اس سے صدمہ کی کیا وجہ کچھ وہ اب میرا آشیانہ نہیں۔ خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدِرَ

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

ہم دل میں نہیں ہیں؟ استفہامِ انکاری یعنی اس شکوہ کے جواب میں کہ تم ہمیں نہیں ملتے تمہارا یہ کہنا بجا ہے کہ کیا ہم تمہارے دل میں نہیں بیشک تم ہمارے دل میں ہو بلکہ تم ہی تم ہو تو اب یہ بتاؤ کہ آنکھوں سے کیوں پنہاں ہو آخر انکھوں نے کیا قصور کیا ہے۔

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

جذبِ دل کا تو یہی کام ہے کہ تمہیں کھینچے اب تم بلاوجہ اپنی طرف کھینچ کر نہ بیٹھو تو کشاکش تک نوبت کیوں آئے اس میں دیکھ لو کہ کس کی زیادتی ہے اور جو تم جذبِ دل کا شکوہ کرتے ہو یہ کہاں تک درست ہے۔

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جسکے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

تم جس کے دوست بن جاؤ آسمان اس کی بربادی کی کیوں فکر کرے اسے معلوم ہے کہ تم کیسے یار مار ہو اور یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے۔ عوام میں ایک مثل مشہور ہے کہ۔ جس کا بنیا ہووے یار ۔ اُس کو دشمن کیا درکار

(ناطق) بتوں کی دوستی ہے دشمنی اپنے مقدر کی
کوئی کیا چین سے بیٹھے بُروں کا ہم نشیں ہوکر

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

تم دشمن کے اپنے ہو کر میرا کیا امتحان لیتے ہو اس کا نام تو ستانا ہے آزمانا نہیں میں اسے کیونکر برداشت کر سکتا ہوں کہ تم میرے صبر کا امتحان لینے کے لئے دشمن کے دوست بنو اور میں اس پر کیونکر صبر کر سکتا ہوں۔

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر سے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

"پھر کہیو" پھر تو کہو یا پھر کہنا۔ یہ لفظ میرؔ کی زبان کا ہے نواحِ دہلی میں اب بھی مستعمل ہے مگر اردو زبان اسے متروک قرار دے چکی ہے۔ چونکہ معشوق ایک شرمناک فعل میں رسوائی نہیں سمجھتا اس لئے یہ اسے طنز اً سنا رہے ہیں۔

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

وہاں یہ چالیں نہیں چلتیں اور وہ ایسے دم جھانسوں میں نہیں آتے۔

(۱۲۵)

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

یارانِ ہم سخن و ہمزبان کی تلخ گوئی کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو کہ ہزاروں کو آزما دیکھا اور کوئی ایسا نہ ملا جو سیدھی بات کرتا۔

بے در و دیوار سا اِک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

دیوار سے ہمسایہ کا تعلق ہوتا ہے اور در سے پاسباں کا اس لئے ایسا گھر بنایئے جو بلحاظ نہ ہونے ہمسایہ اور پاسباں کے بے در و دیوار سا ہو کیونکہ ہمسایوں کی رخنہ اندازی اور دربانوں کی لوٹ مار قابلِ برداشت نہیں رہی۔

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

ایسے تیمار داروں کو لے کر کیا کرے جو سبب آزار ہوں ایسے نوحہ خواں کس کام کے جو جان لینے کے بعد رونے کو بیٹھیں۔ یہ تینوں شعر ملکر ایک قطعہ ہے۔

---

(۱۲۶)

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

طوطی آئینہ کو دیکھ کر چہکتی ہے۔ طوطی مردِ کامل جو فنا فی الذات ہو۔ حجابات دل کا اندرونی مقام مقامِ انا ہے جو صفائی دل کے بعد آئینہ ہو جاتا ہے۔ ارشاد باری ہے کہ خدا تمہارے اندر موجود ہے دیکھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ کہتے ہیں مہر سے لے کر ذرہ تک ہر جسم ایک دل ہے اور دل بھی آئینہ صافی جس سے جلوۂ ذات عیاں ہے اِس لئے اس مردِ کامل کو جو فنا فی الذات ہے ہر طرف اپنی خاص صورت نظر آتی ہے اور وہ اس جلوۂ دیدار سے جو ہر طرف اس کے مقابل ہے سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمَ شَانِیْ یا انا الحق کے جیسے نغمے بلند کرتا یا چہکتا ہے۔

(۱۲۷)

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اُس کی خزاں نہ پوچھ

جس غم کدہ میں یہ بہار آ رہی ہو کہ ہر در و دیوار سبزہ زار بن جائے اُس کی خزاں کا کیا کہنا۔

ناچار بیکسی کی بھی حسرت اُٹھائیے
دشواریِ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

ہمرہاں یعنی ساتھی کا یہ عالم ہے کہ اس کے ساتھ راستہ کاٹنا بھاری ہو گیا اس لئے بہ ناچاری راہِ شوق میں اور تمناؤں کے ساتھ ایک یہ بھی حسرت اٹھانی پڑی کہ کاش ایسے بیہودہ گو ساتھی کے عوض ہماری قسمت میں اس سفر کو بہ عالم بیکسی طے کرنا لکھا ہوا ہوتا۔ یا یہ کہ ساتھیوں کی بیہودہ گوئی سے تنگ آ کر جس کی بدولت راستہ کاٹنا مشکل ہوتا ہے یہ منظور کہ تنہا سفر کیجئے اور رنج بیکسی ہی برداشت کر لیجئے۔

(۱۲۸)

صد جلوہ رو بہ رو ہے جو مژگاں اُٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا ساماں اُٹھائیے

شاعر یہاں ناتوانی کے مضمون میں غلو کرتا ہے کہ ہم جو جلوے کو ترستے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ دیدار میسر نہ ہو یہاں تو سو جلوے ہیں اگر نگہ اٹھائیے مگر ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں دید کا احسان اُٹھانے کی طاقت نہیں اگر اس پہاڑ کو اٹھا سکتے تو کام بن جاتا۔ یا یہ کہ شاعر اس بات کا جواب دے رہا ہے کہ کسی کو جلوۂ دیدارِ ذات میسر نہیں کہتا ہے کہ پردۂ مژگاں کو اگر اُٹھا دیجئے اور دیکھنے کی کوشش کیجئے تو سیکڑوں جلوے سامنے ہی رکھے ہوئے ہیں مگر انسان میں اتنی ہمت کہاں ہے کہ وہ دید کا احسان اُٹھانے کی کوشش کرے یعنی یہ کہ ناکامی پست ہمتی کا نتیجہ ہے۔

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق
یعنی ہنوز منتِ طفلاں اٹھائیے

برات حصہ۔ لڑکوں کے ہاتھ سے پتھر کھانا جنونِ عشق کا حصہ معاش ہے یعنی ابھی بے نیازی منت طفلاں اُٹھانے کی ضرورت باقی رہی کہ جب تک لڑکوں کے ہاتھ سے پتھر نہ کھائے جنونِ عشق کا حصہ نہیں ملتا۔

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

خانماں خراب کو جو خواہ مخواہ محسن کا متلاشی ہوتا ہے سمجھاتے ہیں کہ احسان کا بارِ گراں قابلِ برداشت نہیں گھر کی دیوار کو دیکھ لے کہ یہ مزدور کے احسان کی زیر بار ہو کر جھکی ہے یعنی اے خانماں خراب اب تیری کیا شامت آئی ہے کہ خود احسان اٹھانے چلا ہے گھر کی دیوار کو دیکھ لے کہ یہ مزدور کی زیر بار منّت ہونے ہی کی وجہ سے جھکی ہے۔

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسمِ پنہاں اُٹھائیے

یا اپنے تبسمِ پنہاں کا پردہ اُٹھا کر بتا دیجیے کہ اس کا سبب کیا ہے تاکہ امرِ واقعہ کا اظہار ہو اور مجھے زخمِ اشک سے واسطہ نہ پڑے یا پھر مجھے یہ کہہ کر رسوا نہ کیجیے کہ یہ ہمارے تبسمِ پنہاں پر الزامِ غیر سے بے جا رشک کرتے ہیں۔

(۱۲۹)

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

آنکھ کو میخانہ اور ابرو کو محرابِ مسجد سے مشابہ کرتے ہیں شاعر نے یہاں اس سے یہ مضمون پیدا کیا کہ جس طرح محرابِ ابرو کے لئے وجودِ چشم ضروری ہے۔ جس کے بغیر ابرو کی کوئی شان یا رونق نہیں اسی طرح مسجد کی رونق کے لئے اس کے زیرِ سایہ میخانہ ہونا چاہیے۔ قبلۂ حاجات فقرہ سے مراعات النظیر کی شکل قائم کی حشو کی جگہ کو بھرا اور کلام میں بلحاظِ خطاب زور بھی پیدا کر دیا۔ بھوں کے پاس یا بھوں کے نیچے کے محلِ استعمال میں جو یہاں مصنف نے بھوں پاس لکھ دیا یہ انھیں کے کلام میں آ کر کچھ ہو سکتا ہے ما و شما کا یہ مقام نہیں کیونکہ ایسا استعمال متقدمین میں بھی کم ہے اور متاخرین تو اسے بالکل ناپسند کرتے ہیں۔

(داغؔ) میخانہ کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
ہر ایک پوچھتا تھا کہ حضرت یہاں کہاں

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی ایک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

یہ طرزِ بیان طنزاً ہے۔ کہتے ہیں مجھ پر عاشق ہوتے تو ستم کی مکافات نہ ہوتی اس لئے قدرت نے آپ سے یہ بدلہ لیا ہے کہ ایک اور شخص پر عاشق ہو گئے جو بوجہ بے ربطی

خاطر جفائیں کرے گا اور اس سے آپ کے اس ظلم کے جواب تک مجھ پر ہوا ہے مکافات ہو جائے گی۔ نواحِ دہلی کا ایک زنانہ محاورہ ہے کہ ”ماں مری دِھی پر اور دِھی مری دھینگ پر“۔

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے

دلِ حسرت پرست کی بہت سی آرزوؤں کا خون کرنے کے بعد اے آسمان تو اس کے استقلال کی داد دے اور کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات کر۔

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

وہ تصویر کھچوانے کے لئے بلائیں گے تو اس بہانے سے ملاقات ہو گی اور جی بھر کر دیکھ لینے کا موقع ملے گا۔

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اِک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

یہاں تو غم غلط کرنا مقصود ہے یا خودی سے بیزار ہیں کہ ہوشِ دشمنِ عقل و راحت ہے۔ مصنف کا یہ شعر بہت مشہور ہے اور بہت پڑھا جاتا ہے۔

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جُدا جُدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

اثباتِ بہار کے لئے ہر رنگ کی ضرورت ہے کیونکہ گل و لالہ و نسریں جن سے وجودِ بہار ہے ان کے رنگ جُدا جُدا ہیں۔ یا یہ کہ جس طرح گل و لالہ و نسریں وغیرہ کے جُدا جُدا رنگ ہونے پر ایک وجودِ بہار کا ثبوت ہے اسی طرح ہر رنگ موجودات وجودِ واجب کی ایک دلیل ہے۔ اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔

(۱۲۵)

(ذوقؔ) گل ہائے رنگ رنگ سے زینت چمن کی ہے
اے ذوقؔ اس جہان کو زیب اختلاف سے

سر پائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بیخودی
رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

بیخودی کا وقت آئے تو سر کو پائے خم پر رکھ دے اور مناجات کی ساعت ہو تو قبلہ رو ہو بیٹھے۔

یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

عارف حقیقت کو چاہیے کہ مئے ذات کی جس پیمانۂ صفت میں گردش ہو اُسی سے مست ہو جائے مثلاً حسب بیانِ شعر اول جس کے ساتھ مل کر یہ قطعہ ہے اگر دورِ بیخودی ہو تو اُس کے شایانِ شان یہ ہے کہ سر کو پائے خم پر رکھ دے اور اگر وقتِ مناجات آئے تو قبلہ رو ہو بیٹھے کتب تصوف میں لکھا ہے کہ شیخ محی الدین ابن العربی اندلسی کہا کرتے تھے کہ "تمام عالم بوجودِ واحد موجود ہے اور اس کی حقیقت ایک ذات واحد کو سمجھو جو کچھ فرق نظر آتا ہے وہ محض اعتباری ہے" ہم عصر علماء سے اس پر بحثیں ہوئیں لیکن کوئی پار نہ پا سکا تو آخر ایک روز یار لوگوں نے صلاح کی اور کسی دوست کے وہاں شیخ کی دعوت کی گئی جب آپ ہاتھ دھو چکے تو مہمان اور اصحاب کے لئے اچھی غذائیں چنی گئیں وہاں ان کے سامنے غلاظت کی بھری ہوئی ایک رکابی لاکر رکھ دی گئی شیخ نے میزبان کی طرف سر اُٹھا کر دیکھا تو اس نے مسکرا کر کہا "بسم اللہ کیجئے سب کھانے بوجودِ واحد ہیں فرق محض اعتباری ہے اس پر آپ نے چادر سے سر ڈھانک کر جو منہ کھولا تو ایک خنزیر کی شکل نمودار ہوئی اور تمام غلاظت کو صاف کر گئی پھر چادر ڈھانکنے کے بعد جو شیخ نے منہ کھولا تو فرمایا کہ "ہر حیثیت کا تعلق ایک ہی حیثیت سے نہیں" مگر اس قصے اور غالبؔ کے قطعہ سے عارف کی خصوصیت سے نشو و نما کا یہ مقام نہیں۔

ہیں کبھی واعظ کبھی ہیں مرشدِ میخانہ ہم (ناطقؔ) گھومتے جاتے ہیں حسبِ گردشِ پیمانہ ہم

(حافظؔ) بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغان گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزل ہا

حافظ کے اس شعر کے ساتھ بھی حضرت مولانا شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی قدس سرہٗ العزیز کا ایک عجیب قصہ مشہور ہے مگر چونکہ شرح کو محض اشعارِ غالبؔ سے تعلق ہے اس لئے لکھنا مناسب نہیں۔

نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ فروغ کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

جس طرح فروعات کا نشو و نما اصل کی طاقت پر منحصر ہے اسی طرح قوتِ خاموشی یعنی مکمل طاقتِ فکری سے خاطر خواہ بات پیدا ہوتی ہے۔

(۱۳۰)

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

دل کی ساخت اُلٹی صنوبری ہے۔ کہتے ہیں عجز کے وجود کی دنیا میں مثال صرف ایک ہمارے دل کی بساط تھی مگر وہ بھی کیا ایک خون کا قطرہ اوندھا لٹکا ہوا جو گرنے پر آمادہ ہے یعنی دنیا میں عجز کا وجود اول تو ہے ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو ایسا کم ختم ہوا چاہتا ہے۔ دورِ حاضر کے ایک مشہور شاعر کے متعلق جن کا نام میں لکھنا نہیں چاہتا مجھ سے اور ایک مشہور ادیب سے گفتگو ہوئی میں نے کہا کہ وہ چور ہے اور ہوشیاری کے ساتھ دوسروں کے خیالات کو اپنے الفاظ میں بدلتا ہے انھوں نے کہا کہ ایسا ہو بھی سکتا ہے میں نے جواب دیا یقیناً تو انھوں نے مجھ سے کہا آپ ہی یہ کام کر کے بتایئے میں نے جواب دیا کہ کسی کی کوئی غزل دیدیجئے اور کوئی زمین بھی دیدیجئے تو میں یہیں بیٹھے بیٹھے لفافے بدل کر انھیں مضامین کو پیش کئے دیتا ہوں انھوں نے غالبؔ کی یہ غزل مجھے دی اور میں نے وہیں تعمیلِ ارشاد کر دی چنانچہ جو اشعار لکھے گئے وہ پیش کئے دیتا ہوں ؎

(۱۵۱)

(ناطق) سمجھ لو اُڑ گیا رنگِ وفا گلزارِ عالم سے
یہ کس گنتی میں مرجھائی ہوئی سی اک کلی دل کی

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

تکلف سے بناوٹی طور پر۔ تکلف برطرف صاف بات یہ ہے کہ

(ناطق) نرالی مصلحت سوجھی ہے دل کو یہ بھی کیا دل ہے
اب ان سے بھی خفا ہے واہ رے آشفتگی دل کی

خیالِ مرگ کب تسکین دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

صیدِ زبوں بے حقیقت شکار۔ ظاہر ہے کہ بودا پکڑنے سے شکاری کو تسکین نہیں ہو سکتی۔ کہتے ہیں یہاں بہ عالمِ تمنا موت کا خیال بھی ایسا قوی ہو کر نہیں آتا کہ میرے لئے باعثِ تسکین ہو جائے۔

(ناطق) بیانِ وصل پر بس ہو گیا کیا ذکر ناکامی
نہیں مرنا بھی بس کی بات اُف رے بے بسی دل کی

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

نالہ تو اس خیال سے کیا تھا کہ اس سے کچھ تسکین ہو گی مگر ہوا یہ کہ ناطاقتی نے زور پکڑا اور درد بڑھ گیا۔

(ناطق) حقیقت کھل گئی نالہ کی جب دردِ جگر چمکا
بہت پچھتا رہا ہے دیکھئے آنکھ اب کھلی دل کی

نہ اتنا برشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

مراد دریائے بیتابی جو حسرتوں کا خوں ہونے سے پیدا ہوا ہے اس کی ہر موج تمہاری تیغِ جفا کی روانی دکھاتی ہے یعنی تمہیں جس تیغِ جفا پر ناز ہے ایسی ہزاروں تلواریں مرے دل پر چل رہی ہیں۔

(ناطق) بنی تیغِ جفا ہر موج اس دریائے احمر سے
کیا خوں اُس نے دل کا خون جو حسرت ہوئی دل کی

"فرماؤ" کا استعمال اب درست نہیں یا تو "کہو کہا جائے گا" یا "فرمایئے"۔

مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجئے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

ایک دو چار سات آسماں۔ آسمان اوندھے پیالہ سے مشابہ ہے جس میخانہ میں صرف چند اوندھے پیالے پڑے ہوں وہاں کے ساقی سے شراب کی توقع لاحاصل۔

(ناطق) خیالِ ساغرِ خالی بھی سامانِ تکلف ہے
تکلف برطرف دیکھو ذرا یہ سادگی دل کی

مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

شوقِ وصل اور شکوۂ ہجراں کو بیان کرنے کا ارادہ ہے خدا اتنی فرصت کا وقت دے کہ میں یہ دونوں طولانی قصے ان کے سامنے پیش کر سکوں۔ یہاں مصنف نے "خدا وہ دن کرے کہ میں اس سے" کی جگہ "جو اس سے میں" لکھا ہے یہ طرزِ بیان پہلے بہت فصیح تھا لیکن اب پسند نہیں کیا جاتا لفظ "جو" اردو کے استعمال میں مخفف بھی آتا ہے اور مستقل بھی فصحار کے طرزِ کلام پر جو میں نے غور کیا تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا محل استعمال ایک نہیں "جو" مستقل بیان کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے اور مخفف "سبب" کے لئے۔ مگر شعراء ہنوز اس کا کچھ لحاظ نہیں کرتے اور ایک کے محلِ استعمال میں دوسرے کو لکھ جاتے ہیں میرے نزدیک اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

(۱۳۱)

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

بُت جو یہ چاہتے ہیں کہ ہماری خوشامد کے جاؤ اس سے ہم ایسے تنگ آگئے ہیں کہ اُن کی بزم میں لبوں سے سخن آزردہ ہے یعنی بات کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ بڑا اچھا شعر ہے اور بہت مشہور رہے۔

ہے دورِ قدح وجہ پریشانی صہبا
یک بار لگا دو خُمِ مے میرے لبوں سے

جب میرے ظرفِ عالی کے لئے خود خم درکار ہے تو بے فائدہ دورِ قدح کے چکر میں ڈال کر شراب کو کیوں پریشان کر رہے ہو لاؤ تا مٹکا ہی میرے لبوں سے لگا دو کہ ایک دم پی جاؤں۔

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد
زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

"طرف ہونا" مد مقابل ہونا مقابلہ کرنا یہ شعر زاہد کی چھیڑ کا تنبیہی جواب ہے۔

(داغ) اب کے کچھ منہ سے نکالا تو تمہیں جانوگے
داغ پھر مجھ کو نہ کہنا جو برا بر نہ کہوں

بے دادِ وفا دیکھ کے جاتی رہی آخر
ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

مری جان ہر چند لبوں سے بہت مانوس تھی کہ تمام جسم کو چھوڑ کر یہاں آگئی تھی اور جدا ہونا نہیں چاہتی تھی یا تمام جسم کو لبوں کی محبت میں چھوڑ دیا تھا اس پر بھی رسمِ وفا کے مظالم کو دیکھ کر وہ انھیں چھوڑ گئی یعنی ایسے آشنا سے بھی وفا کرنے کی ہمت نہ ہوئی جس پر

میری جان خود قربان تھی۔

(۱۳۲)

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

وہ خود تو کبھی ہمارا ذکر نہیں کرتے لیکن اگر کوئی ایسا جرچا نکالے تو سن لیتے ہیں غرض ہمیں اتنا موقع دینا بھی پسند نہیں کرتے کہ کہیں کیا قصور ہو گیا جو آپ ہم سے ناراض ہیں یعنی ناراضی کی حد ہو گئی۔ لفظ "جا" کا استعمال بمعنی اب بغیر ترکیب فارسی کے درست نہیں۔

غالب ترا احوال سُنا دیں گے ہم ان کو
وہ سُن کے بلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے

دیارِ حبیب کو جا رہے ہیں غالب نے ان سے کہا ہے کہ ہمارا یہ شوق بیکسی یہ مصیبت یہ پریشانی اُنھیں کچھ اس طرح سنانا کہ سُن کر بلا ہی لیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا ہے کہ دیکھو ہم تمہارے بھروسہ پر ہیں دیکھیں کب بلواتے ہو بس یہ شعر اس کا جواب۔ احوال جمع ہے حال کی جیسے جمع کے ساتھ یعنی تیرے احوال لکھنا چاہیئے تھا مگر مصنف نے تیرا احوال لکھا جو بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے ممکن ہے کہ کتابت کی غلطی ہو یا احوال کا استعمال غلط العام کے طور پر اُس وقت درست ہو اب ایسا لکھنا درست نہ ہوگا کیونکہ اس وقت فصحاء کے استعمال میں احوال بمعنی حال نہیں۔

(۱۳۳)

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

ترے غم کی غارت گری کے لئے ہمارے پاس ایک ہی سامان تھا مگر اس سے اتنا بھی

نہ ہوا کہ حسرتِ تعمیر کو غارت کر دیتا۔

(۱۳۴)

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

ظالم کو دیکھ کر ظالم یاد آیا اس غم سے بڑھ کر اس غم نے ستایا۔

کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب!
قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

سوزِ دل کے مضامین آگ پکڑ کر ہی کچھ چمکتے ہیں۔ یا یہ کہ ہمارا مکتوب رازِ پیاز کے عرق کی طرح ایسی سیاہی کا لکھا ہوا ہے جو آگ دکھانے ہی سے روشن ہو۔ یا ان کے خط میں بیتابی و سوزشِ دل کے مضامین لکھے ہوئے ہیں جس پر بظاہر یقین نہیں آسکتا اُسے یہ بتلانے کی ضرورت ہے کہ بیتابی کی کیا شکل ہے اور سوزش کا کیا رنگ یہ باتیں کاغذ کو جلا کر دیکھ لینے سے عیاں ہوتی ہیں کہ اس میں بیتابی و سوز کے ہزاروں رنگ اُس کے سامنے آجاتے جیسا کہ لکھتے ہیں۔

(غالب) برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بے تابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یکتپیدن پر

یا یہ کہاں نے یہ قسم کھائی ہے کہ جو کاغذ میرے ہاتھ میں آئے گا جلا دوں گا اب میرا مکتوب کھلے گا کیونکر اور اُسے پڑھے گا کون؟

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

پشمینہ کا کپڑا بہت تیزی سے آگ پکڑتا ہے اس لئے اس میں شعلۂ آتش نہیں لپیٹا جاسکتا کہتے ہیں سوزِ غم کی آگ دل کو اس تیزی سے پھونک کر باہر نکل آتی اور عیاں ہو جاتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے۔

انھیں منظور اپنے زخمیوں کو دیکھ آنا تھا
اٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھے شوخی بہانے کی

اس میں بہانے کی شوخی یہ ہے کہ کھلے ہوئے زخموں کی دید کو سیرِ گل سے تعبیر کیا اس مضمون کو مصنف نے بار بار نظم کیا ہے۔

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

وہ تو جانے کے لئے آیا مگر ہم اپنی سادگی سے اس آنے کو التفاتِ ناز سمجھ کر اس پر مر گئے۔ یا یہ کہ ہم نے سادگی سے ذرا سے التفاتِ ناز پر جان دیدی اسی طرح تیرا آنا ہمارے جانے کی تمہید ہو گئی۔

(ذوق) لیتے ہی دل جو عاشق بیتاب کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

لکد کوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

بتوں کے ناز اٹھانا بڑی ہمت اور طاقت کا کام تھا جسے میں نے برسوں کیا ہے مگر بدقسمتی سے اب یہ عالمِ ضعف ہے کہ حوادث کی ذرا سی ڈنڈے بازی کی بھی متحمل نہیں ہوسکتی۔ آج کل کے استعمال میں "مری طاقت کہ ضامن تھی" نہیں کہا جائے گا بلکہ یا تو "کہ" کی جگہ "جو" یا "جو کہ"

(ناطق) یا یہ ہمت تھی کہ ناز اُس کے اٹھا لیتے تھے
یا یہ طاقت ہے کہ ہے جان بھی بھاری ہم کو

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالب
بدی کی اُس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

ابنائے زمانہ نے محسن کشی کی بد وضع اختیار کر لی ہے۔

(۱۳۵)

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی
دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی آسامی

حاصل پیداوار نتیجہ محصول لگان۔ ہاتھ دھو بیٹھ نا اُمید ہو جا۔ اے آرزو خرامی اے خرامِ آرزو والے جوشِ گریہ طوفان گریہ کثرتِ گریہ۔ آسامی مفسد بالمعنی یہ معنی کاشتکار یا مدیون۔ ڈوبی ہوئی آسامی وہ آسامی جس سے بوجہ نقصان مایہ یا آفات سماوی وصول کی امید باقی نہ رہے۔ کہتے ہیں اے محوِ خرامِ آرزو یعنی امیدِ حاصل میں کوشش کرنے والے حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ کیونکہ طوفانِ گریہ نے اس آسامی کو جسے دل کہتے ہیں اور جس کے وہاں کشتِ آرزو کے بار آور ہونے کی امید تھی ڈبو دیا یعنی برباد کر دیا۔

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

شمع جو جل کر خود ختم ہو جائے اس کا سوز تمام ہو جاتا ہے اور جسے کوئی بجھا دے اس کا سوز ناتمام رہتا ہے۔ مطلب یہ کہ زمرۂ اہلِ فنا میں میرا وجود شمع کشتہ کی طرح میرے سوزِ ناتمام کا داغ ہے۔

(۱۳۶)

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

جس کا آسمان ایک چیونٹی کا انڈا ہے سمجھ جایئے کہ اُس ستم زدہ پر جہاں کس قدر تنگ ہوگا۔

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

تیرا ذوق کائنات کے لئے اسی طرح وجہ حرکت و حیات ہے جس طرح کہ پرتوِ آفتاب سے ذرے میں جان پڑ جاتی ہے۔ لفظ "حرکت" میں رائے متحرک اردو کا استعمال نہیں۔

حالانکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

شیشے سے یہاں مراد ہے صورت کہا کرتے ہیں کہ آدمی کی صورت اس کے دل کا آئینہ ہوتی ہے "سیلی" کے ساتھ لفظ "خارا" بمعنی سنگِ خارا شیشے کی مناسبت سے لائے۔ مے کا اثر ہوتا ہے سرخیِ رنگ یعنی شادمانی۔ مطلب یہ کہ غافل کو میرے چہرے کی سرخی دیکھ کر سرور کا گمان ہوتا ہے حالانکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ حاصل یہ کہ میرے چہرے کی سرخی کو دیکھ کر جو فی الحقیقت طوفانِ حوادث کے تھپیڑوں کا نتیجہ ہے غافل یہ سمجھتا ہے کہ اس پر سرورِ رنگ شادمانی چڑھا ہوا ہے۔

(داغ) عدو کو دیکھ کے آنکھوں میں اپنی خون اُترا ہے
وہ سمجھے بادۂ گل رنگ کا سرور آیا

کی اُس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

"جا گرم کی" ترجمہ ہے جا گرم کردن کا جو قیام کرنے یا بیٹھنے کے معنی میں یا محفل آرائی کے لئے فارسی کا تو بہت اچھا محاورہ ہے لیکن ترجمہ ہو کر اردو کے استعمال کا لفظ نہیں ہوتا۔ سینۂ اہلِ ہوس کو بوجہ نہ ہونے سوزِ الفت کے ٹھنڈے مکان سے تعبیر کیا بیان شعر طنز ہے اور اپنے رنگ کی انوکھی بات۔ ایسے ہی اشعار نے غالب کو غالب بنایا ہے۔ آوے کی جگہ اب آئے مستعمل ہے۔

(۱۵۹)

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

الزامِ بوسۂ غیر پر چپ ہی رہو ورنہ اب ہم زیادہ بولے تو یاد رکھو اس وقت جی جلا ہوا ہے کہیں ہمارے منہ سے بھی کچھ نہ نکل جائے ہیں گو ایسے شعر نہیں لکھتا اور کسی حالت میں بھی غیر کے تفوق کا روادار نہیں چہ جائیکہ معشوق اُسے بوسہ دے لیکن ایسے اشعار کو بُرا بھی نہیں سمجھتا کہ انسانی زندگی میں ان کے مواقعات بھی بہت سے آتے ہیں مگر میں پوچھتا ہوں کہاں ہیں معترضینِ داغ کہیں اس شعر پہ کیا کہتے ہیں۔

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے

سایۂ دیوارِ یار میں بالِ ہُما کا اثر ہے۔ ہندوستان کی خصوصیت ایک تو برائے قافیہ دوسرے اس لئے کہ یہ ملک اپنی ہر قسم کی پیداوار کے لحاظ سے حاصلِ زمین ہے اور ہندوستان جنت نشان بولا جاتا ہے۔ بادشاہ اپنے سامانِ عیش کے لئے وجہ رشک ہوتا ہے۔ کہتے ہیں جسے بیٹھنے کے لئے دیوارِ یار کا سایہ میسر ہے اُسے ہندوستان کی فرمانروائی کا عیش حاصل ہے۔ اعلانِ نون بعد الاضافت اب شاعری کا عیب سمجھا جاتا ہے۔

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغِ جگر کا نشان ہے

میں کس سے یہ بات کہوں اور کون مانے گا کہ سینہ کا داغ جگر کا نشان ہے کیونکہ غم نے تو اس طرح میدان صاف کیا ہے کہ اب اس بات پر اعتبار بھی نہیں ہو سکتا کہ یہاں کبھی جگر تھا۔

ہے بارے اعتبارِ وفاداری اس قدر
غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے

ہم اس میں خوش ہیں کہ وہ مہربان نہیں کیونکہ معشوق کا ہم پر زیادتیاں کرنا اس بھروسہ پر ہے کہ ہم اس کی برداشت کریں گے جس سے معلوم ہوا کہ اسے ہماری وفاداری پر اس حد تک اعتبار ہے اور معشوق کا ہماری وفاداری پر ایسا اعتماد ہونا ہمارے لئے وجہ ناز ہے۔

(۱۳۷)

دردِ سے میرے ہے تجھکو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

اس غزل کے تین اشعار رنگِ تغزل سے جدا ہیں جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پوری غزل کی غزل مرگِ معشوق پر بطور مرثیہ لکھی گئی جیسے ان کی ہمدردی نے ختم کر دیا ہے اس لئے تمام اشعار کی تشریح اس انداز سے کی جاتی ہے اس غزل کو اگر مومن خاں کے مرثیہ کی طرح بیانِ واقعہ سمجھا جائے تو غلط ہوگا کیونکہ غالب نے عمر بھر ایسے جھگڑے نہیں پالے یہ رندِ مے نواز و سخن پرست نہ کبھی شاہد پرستی کا مرتکب ہوا نہ کبھی آوارہ گردی کی مولانا شوکت میرٹھی نے "میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے + ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں" کے متعلق جو قصہ لکھا ہے اس کا کسی اور واسطے سے پتہ نہیں چلتا اس لئے ہمیں اول تو اس کی صداقت ہی میں شک ہے لیکن اگر سچ بھی ہو تو یہ محض غالب کی حاضر جوابی کا بدرجہ کمال ثبوت ہونے میں پیش کیا جا سکتا ہے کیونکہ جب مولوی امام بخش صاحب صہبائی جیسا فاضل اور قادر الکلام سخن فہم بزرگ ایک ایسے صاف شعر کے لئے یہ سوال کر بیٹھے کہ "مرزا نوشہ تم نے اس کیا معنی پہنائے ہیں" تو اس کا یہی بہترین جواب ہو سکتا ہے جو دیدیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی غمزدہ کی فرمائش پر۔ چند اشعار اپنی زبان میں لکھ دیئے گئے یا جو اشعار انھوں نے مرگِ عارف کے سلسلہ میں لکھے ممکن ہے کہ انھیں کی باقی کڑیاں یہ بھی ہوں

اگر طبع کے وقت اشعار نمبر ۳ نمبر ۶ نمبر ۷ نکال دئے جاتے تو باقی اشعار کی دوسری طرح بھی تشریح کی جاتی۔ اس غزل کے مطلع میں شاعر معشوق کی خوئے غفلت شعاری کا ماتم کر رہا ہے جس کے معدوم ہو جانے سے وردِ عاشق کی مہلک چوٹ اس کے دل پر پڑ گئی ہے یعنی ان کا درد اُسے لے مرا۔

(ناطق)
میرے صبر نے بھی غضب کیا کہ عدو کی جان پہ بن گئی
یہ کہاں کی چوٹ کہاں لگی یہ کہاں کا درد کہاں اُٹھا

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

ہائے ہائے بایں نازک دلی تجھے مجھ غم دوست کی غمگساری مناسب نہ تھی کہ جس غم کو میں بلانوش کھا رہا تھا اس کا ایک ذرا سا حصہ تیرے لئے زہر ہو گیا۔

کیوں مِری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

میری دوستی کیا کی کہ تو نے اپنی جان کے ساتھ دشمنی کر لی کاش ایسا ہوتا کہ تجھے میری غم خواری کا خیال ہی نہ آتا۔

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا؟
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے

جب تیری عمر ہی کو پائیداری نہیں تو تو نے جو عمر بھر کا پیمانِ وفا باندھا وہ کیا وجہ تسکین دل ہوتا اور رہو۔

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اِسے ناسازگاری ہائے ہائے

چونکہ زندگی نے تیرے ساتھ بے وفائی کی اس لئے اب مجھے اس نامراد کی آب و ہوا زہر معلوم ہوتی ہے۔ "زہر لگتی ہے" پہلے کا نہایت فصیح محاورہ ہے چنانچہ بیانؔ نے بھی

اسی طرح لکھا ہے۔

زہر لگتی ہے انھیں میری حیات کیوں کہ منظور شہادت ہو گی

مگر آج کل کی وہ گندی ثقاہت جو ہر بات میں ضمم کا پہلو نکالتی ہے اسے اچھا نہیں سمجھتی حالانکہ نواحِ دہلی کا ہنوز یہی استعمال ہے۔

گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

تیرے مزار پر گل کاری دیکھ کر میرے دل میں جلوۂ ناز کی گل فشانی کا ماتم بپا ہے۔

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

پردہ داریِ الفت کی بھی تجھ پر حد ہو گئی کہ تم شرمِ رسوائی سے گور ہی میں جا کر روپوش ہو گیا۔

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئے
اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

تجھی سے ناموسِ پیمانِ محبت تھا اور تیرے ہی دم سے دنیا میں دوستی کی راہ و رسم تھی یا تو ہی سراپا راہ و رسمِ یاری اور ناموسِ پیمانِ محبت تھا تیرے اُٹھ جانے سے دنیا میں یہ سب کچھ نہیں رہا۔

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اِک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

افسوس! کہ ہمارا کام تمام کرنے سے پہلے اس کا کام تمام ہو گیا۔

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشگال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

ماتمِ یار میں یہ عالمِ یاس اشکباری کی کالی راتیں کیونکر کاٹے کٹتیں ہیں تو شوقِ وصال میں شب وعدہ کو ستارے گن گن کر کاٹنے کی عادت ہے۔

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل تِس پر یہ نا امیدواری ہائے ہائے

ایک دل اور اس پر ہر طرف سے نا امیدی کا ہجوم کہ اب نہ آنکھ کو دیدار کی امید باقی ہے اور نہ کان کو پیام کی۔ لفظ "تِس پر" کب کا متروک ہو چکا ہے اب اس کی جگہ "اس پر" بولا جاتا ہے۔

عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

عشق جنوں کے درجے تک نہ پہنچنے پایا تھا کہ خدا نے معشوق ہی کو اُٹھا لیا اس لئے دل کے باقی شوقِ رسوائی پر افسوس کرتے ہیں یہاں میں بھی اپنا ایک شعر عرض کرتا ہوں جس میں اصلیت ہے:

(ناطق) وہ تھے سزائے مرگ کہ میں آہ ہائے ہائے
یہ کیا ہے اے مصیبتِ گمراہ ہائے ہائے

(۱۳۸)

سر گشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

تسکین کو برائے تسکین۔ یہ عالمِ سرگشتگی زندگی سے نا امیدی ہے اور زندگی سے نا امیدی یقین مرگ کے مرادف ہے اس لئے سرگشتگی خود یہ عالمِ سرگشتگی نویدِ تسکین ہوئی۔

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

میرا دلِ آوارہ خدا جانے کہاں نکل گیا ہے لیکن دوست کا حسن ظن قاتل ہے کہ اس نے جو مجھے امین سمجھ کر اسے سونپ دیا تھا تو ابھی تک اسے بھی یقین ہے کہ وہ آوارہ ہنوز میرے پاس موجود ہے اسلئے اسکی خبر لینے کی پرواہ نہیں کرتا۔ یا کہ وہ تو خمِ زلف سے کب نکل گیا مگر معشوق کو ہنوز یہی خیال ہے کہ وہ اسی کے پاس ہے۔

کیجئے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک
ہر مُو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

جو بال میرے جسم پر شدت بخار سے کھڑے ہوئے ہیں وہ سب سرورِ تپ غم کے لئے زبان ہائے سپاس ہیں اور جس سرور کا یہ حال ہو اس کا زبان سے کہاں تک بیان ہو سکتا۔

ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا
ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے

حق پرست ضمیر کے ہوتے ہوئے بھی غرورِ حسن نے اُس کا فراد اکو وفا سے بیگانہ کر رکھا ہے آیہ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ الخ

پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اِس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

شب مہتاب کو بلحاظِ برودت بلغمی مزاج کہا جس کے لئے آتشِ سیال بہترین مصلح ہو گا۔

ہوتا ہے ہر مکاں کو مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

جس سے جنگل کی آبادی اور جنگل کو شرف تھا وہ ایک مجنوں کی ذات تھی وہ مر گیا ہے تو یہ اُداس پڑا ہے یعنی جنگل کی اداسی کا باعث مجنوں کی موت ہے وہ بیچارا اگر زندہ ہوتا تو جنگل اداس نہ رہتا۔

(۱۳۹)

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

اگر خامشی کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے اخفائے حال ہوتا ہے تو میرے لئے خوشی کی بات ہے کیونکہ میری بات کو کوئی سمجھ نہیں سکتا یعنی میں گویا خاموش ہوں مصنف نے کہیں مصدر کو نون یا سے بھی لکھا ہے اور کہیں نون الف سے بھی جس طرح فارسی میں مصدر کی علامت "دن" اور "تن" ہے اسی طرح اردو والوں نے علامت مصدر "نا" کو بنایا ہے اور جو لوگ اس کے پابند ہیں وہ مصدر کے ساتھ نون "یا" کا استعمال غلط سمجھتے ہیں حالانکہ قواعد زبان سے بنتے ہیں نہ کہ قواعد سے زبان جب اردو میں ہنوز مصدر کا استعمال بہ اثر تذکیر و تانیث "نون الف" اور "نون یا" دونوں سے ہوتا ہے تو پھر کیونکر اس قاعدے کو مسلم مانا جائے اور کیوں قواعد کی یہ غلطی ان لوگوں کے لئے اہلِ دہلی پر معترض ہونے کا بہانہ ہو جو مصدر کو دونوں طرح بولتے ہیں اور جسے متقدمین نے بھی استعمال کیا ہے۔

کس کو سناؤں حسرتِ آزار کا گلہ
دل فردِ جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

ہزاروں کا حساب لگا کر دل کو تجربہ ہو گیا ہے کہ اس معاملہ میں کوئی بولتا بتاتا نہیں جس کو سنا ہے وہی منہ پھاڑ کر رہ جاتا ہے تو اب کس کو سناؤں حسرتِ آزار کا گلہ۔

کس پردے میں ہے آئینہ پرداز اے خدا
رحمت کہ عذر خواہِ لبِ بے سوال ہے

یا اللہ لبِ بے سوال کی جانب سے عذر خواہی کرنے والی دلہن یعنی رحمت مجھ

بے زبان کی باری کو کس پردۂ حجاب میں محوِ آرائش ہے جو ابھی تک خبر لینے نہ آئی یہ حسنِ معذرت ہے پہلے لکھ آئے ہیں۔

(غالب) رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

مصلحت اندیشی سے ان کے نہ ملنے پر غلبۂ شوق یہ خیال دلاتا ہے کہ وہ ہم سے دشمنی کرتے ہیں اس شعر میں یہ اسے غیرت دلاتے ہیں۔ "اے شوق شرمندہ ہونے کی بات ہے" کی جگہ "اے شوق منفعل لکھنا" کچھ غالب ہی کے شعر میں اچھا معلوم ہوتا ہے۔

مشکیں لباس کعبہ۔ علیؓ کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے یہ نہ کہ نافِ غزال ہے

زمین انسان کیلئے ہے اور انسان کا مقصدِ خلق عبادت ہے چونکہ حضرت آدم نے پہلا خدا کا عبادت خانہ کعبہ کو بنایا اس لئے کعبہ زمین کی مدور شکل میں بلحاظِ مرکز عبادت نافِ زمین ٹھہرا۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ کعبہ کا سیاہ غلاف بلحاظ اپنی مشک بیز شہرت کے جو شامہ نوازی کر رہا ہے اس کا سبب حضرت علیؓ کے قدوم میمنت لزوم ہیں کہ آپ وہاں پیدا ہوئے ورنہ یہ ناف زمین ہے کچھ نافِ غزال نہیں کہ اسی سے مشک نکلتا ہو۔ اس شعر پر اور شعروں کے ساتھ بڑے زور و شور کے ساتھ حضرت یاس عظیم آبادی نے مہمل ہونے کا اعتراض کیا تھا اس مضمون کا جواب میں نے "رسالہ خیال" لاہور میں دیتے ہوئے اس کے متعلق صرف یہ لکھ دیا تھا کہ "بفضلہ معترض امام المذہب ہیں اور شعر بھی اس سے متعلق معلوم ہوتا ہے ہم اہلِ سنت کیا بتائیں کہ مصنف نے اس میں کیا لکھا ہے۔" قبلہ و کعبہ سے استفسار کیا جائے تو بہتر ہو گا۔

۱۳۹

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

دریا کیا ہے زمین کے لئے عرقِ انفعال شرم کس بات کی اس بات کی کہ زمین کی وسعت میرے حوصلۂ وحشت کے مقابلے میں ہیچ ثابت ہوگئی۔

(داغ) تنگ ہے دل وسعتِ دامانِ محشر دیکھ کر
اے جنوں ہم پاؤں پھیلاتے ہیں چادر دیکھ کر

(ناطق) سرِ سودا زدہ و تنگیٔ صحرائے وجود
میری تقدیر میں تھا قیدیٔ زنداں ہونا

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہستیٔ عالم اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ جو کچھ نظر آتا ہے ایک حلقۂ دامِ خیال ہے غالبؔ تو کہیں اس فریب کے جال میں نہ پھنس جاتا۔ "آجائیو" اب تک نواحِ دہلی میں مستعمل ہے مگر شعراء نے اسے متروکات میں شامل کر دیا ہے اور اس کی جگہ "آجانا" بولتے ہیں۔ اس شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں تعقید بھی ہے جو فی زمانہ اچھی نہیں سمجھی جاتی۔

(۱۴۰)

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کر پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

تم اپنے شکوے کی باتوں کو کھود کھود کر پوچھو گے تو آتشِ رشک حسد جو دبی ہوئی ہے وہ نکل آئے گی اور پھر خدا جانے یہ شعلہ بھڑک کر کتنے گھروں کو لے جائے۔

(ناطق) کتنے گھر لیتی ہے عاشق کے کلیجے کی لگی
دیکھتا جا ارے او آگ لگانے والے

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

(غالب) نالہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

یہ زمین اب اردو شاعری نے ترک کر دی ہے کہ شعر سے مقصد ترنم ہے اور اس سے ترنم پیدا نہیں ہوتا۔

(۱۴۱)

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا وہ بھی مٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

غلط بردار وہ کاغذ جس کا لکھا ہوا بآسانی مٹ سکے اور لکھ کر وہی حرف مٹایا جاتا ہے جو غلط ہو۔ یہاں "حرفِ وفا" کے "حرفِ غلط" ہونے کا یہ ثبوت پیش کرتے ہیں کہ تو نے جو خط لکھا ہے ظاہر ہے کہ اس کا کاغذ غلط بردار ہے کہ اس پر جو صرف ایک جگہ حرفِ وفا لکھا تھا وہ بھی مٹ گیا تو معلوم ہو گیا کہ حرفِ وفا حرفِ غلط ہے۔ یا یہ کہ دنیا میں صرف ایک وفا اور وفاداری سچی باقی سب جھوٹ اور چونکہ تیرے خط میں جو ایک جگہ حرفِ وفا لکھا ہوا تھا وہی مٹ گیا تو باقی جو بچا وہ سب غلط اس لئے ترے خط کا کاغذ غلط بردار ہوا کہ ایک حرفِ وفا کا بھی متحمل نہ ہو سکا۔

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

باوجود نفس کی آتش باری کے ہم نہیں جلتے اس سے معلوم ہوا کہ ذوقِ فنا ناتمام ہے کیونکہ اگر شوق تام ہوتا ــــ تو سعی بھی مکمل ہوتی اور آج تک کب کے جل چکے ہوتے

اس لئے یہ عالمِ شوقِ ذوقِ فنا کی ناتمامی پر خواہ مخواہ جی جلتا ہے یعنی مجاہدے کی سعی ناتمام جس نے انھیں فنا کے درجے تک نہیں پہونچایا وجہ کلفت ہو رہی ہے۔

(ناطق) کھڑی ہے سعیِ نامشکور بہرِ عذرِ ناکامی
تمہارے کام کے ہم تھے ہمارا کام مشکل تھا

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی واماندگی میں نالے سے ناچار ہے

آگ کو جب پانی سے بجھایا جاتا ہے تو اس میں سے آواز اٹھتی ہے۔ آگ کا وصف جہاں شعلہ خوئی ہے وہاں خاموش بھی ہے چنانچہ آتش خاموش کا استعمال ہے کہتے ہیں ہر کسی کو بہ عالمِ ناچاری نالہ کرنا ہی پڑتا ہے چنانچہ آگ کو دیکھو کہ بایں شعلہ خوئی و با وصفِ خاموشی بھی بے بس ہو کر پانی میں بجھتے وقت بے ساختہ چلا اٹھتی ہے۔

ہے وہی بدمستیِ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

جس کی مے جلوہ نے زمین سے آسمان تک ہر ذرہ کو سرشار کر رکھا ہے وہی خود سب کی بدمستی کا ذمہ دار ہے پھر اب عذر خواہی کون کرے یہ کام تو اسی کا ہے۔

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

یہ جلے بیٹھے ہیں اور معشوق چھیڑ رہا ہے کہ ہم سے خفا کیوں ہو ہمیں تو تم اپنی زندگی کہتے تھے یہ جواب دیتے ہیں کہ میں اب تو زندگی سے بھی بیزار ہوں "ان دنوں کا" استعمال اب بھی ہے لیکن زیادہ تر ایسے مقام پر "اب تو" یا "آج کل" بولا جاتا ہے۔

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھل جائے کہ اسکو حسرتِ دیدار ہے

خط کھولتے ہی چشمِ حسرت زدہ کی تصویر دیکھ کر تیری بھی آنکھیں کھل جائیں اور پتہ لگ جائے کہ مجھ کو حسرتِ دیدار ہے۔ اب "کہ تا" کا استعمال جائز نہیں "تاکہ" لکھا جاتا ہے۔

(۱۴۲)

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

پینس پالکی۔ کہتے ہیں اللہ رے نفرت وہ میرے کوچے سے اس تیزی کے ساتھ گزرنا چاہتے ہیں کہ انھیں کہاروں کا کندھا بدلنے کے لئے ٹھہرنا بھی گوارا نہیں ہوتا۔

(۱۴۳)

مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

تمنا کے لئے نالہ درکار ہے اور حیرت کے لئے خاموشی۔ شاعر کی ہستی چونکہ حیرت آبادِ تمنا کی فضا ہے اس لئے متحیر ہو کر خود مبہوت ہے اور بلحاظِ تمنا چونکہ نالہ کا وجود ہی بھی اس فضائے ساکت میں موجود ہے اس لئے وہ اس عالم کا عنقا ہے۔

خزاں کہتے ہیں کسکو فصلِ گل کیا کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

پر بریدہ اسیرِ قفس کو تو ہر موسم میں وہی ایک رونا ہے اسے کیا خبر کہ فصل کس کا نام اور خزاں کسے کہتے ہیں۔

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریادِ دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا

ہم اس کے قائل نہیں کہ دکھے دل کی فریاد کے اثر سے بھی معشوق پگھل جاتے ہیں ان کا وفا کرنا تو ایک اتفاقی بات ہے۔

نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

کسی سے کسی بات کا عہد کرنے کے لئے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں جسے ہندی محاورے میں "بچن دینا" کہا جاتا ہے۔ ناامیدی میں جو کفِ افسوس ملا یا ہم ملے اس کے لئے کہتے ہیں اسے میری شوخیِ اندیشہ نے تجدیدِ تمنا کا عہد سمجھا اور ناامید ہوتے ہی نیا عہد بندھ گیا تو رنجِ ناامیدی باقی نہ رہا۔

(۱۴۴)

رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے
نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے

دود یعنی دُخانی۔ نبض کی وہ حرکت ہے جو بند ہونے سے پہلے بالعموم ہوتی ہے لیکن اگر اس میں بند ہوجانے سے پہلے کوئی سبب پیدا کر دیا جائے تو پھر طاقت پکڑ لینا بھی ممکن ہے۔ اسی طرح چراغِ کشتہ کا دھواں بھی اس کا آخری درجہ ہے جس میں اگر فوراً گرمی پہونچ جائے یا دھوئیں کو آگ مل جائے تو چراغ بھک سے روشن ہوجاتا ہے۔ مطلب یہ کہ اے ظالم اب تغافل کا وقت نہیں رحم کر کہ بیمارِ وفا کی نبض دودِ چراغِ کشتہ کی حالت تک پہونچ گئی اور چراغِ کشتہ کی ہستی کوئی ہستی نہیں یعنی یہ ایسا وقت ہے کہ اگر تو فوراً ہی رحم نہ کرے اور گرمجوشی نہ دکھائے تو یہ ٹھنڈا ہوجائے گا۔

دل لگی کی آرزو بےچین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی سودِ چراغِ کشتہ ہے

بے رونقیِ بزم چراغِ کشتہ کے لئے سودمند ہے کیونکہ چراغ کو وقفِ سوز جب ہی ہونا پڑتا ہے جبکہ بزم آرائی کی ضرورت ہو لیکن دل لگی کی آرزو ہمیشہ بزم آرائی کا تقاضا کرتی ہے۔ مطلب یہ کہ بزمِ تمنا کی آراستگی باعثِ سوزِ دل ہو کر ہمیں بےچین رکھتی ہے اور دل لگی کی آرزو بزمِ تمنا آراستہ کرنے پر مجبور کرتی ہے اگر یہ نہ ہو تو چراغِ کشتہ کی طرح دل بجھ کر سوزِ دروں سے نجات پا جائے۔

(۱۴۵)

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

"تو کہوے" تو گوئی کا ترجمہ ہے مگر اردو کا یہ استعمال نہیں۔ اردو میں ایسے موقع پر "سمجھ لیجئے" بولا جائے گا یا یوں بولا جائے گا کہ "کوئی کہے"۔ "خاموشی میں بھی یعنی جبکہ خود معشوق چپ ہے یا اس وقت جبکہ آنکھ کوئی غمزہ و عشوہ یا اشارہ نہیں بتا رہی ہو۔ چشمِ خوباں کی صفت ہے "سخن گو" جس کو ترقی دے کر شاعر نے "نوا پرداز" کہا اور "نوا سنجی" کے لئے لفظ "سوز" استعمال ہوتا ہے جسے "شعلۂ آواز" کہا جلتی ہوئی چیز سے دھواں بھی نکلتا ہے اس سرمہ کو اس نوا پردازیِ سوز کا دھواں قرار دیا۔ ایک تکلف۔

پیکرِ عشاق سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

عشاق ایک راگ کا بھی نام ہے۔ گردیدن پلٹنا گردشِ سیارہ ستارہ کی رجعت سبع سیارہ میں سے وہ پانچ ستارے جنھیں خمسۂ متحیرہ کہتے ہیں (یعنی زحل نحس اکبر مشتری سعد اکبر۔ مریخ نحس اصغر۔ زہرا سعد اصغر۔ عطارد بین بین) ان کی

رفتار میں رجعت لازمی ہے یعنی وقت اُلٹے چلنے لگتے ہیں یا مریخ کھڑا ہو جاتا ہے تو ان میں کا ہر ایک خواہ سعد ہو یا نحس بُرجِ موافق میں ہو یا مخالف میں نحس ہو جاتا ہے۔ گردش سے شاعر نے آواز کو نکالا اور گردشِ سیارہ کی آواز نحوست کی خبر ہوئی۔ مطلب یہ کہ عاشق کا وجود نالہ کش طالع ناساز کا باجا ہے جس کی ہر آواز سے ایک تازہ نحوست کا دروازہ کھلتا ہے۔ یہاں عشاق لفظِ جمع ہے اور پیکرِ واحد فارسی میں ایسی اضافت ہوتی ہے اردو میں جائز نہیں۔ یہاں بیان فارسی ہے۔

دست گاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

یک بیاباں کثرت سے دور تک۔ کہتے ہیں مجنوں کے دیدۂ خونبار کی قدرت تو ملاحظہ کیجئے کہ اس کی گل کاری کی بدولت دور تک جلوۂ گل کا فرش بچھا ہوا ہے۔

(۱۴۶)

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
مری وحشت تری شہرت ہی سہی

میرے عشق کو تو وحشت کہتا ہے تو چل اچھا یوں ہی سہی اس سے تیری شہرت کا تو فائدہ نکلے گا۔

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

(غالب) ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہے
تو تغافل میں کسی طرح سے مجبور نہیں

(ولہ) اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

(ولہ) جان کر کیجئے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

(ناطق) عداوت ہی سہی شکل اگر رسمِ محبت ہے
نہ یہ ہوتی ہے تم سے تو نہ وہ کیسی مصیبت ہے

مرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

وہاں سے اس بنا پر اذن نہیں ملتا کہ مجلس نہیں خلوت ہے یہ اس کا جواب دیتے ہیں کہ میں تو رازدار ہوں گھر کا آدمی ہوں یا میں تو مدہوش و بے خبر ہوں مجھ سے کیا رسوائی کا ڈر ہے۔ یہاں مصنف نے لفظ "اے" لکھ کر حشو کی جگہ پُر کی ہے اور لفظ کا ایسا اچھا استعمال کیا ہے کہ کیا کہئے۔

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

جب تجھے غیر کی محبت کا یقین ہی ہوگیا تو پھر ہم بھی کچھ اپنی جان کے دشمن تو نہیں کہ تجھ سے دشمن دوست کو اپنا دوست سمجھیں اچھا اب یہی سہی تو دشمن ہی کو اپنا دوست سمجھے جا یا یہ کہ غیر کی محبت کا تو تجھے یقین ہوگیا لیکن ہماری دوستی کا نہیں تو کیا جب ہم تجھے اپنی جان سمجھتے ہیں تو تیرے دشمن ہو کر خود اپنی جان کے دشمن ہو گئے ایسا تو ہو نہیں سکتا۔

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

انسان میں جو کچھ کرنے کی طاقت ہے اسے اپنی ہستی پر صرف کر دے کہ یا تو اسے سمجھ ہی لے یا بھول ہی جائے۔ یہ دونوں معرفت کی شکلیں ہیں۔ یہاں مصنف نے "آگہی" کو غفلت پر اس لئے ترجیح دی کہ بقا باللہ کا مرتبہ فنا فی اللہ سے اعلیٰ ہے۔ من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ۔

(۱۶۳)

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

اس میں اتنا تو کام ہو سکتا ہے یہ بجلی خرمنِ ہستی کو تو جلا سکتی ہے چلئے یہی کر لیجئے۔

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

ان کی حالت پر کوئی نصیحت کناں کہہ رہا ہے کہ عشق کیا ہوا مصیبت ہو گئی اجی ترکِ وفا کیجئے۔ یہ اس کا جواب دے رہے ہیں۔

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

اور کچھ نہ سہی اے فلکِ ناانصاف ہمیں اتنی مہلت تو دے کہ کہیں بیٹھ کر اطمینان سے رو لیں۔

(ناطق)
مجھ پہ اتنا تو کرم گردشِ دوراں ہوتا
یہ تو ہوتا کہ کہیں بیٹھ کے گریاں ہوتا

(ولہ)
رونا بھی بیٹھ کر کبھی ہوتا نہیں نصیب
یعنی ہمارے ساتھ محرم صفر میں ہے

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

وصل میں چھیڑ چھاڑ کا لطف حاصل ہوتا ہے اگر یہ میسر نہ ہو تو کم از کم چھیڑ چھاڑ کی حسرت ہی سہی یا حسرت ہی کی چھیڑ چھاڑ سہی یا کہ چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ قائم رکھو کہ اگر وصل نہ بھی ہو تو حسرت وصل باقی رہے ورنہ یاس اپنا رنگ جمائے گی۔

(۱۴۷)

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

عاشق بیاباں نورد یا جہاں گشت کو شامِ وطن سامانِ آرمیدگی ہے سفیدارِ صبح کو صبح خنداں لکھتے ہیں۔ کہتے ہیں چونکہ اس عالمِ وحشت میں رات بھر قیامِ وطن کو میں اپنے لئے وجہ ملامت سمجھتا ہوں اس لئے صبحِ وطن میرے واسطے خندۂ دنداں نما کا کام کر رہی ہے یعنے صبح آئی تو میری آرام طلبی کی ہنسی اڑتی ہوئی آئی۔

(ناطق)
ہمارا نسخۂ دردِ جگر بزم نکوہش ہے
دوائیں خندہ زن ہیں چارہ گر تاثیر ہنستی ہے

ڈھونڈے ہے اُس مغنیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

ایسے مغنی آتش نفس کو جی ڈھونڈ رہا ہے جس کی آواز میرے خرمنِ وجود کے لئے برقِ فنا ثابت ہو یعنے کسی ایسے آتش دم پیرِ کامل نغمہ خوانِ حقیقت کی تلاش ہے جن کے نفوسِ قدسیہ مجھے فنا فی اللہ کر دیں۔

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

انسان بے خبری میں کسی جنگلی راستے سے گزر جائے تو واپسی اسی کے لئے تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ میں یہ سوچ کر وادیِ خیال کے راستے کو مستانہ طے کرتا ہوا چلا جا رہا ہوں اور کہیں دم نہیں لیتا کہ پھر میرے لئے واپسی کا راستہ یا مجھے واپسی سے واسطہ بھی نہ رہے یعنی میں مراقبات میں اپنے اندازِ مستانہ سے اس طرح قطع منازل حقیقت کرتا چلا جا رہا ہوں کہ مجھے کبھی رجعت سے واسطہ نہ پڑے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ صوفی مدارجِ تصوف میں ترقی کرتے ہوئے اگر

کسی مقام پر جا کر رُک جاتا ہے تو اس کو تنزل ہونا شروع ہو جاتا ہے اسی کا نام بازگشت ہے۔ وادیٔ خیال سے یہاں مراد ہے مراقبات جو یکسوئی خیال کا نام ہے۔ "کرد ہوں" کی جگہ "کرتا ہوں" بولا جاتا ہے۔

کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

نکہتِ گل کی بے حجابیوں پر طعنہ زن تھا اب جو تو باغ میں بے حجابیاں کرتا ہے تو میں اسے کیا منہ دکھاؤں۔ یا نکہتِ گل باغ سے تیری بے حجابیوں کی خبر لے کر آتی ہے جس کی بدولت مجھے اس سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ یا نکہتِ گل کے ساتھ جس کی صفت آوارہ ہے تو باغ میں بے حجابیاں کرتا ہے اس لئے مجھے اس آوارہ گرد سے جس نے تجھے اپنے ڈھب پر چڑھا لیا ہے شرم آنے لگی ہے۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

میں نے عاشقانہ اشعار کو پسند کیا اس سے لوگ سمجھ گئے کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے یا یہ کہ میرے اشعار کا جو انتخاب کیا گیا اس میں عاشقانہ رنگ کی جھلک دیکھ کر لوگ پتے کی بات پا گئے۔ یا میرے رنگ بیان میں تصوف نے میرے دل کا معاملہ واضح کر دیا جس کو اہلِ باطن رسوائی سمجھتے ہیں ؎

آبروئے ضبط تھی موتی کی آب خوب تو نے دردِ دل رسوا کیا

(۱۴۸)

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

مصیبت کے وقت جب اپنے کام نہ آئیں تو کہا کرتے ہیں کہ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ ہمارا کوئی تھا۔ مصنف نے اس خیال کو ترقی دے کر اپنے خدا تک پہونچا دیا اور بات

بھی یہی ہے کہ خدا سے زیادہ کون اپنا ہو سکتا ہے۔ مصنف کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

(۱۴۹)

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

کوئی ناخواندہ مہمان محفل میں آ بیٹھے تو اہلِ بزم ایک دوسرے کو بتاتے ہوئے اس کی جانب چشم و ابرو سے حقارت آمیز اشارے کیا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں اس بزم میں مجھ سے پاسِ حیا کرنا ناممکن ہے چنانچہ وہاں سے خود کو اٹھا لانا اس قدر گراں تھا کہ اشارے ہوا کئے تو بھی میں دیکھتا رہا اور بے عزتی سے بیٹھا ہی رہا۔

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کئے

یہ فقیر اس دروازے سے گزرتا تو ضرور صدا لگاتا تھا آج خلافِ عادت چپ نکل گیا تو اس پر باز پرس ہو گئی اس باز پرس کا یہ شعر جواب ہے کہ سیاستِ درباں کے خوف سے آج ایسی فروگزاشت ہو گئی دل تو ہے کبھی ان باتوں کا بھی اثر ہو جاتا ہے۔

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن مے
مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کئے

آب و ہوائے برشگال جس کی دعوت مے سے ہوتی ہے۔

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے

کل فردائے قیامت۔ بے صرفہ بے فائدہ بے کار لاحاصل۔ قیامت کے روز ہر کسی کو یہی افسوس ہو گا کہ ہائے میں نے دنیا میں کچھ نہ کیا بقولِ مصنف۔

(غالب) جاتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کہیں
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

مطلب یہ کہ انسان کی عمر کتنی بھی طویل ہو اور کتنا بھی نیک ہو لیکن اسے عبادت کی فرصت نہیں ملتی اور یوں ہی لغویات میں گزر جاتی ہے چنانچہ اسے ہمیشہ عمرِ رفتہ کے ضائع ہونے کا افسوس رہا کرتا ہے حضرت خضر بھی جو دنیا کے سب سے زیادہ دراز عمر اور مقدس بزرگ ہیں قیامت کے روز یہی افسوس کریں گے کہ میں نے گھومنے پھرنے میں عمر گزار دی اور کہیں بیٹھ کر عبادت نہ کی۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے

لئیم کنجوس منحوس۔ کہتے ہیں وہ مدفون اہلِ جوہر جن میں کا ایک ایک رشکِ صد گنجِ گوہر تھا تو نے انھیں چھپا کر رکھا تو آخر کیا کیا۔ یا یہ کہ خزانے اب تک زمین میں دفن کیے جاتے رہے ہیں جن میں سے بہت سے نکالے نہیں گئے یہ یوں پوچھتے ہیں کہ زمین جو انھیں ہڑپ کر کے بیٹھی ہے تو اس سے یہ پوچھتا ہے کہ آخر یہ تیرے کس کام کی۔

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

دشمن ہمیشہ روز نئی نئی تہمتیں لگاتے رہے اور تم ان کے بہکانے میں آکر روز ہم پہ ستم ڈھاتے رہے۔ یا یہ کہ دشمنوں کا ہم پر تہمتیں تراشنا ناحق کے سر پہ آرے چلانا ہے۔

صحبت میں غیر کے نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

بے التجا بوسہ دینا معشوق کے لیے نہایت پست اخلاقی اور بے حیائی کا ثبوت ہے اب جو اُسے ایسا کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ یہ خصلت کہاں سے آئی کہیں دشمن کی صحبت میں رہ کر تو اُس کی ذلیل عادتیں نہیں سیکھ لیں۔

کہاں ہیں معترضینِ داغ اس شعر پر غور کریں۔

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں
بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

ضد کی اور بات ہے ورنہ معشوق عادتاً بے وفا نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ بھولے سے بھی کوئی وعدہ وفا نہ کرتا۔

غالبؔ تمھی کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

ہم تو کہتے ہیں کہ وہ عرضِ مدعا کو ہرگز نہ سنیں گے لیکن اگر تمھیں بھروسہ ہے کہ وہ اس گفتگو کو چپ ہو کر سن لیں گے تو پھر اب تم ہی کہو کہ کیا کوئی مطلب کا جواب مل سکتا ہے۔

(۱۵۰)

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

قطعِ راہِ اضطراب اس راستے کو طے کرنا جہاں اطمینان نصیب نہ ہو ظاہر ہے کہ اس مقام پر جہاں چوروں کا خطرہ ہو اس پُل سے جس کے گر جانے کا ڈر ہو اس مکان میں سے جس میں آگ لگی ہوئی ہو یا اس پتھر پر سے جو تپ رہا ہو انسان نہایت تیزی سے نکل جاتا ہے۔ کہتے ہیں رفتارِ عمر راہِ اضطراب کو طے کرنا ہے جس میں برسوں کا حساب پورا کرنے کے لیے سورج کی رفتار بجلی کی رفتار بنی ہوئی ہے۔

(ذوق) ہنگامہ گرم ہستیِ ناپائیدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے
بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے

تدرو ایک خوش رنگ سرخ پرندہ مینائے مے اور سرو میں وجہ تشبیہ استقامت و سبزی ہے اس طرح بالِ تدرو اور شراب میں سرخی اور حرکت ہے جسے تموج کہتے ہیں۔ کہتے ہیں نشاطِ بہار کے اثر سے سرو کی مستانہ ادا مینائے مے کا سر و قد پیدا کر رہی ہے اور بالِ تدرو یہ عالم پرواز جلوۂ موجِ شراب کا لطف دکھا رہا ہے یعنے ہر شے نشاط افزا ہے۔

(غالب) ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

(ولہ) نغمہ ہائے شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب
شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

"گوں" سقل بالضم لفظ فارسی بمعنی قابل اور "گوں" بالفتح لفظِ اردو بمعنی غرض مگر یہاں اردو لفظ بن کر معنی خاطر خواہ پیدا نہیں ہوتے اس لئے "گوں" بمعنی فارسی لیا جائے گا یہاں بمعنی فارسی اس لفظ کا کچھ ایسا استعمال ہوا ہے جو اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ غیر مانوس الفاظِ فارسی کا استعمال اردو میں بغیر ترکیب فارسی کے اب بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ پاشنہ ایڑی۔ کہتے ہیں پاشنۂ پائے ثبات کے زخمی ہونے سے اب یہ حال ہے کہ نہ تو رہ نوردیٔ شوق میں ثابت قدم رہنے کی تاب اور نہ نکل بھاگنے کی قابلیت اسی مضمون کا ایک شعر اور لکھا ہے۔

(غالب) ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے

جا داد بادہ نوشیٔ رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

غافل نے جس دنیا کو خراب آباد عالم سمجھ رکھا ہے اصل میں اس خرابات کا ہر گوشہ بادہ نوشانِ حقیقت کی جاگیر ہے جس سے ہر ایک اپنے ظرف کے مطابق سرشار یا مستفیض ہوتا ہے اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ۔

(سعدی) کسانے کہ یزداں پرستی کنند
بآوازِ دولاب مستی کنند

اسی مضمون کو ذرا کم صنعت یوں لکھا ہے۔

(غالب) رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا
جوشِ بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

جوشِ بہار بہارِ عالم یعنی جلوۂ موجوداتِ حسن کا نظارہ بجائے خود ہوشربا ہے مطلب یہ کہ جس برقِ حسن کا جلوۂ نقاب ہی ہوشربا ہو خود اس کے نظارہ کی کون تاب لا سکتا ہے۔ دوسری جگہ اسی مضمون کو بدل کر یوں لکھا ہے۔

(غالب) نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
شوخی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

دل کی تسلی کو دل کی تسلی کے لئے۔ کہتے ہیں مانا کہ تیرا جلوۂ دیدار نصیب ہے جس سے تسلی ہو جانا چاہیے لیکن میں نامراد اس کا کیا علاج کروں کہ محض دیدار سے دل کو تسکین نہیں ہوتی اس طرزِ بیان کو حسن طلب کہتے ہیں۔

گزرا اسد مسرتِ پیغامِ وصل سے
قاصد پہ مجھکو رشکِ سوال و جواب ہے

صدمۂ ہجر گوارا۔ پیغام وصل نہ آنا منظور لیکن یہ گوارا نہیں کہ کوئی اس سے گفتگو کا موقع پا جائے خواہ اس میں خود میری ہی بھلائی کیوں نہ ہو۔

(۱۵۱)

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

معشوق کو کوئی دیکھے اس بات کا رشک بدقسمتی سے اس حد تک پہونچ گیا ہے کہ اب مجھ سے یہ بھی گوارا نہیں ہوتا کہ خود میں بھی اسے دیکھوں یعنی دل کو نظر پر رشک آتا ہے۔ یہاں جو مصنف نے "اپنے پہ" کا استعمال کیا ہے اس کی جگہ اب "اپنے اوپر" کہتے ہیں اور "اپنے پہ" کا استعمال آج کل "اپنے واسطے" کی جگہ ہوتا ہے۔

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

دل کو آئینہ اور فکر کو شعراء عام طور پر صہبا سے تعبیر کرتے ہیں۔ گرمی ایک مقدار پر پہونچ کر شیشہ کو پگھلا دیتی ہے۔ مطلب یہ کہ اگر گرمی فکر کا یہی عالم ہے تو دل سے ہاتھ دھو بیٹھ کیونکہ اس صہبا کی تندی اب اس درجے تک پہونچ گئی ہے کہ شیشۂ دل پگھلنا شروع ہو گیا ہے۔

غیر کو یا رب وہ کیونکر منع گستاخی کرے
گر حیا بھی اسکو آتی ہے تو شرما جائے ہے

بے حیا دشمن کو منع گستاخی کرنے کیلئے ڈانٹ ڈپٹ کی ضرورت ہے اور زجر و توبیخ بغیر شرم

ناممکن۔ مطلب یہ کہ معشوق کی حالت تو یہ ہے کہ شرم بھی اس کے پاس آتی ہے تو شرما جاتا ہے پھر اگر غیر آمرے تو اسے وہ کیونکر منع گستاخی کرے۔ یا اللہ یہ ایک بڑی فکر کی شکل آپڑی۔

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

دل ایسا کمزور اور شوق کا یہ زور اس کی لت اور اس کی حالت نے کشمکش کا عالم پیدا کر رکھا ہے۔

دور چشم بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

بے درد معشوق سے طنزاً کہہ رہے ہیں کہ میرا نالہ بھی تری بزم طرب میں جا کر وجہ مسرت ہو گیا واہ وا چشم بد دور اس طرب انگیزی کا کیا کہنا۔ یا یہ کہ تیری بزم طرب سے چشم بد دور کہ وہاں جا کر اسبابِ اضطراب بھی سامانِ طرب بن جاتے ہیں۔

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

اپنے تغافل سے رازِ عشق کی پردہ داری ہو سکتی ہے لیکن یہاں تو حالت یہ ہے کہ تغافل کرنے پر آئیں تو وہ عالمِ غفلت یا بیخودی طاری ہوتا ہے کہ معشوق دل کی کیفیت کو تاڑ جاتا ہے۔

(ناطق)
کھوئے نہ جاتے ہم تو نہیں پاتے اہلِ بزم
آتا نہ ہم کو طیش تو جاتا بھرم نہیں

اس کی بزم آرائیاں سن کر دلِ رنجور یاں
مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

جس طرح اس کی بزم آرائیاں نقشِ مدعائے غیر بیٹھا یعنی جما جاتا ہے اسی طرح وہاں کا حال سن کر میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ یہاں مصنف نے لفظ "بیٹھا جائے ہے" کہ دو معانی

میں لکھا ہے اور ایک لفظ سے دونوں فائدے اُٹھائے ہیں۔

ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

چہرہ کا رنگ اڑ کر سفید پڑ جانے کو کھلنے سے تعبیر کیا ہے یا یہ کہ جس قدر رنگِ رُخ اڑ جاتا ہے اسی قدر رنگِ نزاکت کھلتا جاتا ہے یہاں مصنف نے "پریدن" کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پری رخ۔ اڑنے کی مناسبت سے استعمال کیا ہے جو مراعات النظیر کی ایک اچھی مثال ہے جسے آج کل کے بعض احمق فنی شاعری کہہ کر اپنی نا اہلیت کا ثبوت دیتے ہیں میرے نزدیک مراعات النظیر کا استعمال جو تکلف سے بری ہو بہترین بیانِ شعر ہے۔

نقش پر اس کے مصور کو بھی کیا کیا ناز ہے
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

ایک متکبر کی تصویر جیسے جیسے مکمل ہوتی جائے گی ویسے ویسے اندازِ تکبر اس میں بڑھتا جائے گا مطلب یہ کہ معشوق کی تصویر مصور سے بھی کیا کیا ناز کرتی ہے کہ جس قدر وہ کھینچا جاتا ہے اسی قدر کھنچتی جاتی ہے یعنی اس میں خود داری پیدا ہوتی ہے۔

ادب آموزِ خاموشی ہے کتنا پیرے خانہ (عزیز لکھنوی)
کھنچا بیٹھا ہے بیکس صورتِ تصویر میخانہ

اگرچہ اس شعر میں دوسری ردیف بھی بیکار ہے اور کھنچا بیٹھنا ادب آموزی کا نتیجہ بھی نہیں ہو سکتا لیکن پھر بھی شعر برا نہیں۔

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

مجھ آتش بجاں کے پاس کون ٹھہر سکتا ہے جبکہ خود میرا سایہ مجھ سے اس طرح دور بھاگتا ہے جس طرح کہ آگ سے دھواں۔ اسی مضمون کا دوسرا شعر بھی ملاحظہ فرمایئے۔

بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے ہے
سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

(۱۵۲)

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

شکلِ نہالی سرو قد یعنی معشوق جس طرح درخت کی لکڑی کو جلا کر موسم سرما میں گرمی حاصل کی جاتی ہے اُسی طرح شکلِ نہالی یعنی تصویرِ قدِ یار سے گرمی حاصل کر کے میں نے شب ہائے ہجران کی سرد مہری سے اماں حاصل کی کیونکہ اس کی یاد نے مجھے سرگرمِ فریاد رکھا۔

کثرت آرائیٔ وحدت ہے پرستاریٔ وہم
کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

بتوں کو بُت یا غیر اللہ سمجھتے ہیں مجھ پر کفر عائد ہو گیا کیونکہ عالم جو بجز وجود موجود ہے اس وحدت کو کثرت سمجھنا خدا پرستی نہیں بلکہ وہم پرستی ہو گئی۔

ضد میں مرے سجدے کی ہوا غیر کا پابند (ناطق)
واعظ نے خدائی سے نکالا ہے خدا کو

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

دنیا طلبی کو نقد اور سعیٔ عقبیٰ کو ادھار سودے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اہلِ عالم کے اکثر اعمال انھیں دو خیالات کے ماتحت ہوتے ہیں کہ ان سے طلبِ جاہ ہوتی ہے یا طلبِ آخرت۔ یہ کہتے ہیں کہ دنیا اور عقبیٰ دونوں کھلی ہوئی بے حقیقت اشیاء ہیں اس لئے میں نہ اس کے سودے میں نہ اس کے لینے میں تو ایک تیسری چیز جو دونوں سے بالاتر ہے یعنی اپنی ہمتِ عالی کے ہاتھوں بکا ہوا ہوں کہ میرے اعمال کو ریاد رہا ہے کوئی واسطہ نہیں۔ بڑا اچھا شعر ہے۔

ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

بے پر و بالی نے بھی مجھے عجب آرام دیا کہ ہوسِ گل کا کانٹا ہی دل سے نکل گیا یعنی اسبابِ ہوس کا معدوم ہو جانا وجہ راحت ثابت ہوا کہ روح کو نفسِ امارہ کے مظالم سے نجات حاصل ہو گئی۔

(۱۵۳)

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت خونِ گرم دہقاں ہے

لفظ "داغ ساماں" بلا اضافت یعنی دنیا کے کارخانے کی حالت یہ ہے کہ یہاں لالے کا داغ سامانِ لالہ یعنی اس کے لئے وجہ رونق ہے اور خونِ گرمِ دہقاں برق کے لئے خرمنِ راحت ہے۔ یہاں لفظ "ساماں" مشترک ہے اور دونوں مصرع جدا جدا ایک ہی قسم کی دو حالتوں کو بیان کر رہے ہیں۔ حاصل یہ کہ سامانِ عالم غم ہے اور نتیجۂ محنت بربادی۔ اس زمین کے تین شعر مصنف نے شائع کئے ہیں اور ان کی تشریح بھی خود کی ہے آپ ذرا اس نثر کو بھی ملاحظہ فرمائیں۔ اس شعر کی شرح یوں کرتے ہیں کہ "داغ ساماں" مثلِ انجم انجمن وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ و سامان ہو موجودیت لالے کی منحصر نمائشِ داغ پر ہے ورنہ رنگ تو اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے بعد اس کے یہ سمجھ لیجئے کہ پھول کا درخت یا غلہ جو بویا جاتا ہے دہقاں کو جوتنے بونے پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو گرم ہو جاتا ہے مقصود یہ ہے کہ وجود محض رنج و عنا ہے مزارع کا وہ لہو جو کشت و کار میں گرم ہوا ہے وہی لالے کی راحت کے خرمن کا برق ہے حاصلِ موجودیت "داغ" اور "داغ" مخالفِ راحت اور صورتِ رنج۔

غنچہ تا شگفتن ہا برگِ عافیت معلوم
باوجودِ دلجمعی خوابِ گل پریشاں ہے

برگِ عافیت معلوم یعنی سامانِ راحت معدوم۔ بستہ کلی کی شکل دل کی جیسی ہوتی ہے اور گل کو خنداں باندھتے ہیں کلی کو لب بند و خاموش کہا جاتا ہے مصنف نے سکوت سے دلجمعی کو اخذ کیا اور گل بعد شگفتن آمادۂ پریشانی ہوتا ہے مطلب یہ کہ غنچے کے لئے کھلنے تک سامانِ اطمینان نہیں کیونکہ اسے باایں ہمہ دلجمعی خیالِ گل خوابِ پریشاں ہے کہ مجھے شگفتہ ہو کر برباد ہونا ہے۔ مصنف نے اس شعر کا مطلب اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے کہ "کلی جب نئی نکلے بصورتِ قلبِ صنوبری نظر آئے اور جب تک پھول بنے برگِ عافیت یہاں معلوم بمعنی معدوم اور برگِ عافیت بمعنی مایۂ آرام برگ اور سرو برگ بمعنی ساز و سامان خوابِ گل باعتبار خموشی و برجا ماندگی پریشانی ظاہر ہے یعنی شگفتگی پھول کی بکھرنا کا بکھرا ہوا ہونا غنچہ بصورتِ دل دجمع ہے باوصفِ جمعیتِ دل گل کا خواب پریشاں ہے۔

ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اٹھایا جائے
داغ پشتِ دستِ عجز شعلہ خس بہ دنداں ہے

داغ مصنف کے خیال کے مطابق دھوئیں سے پیدا ہوتا ہے جس کے متعلق لکھ آئے ہیں۔

> آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست (غالب)
> ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

جب داغ دھوئیں سے بنا اور دھواں پریشان ہوتا ہے تو داغ پریشانیوں کا مجموعہ ہو گیا جسے بیتابی بھی کہتے ہیں۔ خس بدنداں ہونا اظہارِ عجز کی قدیم رسم ہے جس کے متعلق لکھ آئے ہیں۔

> نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو (غالب)
> لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

آگ اپنی بیتابی اور شعلہ خوئی کے لئے ضرب المثل ہے۔ پشتِ دستِ عجز اُس ہاتھ کی پیٹھ جو پست ہمت ہو کر گر جائے۔ شعلہ کو بیتاب مانا جاتا ہے۔ داغ سے مراد وہ داغ جو شعلہ کی لَو سے پیدا ہوتا ہے جیسا کہ چراغ سے کاجل لیا جاتا ہے اور یہ داغ بصورت پشتِ دستِ عجز نیچے ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہم رنجِ بیتابی کو کیونکر برداشت کر سکتے ہیں جبکہ داغِ پشتِ دستِ عجز کی طرح زیر اور شعلہ جو گھانس کے جلنے سے نکل رہا ہے خس بدنداں کی صورت میں موجود ہے یعنی اظہارِ عجز کر رہا ہے کہ نہ شعلہ سے رنجِ بیتابی برداشت ہوتا ہے نہ داغ سے تو پھر ہم کیا ہیں جو اسے اٹھالیں۔ مصنف نے اس کا مطلب یوں بیان کیا کہ "پشتِ دستِ عجز اور خس بدنداں گرفتن کبھی اظہارِ عجز ہے پس جس عالم میں کہ داغ نے پشت زمین پر رکھ دی ہو اور شعلہ نے تنکا دبا لیا ہو ہم سے رنج و اضطراب کا تحمل کس طرح ہو۔ مصنف نے اپنے ایک خط میں ان اشعار کے متعلق یہ لکھا ہے کہ "یہ اس دیوان کا بقیہ نمونہ ہے جو تمیز آنے کے بعد خود مصنف نے دور کیا اور سب شعر یک قلم چاک کر ڈالے" غالب کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد انھیں ایسے اشعار کی نسبت اپنی طرف منظور نہیں رہی مگر بدقسمتی سے جب زمانے نے غالب پرستی اختیار کی تو ان کے اس کلام کی بھی تلاش ہوئی جسے مرزا نے اپنے الفاظ میں دور کیا تھا اور ان کے یہ الفاظ کہ "جب تمیز آئی" صاف بتا رہے ہیں کہ انھوں نے اس کلام کو ایک طوفانِ بے تمیزی سمجھا تھا۔ ہوتا یہ ہے کہ شاعر زمانۂ مشق میں اول سے آخر تک اپنے اشعار کو پیش کرتا رہتا ہے جس کی نقلیں بھی لوگوں کے پاس موجود ہوتی ہیں چنانچہ جو پائندہ یا بندہ غالب کے پہلے والے مجموعہ کی ایک نقل نواب حمید اللہ خاں صاحب فرماں روائے بھوپال کو اپنے زمانۂ ولیعہدی میں ریاست کے کتب خانے کے اندر مل گئی اور ایک نسخہ مولانا عبد الباری صاحب آسی کے ہاتھ آیا جو دونوں چھپ چکے ہیں بلکہ مولانا آسی نے تو اس کی شرح بھی کی ہے میرے نزدیک یہ سب کلام غالب سے منسوب بھی کیا جا سکتا ہے اور نہیں بھی اس طرح کہ اس کی خوبیوں کی داد ضرور انھیں دی جا سکتی ہے لیکن عیوب کے وہ ذمہ دار نہیں کہ خود اسے اپنے کلام سے علیحدہ کر چکے تھے۔ غالب کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ آپ مشقِ سخن کی ابتدا

میں کچھ غزلیں میر تقی میر کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے تھے جنھیں دیکھ کر انھوں نے کہہ دیا کہ "اگر اس لڑکے کو کوئی اچھا استاد مل گیا تو بڑا اچھا شاعر ہوگا ورنہ مہمل بکنے لگے گا مگر چونکہ خود میر نے انھیں اصلاح نہیں دی اس لئے غالب چندے مغلق ہی لکھتے رہے جنھیں مہمل گوئی کہئے یا کچھ اس کے بعد جو لوگوں کے اعتراضات پر خیال کیا تو یہ لکھا۔

(غالب)

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخن وران کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

پھر سنبھلے تو وہ کچھ لکھا کہ دنیائے شاعری میں سکہ جما لیا اور آسان بھی لکھا تو ایسا کہ بہت سے اشعار سہل ممتنع ہو کر اردو کے روزمرہ میں شامل ہو گئے ہیں۔ اور روزانہ گفتگو میں کثرت سے پڑھے جاتے ہیں۔

(۱۵۴)

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

جس بہار کے لئے ہم بیاباں میں پڑے ہیں وہ گھر پہونچی یعنی سبزے کا گھر میں اُگنا علامتِ ویرانی ہے تو اب ہم جس ویرانی کے لئے بیاباں میں آئے ہیں وہ اس وقت خود گھر میں بھی موجود ہے۔ مصنف نے اس مضمون کے کئی شعر لکھے ہیں۔

(۱۵۵)

سادگی پر اُس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

قاتل سے مطلب معشوق دستِ نازک میں خنجر ہو تو بانکپن پیدا ہو جاتا

ہے جو سادگی کے منافی ہے مطلب یہ کہ ہمارے دل میں حسرت ہے کہ سادہ ادائی پر جان دیدیں لیکن کچھ بس نہیں چلتا کہ جب جاتے ہیں تو اُس کے ہاتھ میں خنجر ہی نظر آتا ہے چنانچہ آج پھر وہی معاملہ در پیش ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

لذت تقریر کا یہ عالم ہے کہ اس کی ہر بات اس سرعت کے ساتھ دل میں اُتر جاتی ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اُسے میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرے ہی دل کی بات ہے۔ بڑا اچھا شعر ہے اور بہت مشہور ہے۔

گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

میرا ذکر مجھ سے اچھا ہے کہ وہاں ہے تو خواہ بُرائی ہی سے سہی مگر پہونچ تو گیا میری تو کسی صورت رسائی نہیں ہوتی۔

(ناطق) کیا میں غریب جاؤں یاران ہم وطن میں
تا دم ہے ذکر میرا آکر جس انجمن میں

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ لاحاصل میں ہے

سعی لاحاصل میں امید حاصل کی لذت ہے جو ہجوم ناامیدی سے خاک میں مل جائے گی۔ اسی مضمون کو میں نے ایک نظم میں ادا کیا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے۔

(ناطق) جان تھی دل کے لئے وہ آرزو جو دل میں تھی
کیا بتاؤں کیسی لذت سعیِ لاحاصل میں تھی

رنجِ رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے
اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

رنج راہ حصول مقصد کے لئے یا قدرداں کی تلاش میں اُٹھایا جاتا ہے اور یہاں واماندگی جب عاشق ہو کر پاؤں پر لوٹ گئی تو اس کی قدردانی ظاہر ہے۔ کہتے ہیں کہ واماندگی نے جب از راہ قدردانی پاؤں لئے تو اب ہمیں تکلیف سفر اُٹھانے کی کیا ضرورت باقی رہی کیونکہ اس طرح جو قدم اُٹھ نہیں سکتا ہو وہ واماندگی کی قدردانی سے منزلِ مقصود میں پہونچ گیا اور آگے بڑھنے کی حاجت نہ رہی۔ یہاں پہلے مصرع میں ردیف کا آخر حصہ "ہے" آگیا جسے اب پسند نہیں کیا جاتا۔

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گِل میں ہے

معشوق نے طنزاً کہا تھا کہ تیرے دل میں جہنم کی سی آگ بھری ہے یہ اسے مانتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیرے آب و گِل میں جو فتنۂ شورِ قیامت بھرا ہے یہ اُسی سے تو ہے کیونکہ جہنم کا وجود قیامت کے لئے ہے۔

ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

تیری تمنا غالب کے دلِ شوریدہ میں رہ کر ایک طلسمی شکل میں پھنسی ہوئی ہے اس پر رحم کر اور پیچ و تاب دور کرنے کی تدبیر نکال۔

(مولانا آسی) خرابِ خانۂ دل اور موجِ سیلِ سرشک
تم اپنی یاد سے کہدو کہ اب یہاں نہ رہے

(ناطق) ہے ہے دلِ سوزاں میں ہے حسرت بھی تمہاری
للہ نکالو اسے جلتے ہوئے گھر سے

ایک عزیز کی فرمائش ہے کہ اس زمین میں میں نے جو غزل لکھی ہے اُس کا مطلع بھی یہاں لکھدوں تعمیل کی جاتی ہے۔

(ناطق) رعبِ حسن و عرضِ مطلب جان کس مشکل میں ہے
منہ کی منہ میں رہ گئی ہے بات دل کی دل میں ہے

(172)

(۱۵۶)

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اِک ادا میں رضامند کر گئی

دونوں ایک ہی ادائے ناز کے مشتاق تھے اس لئے تیری نگاہ ناز جو دل سے جگر تک اُتر گئی تو دونوں خوش ہو گئے۔ اسی مضمون کو پہلے یوں لکھ آئے ہیں۔

(غالب) اک تیر ہے کہ جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جُدا تھا

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذت فراق
تکلیفِ پردہ داری زخم جگر گئی

آداب عشق یا تعمیل ارشاد میں زخم جگر کی پردہ داری کی تکلیف اُٹھانی پڑتی تھی لذت فراق کا بھلا ہو کہ اس نے سینہ کو شق کرکے آپ سے آپ اسے کھول دیا اور ہم بری الذمہ ہو گئے۔ یہ مضمون تقریباً ہر ایک نے نظم کیا ہے مگر یہ طرز بیان کہاں۔

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھئے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

خواب سحر کی لذت شبِ جوانی کے ساتھ ہوتی ہے جس کے لئے بادۂ شبانہ کا جملہ استعمال کیا۔

(ناطق) جو تک ناطق کہ ہوئی شامِ جوانی رخصت
آنکھ مل ڈالی بہت نیند کے ماتوں میں رہا

اُڑتی پھرے ہے خاک مِری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی

ہوسِ بال و پر کوئے یار میں اڑتے پھرنے کے لئے تھی جب وہ غرض یوں حاصل ہو گئی تو بال و پر کی ضرورت ہی کیا باقی رہی۔

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

گل کترنا یا شگوفہ چھوڑنا فتنہ انگیزی کے مرادف ہے۔ مطلب یہ کہ موجِ خرامِ ناز قدم قدم پر شگوفے چھوڑ گئی ہے ذرا اندازِ نقشِ پا کی دلفریبی تو دیکھو یعنی یہ دلفریبی وہ ولولہ انگیز ہے جس سے فتنۂ محبت پیدا ہوتا ہے۔

(غالب) جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

اہلِ نظر کا شیوہ ہونے کی وجہ سے حسن پرستی کی آبرو تھی لیکن چونکہ یہ کام ہر بوالہوس کرنے لگا اس لئے حسن پرستی ہی کی آبرو نہ باقی رہی۔

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

"واں" "ترے رخ پر" مطلب یہ کہ دم نظارہ سرورِ حسن سے ہر نگہ مست ہو کر ترے چہرے پر بکھر گئی اس طرح دو باتیں مانعِ نظارہ ہوئیں ایک تو یہ کہ مستی یعنی بے خودی دوسرے نگہ کا بکھر جانا جس کے تارہا نظر نے پھیل کر نقاب کی صورت اختیار کر لی۔ اس میں ایک بات یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب نگہ بہ عالمِ مستی بکھر گئی تو تارِ نظر کا تعلق آنکھ سے باقی نہ رہا اب کیا نظر آتا۔

فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

فردا آنے والی کل جس کو اہلِ عرب "غد" کہتے ہیں اور اصطلاح اہلِ فارس میں عموماً

شعرا میں خصوصاً لفظِ فردا قیامت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے "دی" یا دیروز گزشتہ کل جس کے لئے عربی میں لفظ "امس" ہے۔ کہتے ہیں کہ کل تمہارے جاتے ہی ہم پر قیامت کی مصیبت آگئی اور چونکہ دیروز میں فردائے قیامت تھی اس لئے دونوں الفاظ کا فرق اعتباری مٹ گیا۔ مولانا حالی نے اس کی شرح اس طرح کی ہے کہ "تمہارے جاتے ہی بہ سببِ خود رفتگی و خود فراموشی کے یہ حالت ہوگئی کہ آج اور کل کی مطلق تمیز نہ رہی اور ایسا ہی قیامت کے نسبت بھی کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی و مستقبل دونوں مبدل بہ زمانۂ حال ہو جائیں گے بس تم کیا گئے گویا قیامت گزر گئی۔ قیامت گزرنے کے دو معنی ہیں نہایت سختی کا زمانہ گزرنا اور خود قیامت کا آجانا۔ یہ بھی سہی۔

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

کسی ایسے شخص یا دوست کے ملنے پر اس قسم کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جو پہلے تنومند اور حوصلہ ور رہا ہو اور مرورِ زمانہ سے اُس کے وہ اوصاف بوقت ملاقات باقی نہ رہیں۔ شاعر نے اس شعر میں خود کو مخاطب بنا لیا ہے۔

(۱۵۷)

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت اگر ملے

جنت کی حوروں میں اگر تیری صورت کی کوئی حور ملے تو ذوقِ نظر ملے اور جو یوں ہمیں ذوقِ نظر ملے تو ہم کو تسکینِ خاطر کا رونا کیوں ہو۔ حاصل یہ کہ ہمارے لئے خلد میں صورتِ تسکین نہیں کیونکہ یہاں تیری صورت کی ایک بھی حور نظر نہیں آتی یا یہ کہ ہمیں تسکینِ خاطر تو تیرے ملنے سے ہوگی لیکن ذوقِ نظر کے لئے ایسی صورت بھی غنیمت ہے اس لئے اگر خلد میں تو نہ ملا تھا تو تیری صورت کی کوئی حور ہی مل جاتی کہ ذوقِ نظر تو حاصل ہوتا اور ہم اسی پر صبر کرتے اور تسکین کے لئے

رونا نہ پڑتا۔

اپنی گلی میں مجھکو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

میں بعدِ قتل شہید ہوں گا اور شہیدوں کے مزار زیارت گاہِ عالم ہوتے ہیں جن کا پتہ سب کو رہتا ہے اس لئے اگر میں بعدِ قتل تری گلی میں دفن ہوں گا تو لوگوں کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہ پڑے گی آسانی کے ساتھ میرے مزار کے پتے سے تیرا گھر مل جائیگا اور ہر ایک کو تیرا گھر مل جانا میرے لئے باعثِ رشک ہے اس لئے مجھے بعدِ قتل اپنی گلی میں دفن نہ کر کہ میرا مزار خود میرے لئے باعثِ زحمت ہوگا۔

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

ہم تو ہر رات کو حسبِ توفیق تھوڑی بہت شراب پی ہی لیتے ہیں لیکن آج اس بات کی لاج رکھو کہ تم پلا رہے ہو یعنی پلا کر سیر اور مست کر دو۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

اے ندیم تجھ سے ہمیں کچھ نہیں لیکن تیری صلاح سے جو نامہ بر بھیجا گیا تھا اور جس کی ہمت پر تجھے دعویٰ تھا کہ یہ جائے گا اور ضرور جواب لائے گا مگر جا کر وہیں کا ہو رہا وہ اگر مل جائے تو میرا سلام کہنا کہ واہ خوب گئے اور خوب آئے۔ تجھے ہم کیا کہیں کہ تو نے تو ایک آدمی پر بھروسہ کیا تھا اور دنیا کے کام بھروسہ پر چلتے ہیں اگر وہ بے بھروسہ نکلا تو اس میں تیرا کیا قصور ہے۔

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

غمِ پنہاں کی کشاکش سے اگر فرصت مل جائے تو تمہیں بھی ہم وہ کر دکھائیں جو مجنوں نے

کیا تھا یا وہ کچھ کر دکھائیں کہ مجنوں سے بھی نہ ہوا ہو۔ یا یہ کہ مجنوں کو غمِ پنہاں کی کشاکش نہ تھی اس لئے وہ بے فکری سے اچھل کود کرتا رہا ہمیں بھی اگر اس سے نجات مل جائے تو پھر دیکھ لینا کہ ہم کیا کرتے ہیں۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

خضر کے ہم سفر ہونے سے ہم نے یہ مان لیا کہ ایک بزرگ قابلِ عزت ہمارے ساتھ ہیں اور ہم اُن کا احترام کرتے ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم ان کی پیروی بھی کریں کیونکہ یہ اپنی آزادروی کے منافی ہے۔

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبِؔ آشفتہ سر ملے

یعنی خیال رکھنا اور ہمیں بتانا یا اُٹھا لانا۔

(۱۵۸)

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
ہم نے اپنے جی میں ٹھانی اور ہے

جیتے رہے تو انشاء اللہ کچھ کر دکھائیں گے۔ یہ نظم نثر سے زیادہ مقبول ہے۔

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

سوزِ غم ہائے نہانی کے مقابلہ میں آتشِ دوزخ کی کوئی ہستی نہیں۔

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

یوں تو وہ بارہا ہم سے ناراض رہ چکے ہیں لیکن کبھی ایسے خفا نہیں ہوئے تھے جیسے اب کے بار ہیں۔

دیکے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

کوئی ایسی بات بھی انھوں نے کہلا بھیجی ہے جسے کہتے ہوئے نامہ بر جھجکتا اور میرا منہ تکتا ہے۔

قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے

اثرِ نجوم اثرِ سماوی۔ اہلِ نجوم کا یہ یقین ہے کہ دنیا کے کام گردشِ سیارگان کے تابع ہیں۔ ان کے قتل پر منجم کو حیرت ہے کہ مارا کیونکر گیا ستارے تو اس کے سب اچھے ہیں یہ اُس کا جواب دیتے ہیں کہ عمروں کو اکثر ستارے منقطع کرتے ہیں اور ان کے علاوہ عمر کو منقطع کرنے والی وہ بلائے آسمانی بھی ہے یعنی میرا قاتل۔ ع

نامِ تیغِ قضا مبرم لقب ہے قاتل کی آستیں کا

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

ایک مرگِ ناگہانی کے علاوہ ہم پر سب ہی بلائیں آچکیں کوئی باقی نہیں رہی۔ یا یہ کہ یہ اپنے دل کو تسلی دے رہے ہیں کہ بلاؤں سے ڈرتا کیوں ہے وہ تو سب ہو چکیں اب صرف ایک چھوٹی سی بات یعنی مرگِ ناگہانی ہے اس کا کیا ڈر۔

(۱۵۹)

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

نہ کوئی امید بر آتی ہے اور نہ کسی امید کے بر آنے کی کوئی کوئی صورت نظر آتی ہے۔

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

شاعر کے خیال کے مطابق سکون موت میں ہے یا خواب میں موت کا سکون دائمی ہے اور نیند کا سکون عارضی۔ کہتے ہیں کہ موت جو وجہ سکونِ ابدی ہے وہ تو اس لئے نہیں آتی کہ اس کا ایک دن معین ہو چکا ہے جس میں ایک ساعت کی تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی لیکن نیند جو سکونِ عارضی ہے اُسے تو روز شام کو آنا چاہیے یہ کیا غضب ہے کہ رات بھر نہیں آتی۔ یا یہ کہ موت کے ڈر سے انھیں نیند نہیں آتی اس پر کہتے ہیں کہ آخر یہ کیوں اُس کا تو دن معین ہے اور وہ تو ضرور آئے گی پھر جس بلا سے مفر نہ ہو اس سے ڈرنا کیا اور کیوں فکر میں رہ کر راتوں کی نیند گنوانا۔

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

غیر پر تو ہم کبھی ہنستے ہی نہیں البتہ آگے اپنے دل کی حالت پر ہنسی آتی تھی لیکن اب وہ عالمِ تحیر ہے کہ کسی بات پر ہنسی آتی ہی نہیں۔ مدارج تصوف میں ضحک کے بعد عالمِ تحیر طاری ہوتا ہے اور اس میں جو ضحک ہوتا ہے وہ حالِ دل پر ہوتا ہے۔ یا یہ کہ ہم پہلے ایسے ہنسوڑے تھے کہ اور تو اور خود اپنے اوپر بھی ہنستے تھے لیکن اب مصیبتوں کی بدولت یہ حالت ہو گئی ہے کہ کسی بات پر ہنسی آتی ہی نہیں۔

(ناطق) لوگوں کو یہ شکوہ ہے کہ ہنستا نہیں ناطق
ہم کو یہ تعجب کہ وہ گریاں نہیں ہوتا

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

اگر اِدھر کا اشارہ ثواب کی طرف مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ میری طبیعت اس سودے پر راضی نہیں۔

(غالبؔ) طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

اور اگر طاعت و زہد کی طرف ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ توفیق یاری نہیں دیتی۔

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کہنا تو ہمیں بھی آتا ہے اور خوب آتا ہے لیکن اب کیا کہیں کچھ ایسی بات ہے جو کہنے کی بات نہیں۔ یہ طرزِ کلام طنزاً ہے۔ "بات کر نہیں آتی" اب بالکل متروک ہے۔ ایسے مقام پر "بات کرنا نہیں آتا" یا "بات کرنی نہیں آتی" بولیں گے۔

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

یعنی انھیں فکر ہو جاتی ہے اور لوگوں سے پوچھتے ہیں کیا ہوا کیوں نہیں چیختا۔

(ناطق) کیا ہوا دوڑ کے ناطق کی خبر لو تو ذرا
جیتے جی بند ہوئی ہجر میں کیونکر فریاد

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

چارہ گر کہتا ہے کہ ہمیں تو کہیں تیرا داغِ دل نظر نہیں آتا علاج کس چیز کا کریں یہ اس کا جواب دیتے ہیں کہ اگر تو اندھا ہو گیا ہے اور دیکھ نہیں سکتا تو کیا جلتے ہوئے گوشت کی بو بھی تیری ناک میں نہیں آتی ارے بھائی دیکھ دل ہمہ تن داغ ہے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ہمارا مقام محو فی الذات یا فنا فی الذات کا ہے جہاں پہونچ کر اہلِ تصوف کو اپنی بھی خبر نہیں رہتی۔

(ناطق) ڈھونڈھتا پھرتا ہوں خود کو اُن سے از خود رفتگی
بھول آئی ہے کہیں میری بد اوسانی مجھے

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

"موت آتی ہے" یعنی آرزوئے موت میں مرے جاتے ہیں "پر نہیں آتی" یعنی مر نہیں چکتے۔ یا یہ کہ اہل اللہ یا شہید مرتے تو ہیں موت کے لئے لیکن موت آتی ہے تو ان کی موت موت نہیں ہوتی بلکہ مر کر زندۂ جاوید ہو جاتے ہیں۔

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

اپنے سابقہ کرتوتوں کو خیال کرتے ہوئے تمہیں خدا کے گھر کو منہ بناتے ہوئے شرم آنا چاہیے۔ یا یہ کہ تمہیں تو بتوں کی یاد ہے اسے لے کر کس منہ سے کعبے کو جاؤ گے کیا تمہیں شرم نہیں آتی۔

(عراقی) در کعبہ چوں زدم من زدروں ندا بر آمد
تو بروں در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

(۱۶۰)

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

نادان بے تکلف کسی حماقت آمیز یا نقصان دہ امر کے کر بیٹھنے پر کہا کرتے ہیں یہ آپ کیا کر بیٹھے کب تک اس پھندے میں رہیں گے آخر گلو خلاصی کی کوئی تدبیر تو نکالئے۔ اس معنی میں غالب کا یہ شعر اس قدر عام ہو گیا ہے کہ لوگ ایسے مواقع پر کچھ اور کہنے کی جگہ اسی کو پڑھ دیتے ہیں۔ یا یہ کہ اے دل آخر دردِ عشق کی بھی کوئی دوا ہے نادان تجھے کیا ہو گیا جو فکرِ مداوا میں پڑا ہے۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

تعجب ظاہر کرتے ہیں کہ حالت میں تناقض کیوں ہے ہم مشتاق تھے تو وہ بھی مشتاق ہوتے یا وہ بیزار تھے تو ہم بھی بیزار ہوتے یا یہ کہ ہمارے اشتیاق کا نتیجہ بیزاری کیوں ہوئی۔ یا شکوہ کرتے ہیں کہ یا اللہ یہ تو نے کیسا تانا لگایا یا یہ کہ دل سے دل کو راہ کیوں نہ ہوئی۔

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

گالیاں دے کر یا اور کچھ کہہ کر وہ کہتے ہیں تم جواب کیوں نہیں دیتے یا سرِ بزم یہ چپ ہیں اور معشوق کہتا ہے سب بولتے ہیں تم کیوں نہیں بولتے یا کہتا ہے کہ یہ بیچارے کیا بولیں ان کے منہ میں زبان ہی نہیں اس کا جواب دیتے ہیں میرے بھی منہ میں زبان ہے لیکن یوں فضول کیا بک بک کروں کاش تم یہ پوچھو کہ کیا مدعا ہے تو پھر بتاؤں کہ مجھے کیسا بولنا آتا ہے۔ اس مضمون کے مصنف نے کئی شعر لکھے ہیں چنانچہ ایک تو اس سے پہلی غزل ہی میں موجود ہے۔

(ذوق) بیٹھے بھرے ہوئے ہیں خُمِ مے کی طرح ہم
پر کیا کریں کہ مہر ہے منہ پر لگی ہوئی

(ناطق) آنکھیں نکالتے ہو اگر مدعا کہوں
پھر تم کہو کہو جواب میں کیا کہوں

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اے خدا جب تیرے بغیر یا تیرے سوا کوئی موجود نہیں تو یہ ہنگامۂ ہستی کیا ہے۔

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

یعنی جب تجھی سے دل لگانا ہے تو یہ حسین کیسے ہیں اور ان کے ناز و ادائیں کیوں دلکشی ہے۔

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

زلفِ عنبریں کی شکن دل کو کیوں گرفتار کرتی اور چشم سرمہ سا کی ادا میں کہاں کی دلربائی ہے۔ اس شعر کے پہلے مصرع میں ردیف کا آخر ٹکڑا آ گیا ہے جسے اب عیبِ تغزل سمجھا جاتا ہے۔

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے

یعنی یہ سارے سامانِ دلفریبی ہمارے خیال کو پریشان کرنے کے لئے کہاں سے آئے ہیں اور کیا ہیں۔ اب ان چاروں شعروں کا مطلب ملاحظہ فرمائیں۔ وحدت الوجود والوں کے لئے غیر ذات کی ہستی کو ماننا شرکت فی الذات ہے صوفی کو چاہئے کہ تمام اشیاء سے قطع نظر کر کے صرف ایک ذات میں محو ہو جائے اور ہر جگہ صرف اسی کو موجود سمجھے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب تو ہی تو ہے تو پھر یہ ہنگامۂ دلکش پریشان کرنے اور للچانے کے لئے کیوں ہے جو ہمارے خیال کو متفرق دلفریبیوں کی طرف بھٹکا کر مشرک بناتا ہے۔ یا یہ کہ اگر تو چاہتا ہے کہ ہم تجھ ہی کو موجود مانیں اور ایک تجھ ہی سے دل لگائیں تو پھر ان دلربا اور نظر فریب اشیاء کو پیدا ہی کیوں کیا آخر یہ سب بھی تو تیری ہی بنائی ہوئی چیزیں ہیں اگر ہم ان سے دل لگائیں تو ہرج کیا ہے۔

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہماری سادہ لوحی دیکھئے کہ ایسے شخص سے وفا کی امید لگائے بیٹھے ہیں جو یہ بھی نہیں جانتا کہ وفا کیا چیز ہے۔ یا یہ کہ ہم کسی بات کو ناممکن نہیں سمجھتے اس لئے ان لوگوں سے بھی امیدِ وفا رکھتے ہیں جو ناآشنائے وفا ہیں۔

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

یہ بہ حال تباہ پہونچے ہیں وہ کہتے ہیں کیوں فقیر کا روپ بھر کے آئے ہو اس پر یہ جواب کہتے ہیں "ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا"۔

عرضِ مطلب کا یہاں کون سے ڈھب ہے رواج
(ناطق) ترے کوچہ کے فقیروں کی صدا کون سی ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

دعاگوئی اور جاں نثاری اہلِ نیاز کا شیوہ ہے یہ کہتے ہیں کہ دعا اور اس کے اثر کا تو میں قائل نہیں ہاں جان ضرور تم پر نثار کرتا ہوں۔

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

غالب بے دام و بے درم کے ملا جاتا ہے وہ کہتے ہیں یہ بھی کوئی لینے کی چیز ہے یہ اس کا جواب دیتے ہیں کہ ان داموں کیا مہنگا ہے۔ یہ شعر زبان زد عام ہے۔

(۱۶۱)

کہتے تو ہو تم سب کہ "بُت غالیہ مو آئے"
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ "وہ آئے"

میری تسکین کے لئے احباب کی یہ دعائیں کافی نہیں کہ بُت غالیہ مو آئے یہاں تو تسکین

جب ہو گی کہ اچانک وہ آ نکلے اور یک لخت نگہ پڑتے ہی کوئی کہہ اُٹھے کہ وہ آئے۔ اس زمین میں اگلے قوافیہ جو مصنف نے لکھے ہیں وہ "گو" "کو" تخفیف واؤ کے ساتھ ہیں مگر مطلع کے دونوں قوافیہ میں پہلا تو "ہُو" ہے جو بہ تثقیل ہے اور اب ایسے قوافیہ میں اس کا آنا جائز نہیں۔ دوسرا قافیہ "وہ" "وو" سے لکھا ہے جو لفظ "وہ" کا طرزِ کتابت نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اس بات کے قائل تھے کہ جیسا بولو ویسا لکھو اور چونکہ لفظ "وہ" کے بکثرت استعمال میں "ہ" کی آواز بہت کم نکلتی ہے اس لئے مصنف نے اس لفظ کو "وو" کے ساتھ لکھا اور یہی طرزِ کتابت درست سمجھا۔

ہوں کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

بیشک اے جذبِ محبت میں کشمکشِ نزع میں ہوں اس لئے کچھ عرض کرنے کو زبان نہیں کھل سکتی اور دو بول کی حسرت نہیں نکل سکتی اس پر بھی اگر تو اتنا کر دے کہ وہ مجھے پوچھنے کو آجائے تو کچھ اطمینان کے ساتھ مر سکوں گا۔ تقریباً اسی مضمون کے مصنف نے دو تین شعر اور لکھے ہیں جن میں کا ایک یہ ہے۔

(غالب) گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

گو وہ آئے لیکن یہ آنا کچھ میری سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ صاعقہ و شعلہ و سیماب کی طرح اِدھر آئے اُدھر جا رہے ہیں ہمیں یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ کدھر آئے کدھر چلے اسی مضمون کے مصنف نے ایک دو شعر اور لکھے ہیں۔

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے اگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

حدیث میں آتا ہے کہ بدبودار چیزیں کھا کر مسجد میں نہ آؤ کیونکہ اس سے اللہ کے فرشتوں

کو تکلیف ہوتی ہے۔ کہتے ہیں ہمارے اعمال تو ایسے ہیں نہیں کہ تشفی بخش جواب دے سکیں اب کسی طرح نکیرین کو ٹالنا ہے جو ظاہر ہے کہ یوں تو گھبرا کر بھاگ نہیں سکتے اس لئے پی پی کر مریں کہ بادۂ دوشینہ زندگی صبح گور میں کام آئے اور نکیرین اس کی بو سے گھبرا کر بھاگ جائیں۔ یا یہ کہ نکیرین پر اُس وقت تک رعب طاری نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس کی بو نہ پا جائیں کہ مردہ تا دمِ زیست مستِ مے ذات رہا ہے۔

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس رنگ میں جو آئے

اُسے یعنی معشوق کو جو ذات ہے۔ مطلب یہ کہ جلاد کو بھی ہم اچھی طرح سمجھے ہوئے ہیں کہ وہی ہے اور واعظ بھی وہی پھر اُس سے ڈرنے اور اس سے جھگڑنے کا کیا کام ڈرنا اور لڑنا کیسا جس رنگ میں جو آئے قابلِ عزت و تمنا ہے۔ یا یہ کہ ہم ہر فن مولا ہیں ہر رنگ کی ہولی کھیل چکے ہیں سب کو سمجھتے ہیں اور ہر ایک کو نباہ لیتے یا راستے لگا دیتے ہیں۔

ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

اس شعر میں لفظ ہاں یہ بتاتا ہے کہ اہلِ طلب کو صلاح دے رہے ہیں یعنی طعنۂ نایافت لوگوں سے سننا بہتر نہیں اس لئے جب وہ ملتا نظر نہ آئے تو خود رفتہ ہو جانا چاہیئے۔ یا یہ کہ جب ہم نے دیکھا کہ اُس تک رسائی نہیں ہوتی تو خود ہی کو کھو دیا کیونکہ ہم یہ سُننے کے لئے آمادہ نہیں کہ کوئی کہے اُسے ڈھونڈ کر پا نہ لیا۔

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اُس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

ہم آوارہ گرد یا جہاں نورد کہیں آرام سے بیٹھنے کے عادی نہیں پھرتے پھرتے درِ یار پر پہنچے اور جب وہاں دیکھا کہ ابھی باریابی کا موقع نہیں تو اتنی دیر کون آرام سے بیٹھتا اور انتظار دیکھتا کہ اندر سے اجازت آئے اس لئے وقت ٹالنے کے لئے

کعبہ ہی کا چکر لگا آئے یا اس در سے مراد در پیرِ کامل۔ مطلب یہ کہ خدا کی راہ میں آرام لینا ہمارا شیوہ نہیں اس لئے جب دیکھا کہ ابھی ہمیں پیرِ کامل قابلِ التفات نہیں سمجھتا تو خالی بیٹھنا مناسب نہ سمجھ کر سفرِ حج کر ڈالا۔

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اُس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

معشوق یہ سمجھتا تھا کہ نالۂ عاشق بے اثر نہیں ہوتا اس لئے دل آزاری سے ڈرتا تھا ہم نفسوں سے جو وہاں اس بارے میں گفتگو ہوئی تو انھوں نے تقریر کرکے ثابت کر دیا کہ اس میں کچھ دم نہیں اس پر ان لوگوں سے تو وہ خوش ہو گیا اور یہ اس سے اچھے رہے یعنی بھلے بن کر آ گئے کہ ایک بہت بڑا ڈر نکال دیا لیکن ہم ڈوب گئے اور ہمیں ڈبو آئے یعنی تباہ کر آئے کہ اب وہ نڈر ہو کر ہمیں رُلائیگا۔

اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

تیری تقدیر کو تیری تقدیر پر۔ ہم بھی وہاں گئے تھے اس انجمن ناز کی شان و شوکت دیکھ کر بڑا افسوس ہوا کہ یہ سب کچھ ہو اور یہاں غالب ہی نہ ہو۔

(۱۶۲)

پھر کچھ اِک دل کو بیقراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

پھر از سرِ نو جنونِ عشق بھڑکا دل دردمند بیقرار ہے اور سینہ زخم کھانے کو تیار ہے۔

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

ناخنِ غم کی جگر کاوی آمدِ بہارِ عشق کی علامت ہے کہ اس سے وہ زخم پڑیں گے کہ جگر لالہ زار بن جائے گا۔

قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز
پھر وہی پردۂ عماری ہے

راحلۂ محبوب کی عماری پر قبلۂ مقصدِ نگاہ نیاز ہے یعنی پھر تاک جھانک لگی ہوئی ہے۔ عماری عام اصطلاح میں ہاتھی کے اوپر جو ہودا باندھا جاتا اسے کہتے ہیں جو مخفف ہے ہودج کا۔ یہ لفظ ”عماری“ بگڑ کر عوام کی اصطلاح میں امباری ہو گیا ہے۔

چشم دلّالِ جنسِ رسوائی
دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے

چشم و دل رسوائی و خواری کے دلال و خریدار بن کر معاملہ کر رہے ہیں۔

وہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہی صد گونہ اشک باری ہے

وہی طرح طرح سے رونا اور چلانا ہے یا پہلے شعر کے ساتھ مل کر یوں ہوگا کہ آنکھ رو رو کر رسوائی کا سودا کر رہی ہے اور دل نالے کر کر کے بدنامی کو خرید رہا ہے۔

دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر
محشرستانِ بیقراری ہے

خرامِ یار کی حسرت نے پھر دل میں قیامت کی بیقراری پیدا کر رکھی ہے خرامِ ناز کو فتنۂ محشر لکھنا شاعروں کا معمول ہے۔

جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے
روزِ بازارِ جاں سپاری ہے

معشوق کا جلوہ پھر متاعِ ناز کی دکان لگائے بیٹھا ہے یعنی پیش کر رہا ہے اس لئے

خریداروں کا ہجوم ہے اور روزجا نیازوں کا بازار لگا رہتا ہے۔ "روزبازار"
ہر روزہ بازار کے لئے قدیم کا لفظ ہے اور بڑا اچھا لفظ ہے لیکن شامتِ زبان
ملاحظہ فرمایئے کہ اب اس کی جگہ اردو میں انگریزی لفظ "ڈیلی مارکیٹ" نے
لے لی ہے۔

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

پھر اسی بے وفا پر جان دے رہے ہیں اور وہی ہماری جان بنا ہوا ہے یا ہماری
زندگی کا سہارا ہے۔ یا یہ کہ پھر وہی طرزِ زندگی اختیار کر لیا کہ اس بے وفا پر
مرتے ہیں۔

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز
گرم بازارِ فوجداری ہے

دوسرا مصرعہ بلا اضافت بھی ہو سکتا ہے اور بالاضافت بھی فوجداری لفظ فارسی
ہے۔ مطلب یہ کہ ادائے ناز جو خود فوجداری پیشہ ہے یعنی ماربیٹ اس کا شیوہ
ہے جب اس کی عدالت پھر کھلی تو وہی چلن عام ہو گیا یعنی اندھیر مچا ہوا ہے اور
اندھیر نگری ہو گئی۔ میرے الفاظ میں یوں کہیے کہ کانگریس کا راج آ گیا۔

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

اندھیر اور سررشتہ یا سرشتہ زلف کے مناسبات ہیں کہتے ہیں کیونکہ پھر زلف
عدالتِ ناز کی سرشتہ دار ہو گئی ہے اس لئے جہان میں اندھیر ہو رہا ہے۔

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے

سوال دینا نالش کرنا۔ یہ بڑا فصیح محاورہ تھا لیکن اب محض عوام میں رہ گیا ہے

فریاد و آہ و زاری عدالت فوجداری میں نالشی کا کام ہے۔ دل کا سوال دینا
اور فریاد و آہ و زاری کرنا مقدمہ کے مناسبات کو چھوڑ کر بھی اچھا طرزِ بیان ہے۔

پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب
اشک باری کا حکم جاری ہے

چونکہ آہ و زاری ثبوتِ عاشقی ہے اس لئے آنسو گواہانِ عشق ہوئے۔ پہلے
اشعار کے ساتھ مل کر مطلب یہ ہے کہ پارۂ جگر کے سوال دینے پر عدالتِ ناز
نے گواہانِ عشق طلب کئے ہیں اس لئے اس کے اندھیری سرشتہ دار یعنی زلف
نے اشک باری کا حکم جاری کر دیا ہے۔

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اس کی روبکاری ہے

روبکاری پیشی۔ وہ مقدمہ جس میں دل مدعی اور مژگاں مدعا علیہ تھے اور جو
التوا میں پڑا ہوا تھا آج پھر اس کی سنائی ہو رہی ہے مصنف نے اس
غزل کے سارے اشعار عجیب مستانہ انداز میں لکھے ہیں جن میں بہ ظاہر کچھ
نہیں معلوم ہوتا مگر ہے سب کچھ۔

بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

اے غالبؔ یہ تمہاری بے خودی بے سبب معلوم نہیں ہوتی کیونکہ تم بڑے
پہونچے ہوئے آدمی ہو ضرور کوئی نہ کوئی ایسی بات ہے جسے چھپانے کے لئے
تم نے یہ ڈھونگ لیا ہے۔ یہ نظم نثر سے زیادہ زبان زد عام ہے۔

181

(۱۶۳)

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی

جنوں سے یہاں مراد ہے جنونِ عشق جو وجہ اضطراب ہوتا ہے اور تسکین جس کے منافی ہے۔ شادمانی سامانِ تسکین ہے جو حصولِ لذتِ زندگانی سے حاصل ہوتی ہے یہ لذت زندگانی منافی ہے اضطرابِ عشق کے جس سے تہمت تسکین آتی ہے۔ کہتے ہیں میری شادمانی سے اے جنون تجھ پر تہمتِ تسکین نہیں آسکتی کیونکہ لذتِ زندگانی خراشِ دل پر نمک پاشی کرتی ہے اور عیشِ دنیا بہ عالمِ ہجر عاشق کے لئے وجہ کلفت ہوتا ہے۔ یا یہ کہ اہلِ درد کے لئے دنیاوی خوشی بجائے سامانِ راحت ہونے کے الم افزا ہوتی ہے چنانچہ یہ ہمیشہ کا مشاہدہ ہے کہ شادی کے مواقع پر گزرے ہوئے عزیزوں کی یاد کرکے رویا کرتے ہیں۔ میری نظم ہلالِ عید کا آخر شعر یہ ہے۔

(ناطق) عید کے دن دیکھ کر سارے جہاں کو شاد شاد
اور دن سے بھی سوا ہوتے ہیں غمگیں نامراد

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی

آزادی کی کوشش کا کشاکش ہائے ہستی کے مقابلہ میں کچھ بس نہیں چلتا دیکھو موجِ آبِ رواں گو بظاہر آزادی سے چلتی ہوئی نظر آتی ہے لیکن یہ بھی پابندِ روانی ہے جس کی موجیں زنجیر کا کام کرکے اُسے پا بجولاں لے جا رہی ہیں۔

(ناطق) نہ ٹوٹا واسطہ پابندی رفتارِ ہستی سے
توڑائیں وحشتِ آبِ رواں نے لاکھ زنجیریں

پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گل فشانی کی

میرے جنون سے لڑکوں کو یہ دلچسپی تھی یا ہے کہ بعدِ مردن بھی میری قبر ان کی زیارت گاہ بنی ہوئی ہے اور پتھر جو کثرتِ بارش سے آپس میں ٹکراتے اور ان سے شرارے نکلتے ہیں جنھیں اردو میں پھول کہتے ہیں ان سے میری تربت پر لڑکوں نے گل فشانی کی ہے۔

(ریاض) کہتے ہیں جس کو پھول وہ نکلے شرارِ سنگ
شیشے مرے نصیب سے پتھر کے ہو گئے

(۱۶۴)

نکوہش ہے سزا فریادیِ بے دادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی

نکوہش ملامت۔ محشر مظلوموں کے لئے دادرسی کا دن ہے لیکن چونکہ معشوق کے مظالم کی فریاد کرنے والے کی سزا ملامت ہے اس لئے کہیں ایسا نہ ہو کہ صبحِ محشر بھی اس کے لئے خندۂ دنداں نما بن جائے یعنی ہنسی اُڑے اور ندامت اُٹھائے ایک شعر ایسے ہی مضمون کا اور لکھ آئے ہیں۔

(غالب) ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
اگر بو دے بجائے دانہ دہقاں نوکِ نشتر کی

ریشگی بخشنا اُگنا ریشہ نکلنا۔ شعر میں اس قصے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایک مرتبہ مجنوں کی فصد لی گئی تو اس کے خون کی روانی سے لفظ لیلیٰ بنتا تھا۔ کہتے ہیں جس طرح کہ فصدِ مجنوں سے لیلیٰ کی شان نکلتی تھی اسی طرح اگر دہقاں دشتِ مجنوں میں دانہ کی جگہ نوکِ نشتر بو دے جس سے درخت نہیں نکل سکتا تو بھی مجنوں کے اثر نام

(182)

سے وہ بیکار نہ جائے بلکہ رگ لیلیٰ کو رشتگی بخشے یعنی اس سے بھی اس کی شان نکلے۔ ایک تکلف ہے۔

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

مجلس گرم ہوئی سوزِ شمع سے جس کی شانِ جلوہ سوزِ پروانہ نے بڑھائی اور جب یہ گرمیِ مجلس دورِ ساغر کی روانی کا سبب ہوئی تو شاید پرِ پروانہ کشتیِ مے کا بادبان تھا۔ شاعر اپنا خیال ظاہر کرتا ہے کہ مجھے بزمِ عالم اور اس میں رنگِ طرب کا سبب صرف وجودِ حسن اور شانِ عشق نظر آرہے ہیں۔

(ناطق) سوزِ الفت ہے ہوادارِ رہِ قلزمِ غم
بادباں پر مری کشتی میں ہے پروانے کا

یہاں غنیؔ کشمیری کا ایک شعر یاد آیا جس کا لکھ دینا لطف سے خالی نہ ہوگا۔

(غنیؔ) میار اے بخت بہرِ غرق بادِ شور دریا را
پرِ ماہی مگردان بادبانِ کشتیِ ما را

کروں بے دادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت
کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

پرفشانی طاقتِ پرفشانی سے ہوتی ہے میرے ذوقِ پرفشانی کا ظلم دیکھیے کہ پروں کو حرکت تک آنے کا انتظار نہ دیکھتے ہوئے بہ عالمِ بیتابی خود طاقتِ پرواز پرواز کر گئی اور میں ناچار حسرتِ پرواز میں رہ گیا۔ یہ انھیں کا حصہ ہے۔

(ناطق) اُڑ گیا ہے چمن مقدّر سے
مجھ سے اُڑتی ہے طاقتِ پرواز

کہاں تک روؤں اسکے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

پتھر کی دیوار سامنے ہوتی تو سر پھوڑ کر مر جاتا اور اس رونے دھونے سے نجات پاتا اب کہاں تک اس خانہ بدوش جہاں گرد معشوق کے خیمے کے پیچھے روتا پھروں۔

(۱۶۵)

بے اعتدالیوں سے سُبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اُتنے ہی کم ہوئے

جیسے جیسے ہماری بے اعتدالیاں بڑھتی گئیں ویسے ویسے لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل ہوتے گئے۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

جال بالکل آشیانے سے لگا ہوا تھا اس لئے ہم اُڑنے کا قصد کرنے کی جو بڑھے تو گرفتار ہو گئے۔ سخت قریب بالکل نزدیک۔ یہ ان ہی کا طرزِ بیان ہے۔

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

کسی چیز کا قسم ہونا اُس کے نہ ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یعنی ہماری ہستی نیستی کا ثبوت ہے اور ہمارا وجود ہماری قسم ہے

(ناطق) ثبوت کیا یہی ہستی ہے نیستی کی دلیل
ہزار بار کہوں گا نہیں، ہزار ہوں میں

سختیِ کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

جس طرح کہ الم خود نظر نہیں آتا اسی طرح دردکشانِ عشق بھی رفتہ رفتہ غیر مرئی ہو گئے۔ اب ان کی خبر کیا پوچھتے ہو وہ کہیں نہیں۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

جنوں کی حکایاتِ خونچکاں کا لکھنا ایک چوری کا کام تھا جس کی سزا قطع ید ہے لیکن ہمیں اس کی ایسی لت لگی تھی یا اس کے ہم ایسے دیوانے تھے کہ لکھتے رہے اور ہاتھوں کے قلم ہونے کا خیال نہ کیا یا پرواہ نہیں ہوئی اس شعر کی کیفیات کو کچھ اہلِ ذوق ہی سمجھ سکتے ہیں کہ ایک لفظ بھی اس میں سے اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا لیکن یار لوگوں کے لئے یہی کھیل بھی ہو جاتا ہے۔

اللہ رے تیری تندیِ خو جس کے بیم سے
اجزائے نالہ دل میں مرے رزق ہم ہوئے

معشوق سے اس کی تندخوئی کی شکایت کرتے ہیں جس کے ڈر سے نالہ کے اجزا ان کے دل میں خود ایک دوسرے کو بہ عالمِ بے بسی کھا کر فنا ہو گئے۔ لفظ "بیم" کا استعمال بلا ترکیب فارسی اب درست نہ ہو گا۔

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق
جو پاؤں اُٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے

پاؤں اُٹھانا یا پاؤں اُکھڑ جانا راہ فرار اختیار کرنا۔ جو مقام فتح کیا جاتا ہے وہاں فتح کا جھنڈا گاڑتے ہیں جسے یہاں عَلم لکھا گیا ہے۔ اہل ہوس اسی میں اپنی فتح سمجھتے ہیں کہ جنگِ عشق سے راہِ فرار اختیار کریں گویا ان کے نزدیک میدانِ جنگ سے پاؤں اکھڑ جانا ہی فتح کا جھنڈا بلند ہونا ہے۔ بڑا اچھا شعر ہے۔ اب ایسے مقام پر پاؤں اکھڑ جانا بولتے ہیں لیکن پاؤں اُٹھ جانا بھی مستعمل ہے۔ یہاں مصنف نے اہلِ ہوس کے پاؤں اٹھا کر علم بنا دیا ہے۔

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آکے دم ہوئے

نالوں کی ایک معینہ تعداد عدم میں ہمارے سپرد کر دی گئی تھی وہ کام ابھی ختم نہ کر چکے تھے کہ یہاں آ گئے اب وہی بقیہ نالے سانس کی صورت میں کھینچ رہے ہیں یعنی ہم اہلِ درد کا ہر سانس نالہ کشی کے مرادف ہے۔ "سو وہ یاں" اُس وقت کا طرزِ بیان ہے ورنہ "وہ یہاں" سیدھا بحر میں آ سکتا تھا جو اس سے بہت اچھی زبان ہوتی اور روانی بھی بڑھ جاتی۔

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

ہماری گدائی بھی دل لگی سے خالی نہیں کہ فدائے اہلِ کرم ہیں جہاں لطفِ سوال ہے۔

(۱۶۶)

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی

اگر نقدِ داغِ دل کی جو عاشق کی پونجی ہے شعلۂ عشق پاسبانی نہ کرے اور اسے گرم نہ رکھے تو یہ جنسِ بے بہا اس چور کے ہاتھ لگ جائے جسے افسردگی کہتے ہیں اور جو بہ کمینِ بے زبانی یعنی خاموشی کے ساتھ اس کی تاک لگی ہوئی ہے۔ حاصل یہ کہ اگر داغِ دل کو شعلۂ عشق گرم نہ رکھے تو یہ جنسِ بے بہا افسردگی کے ہاتھوں میں پڑ کر برباد ہو جائے۔

مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی
کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی

اس بے پرواہ سے جوانی میں کیا توقع رکھے کہ ہماری سرگزشت سنے گا جس نے بچپن میں بھی کبھی یہ کہانی نہ سنی حالانکہ ہر بچے کو کہانی سننے کا شوق ہوتا ہے۔

(ناطق) کوئی ہوں ہاں تو کہے قصۂ غم کس سے کہوں
تم کو سننا نہیں آتا ابھی افسانے کا

184

یونہیں دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا
کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

کسی کو بے وجہ تکلیف دینا اچھا نہیں معلوم ہوتا ورنہ میں یہ دعا کرتا کہ یا اللہ میری پُرمصیبت زندگی دشمن کو مل جائے۔

(۱۶۷)

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اِک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

میرے ظلمت کدے میں شبِ غم نے اندھیر کر رکھا ہے اور جہاں جس چیز سے امید سحر پیدا ہوتی ہے وہ شمع کشتہ ہے کہ شمع بوقت سحر گل ہو کر ختم ہو جاتی ہے لیکن اس کی خاموشی نے اور بھی غضب ڈھایا کہ اب ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

مژدۂ وصال میں آنکھ کو کان پر رشک آتا تھا اور نظارۂ جمال سے کانوں کو آنکھوں پر اب مدت سے دونوں میں صلح ہے کیونکہ نہ یہ حاصل ہے مژدہ، اسی مضمون کے مصنف نے اور کئی شعر لکھے ہیں جن میں کا ایک یہ ہے۔

(غالبؔ) باہم گر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و جمال کا ساماں کئے ہوئے

مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق۔ یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے

چونکہ شراب نے حسن خود آرا کو بے حجاب کر دیا ہے اس لئے اے شوق اب تجھے بھی ہوش کو اس کے سپرد کر دینے کی اجازت ہے یعنی اے شوق دل پھر ایسا موقع نہ آئیگا

حواس باختہ ہو کر ہم آغوش ہو جا۔

(ناطقؔ) غصے میں تم کو دیکھ کے لپٹا تو کیا کہوں
میں ڈر گیا خطا مرے اوسان ہو گئے

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

زیور خرید کرتے وقت پہن کر دیکھے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ گوہر فروش کا ستارہ بھی کس قدر اوج پر ہے کہ اسے گردنِ خوباں میں گوہر پہنا کر دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔

دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست
بزمِ خیال مے کدۂ بے خروش ہے

بزم خیال کو ایک میکدۂ بے خروش سے تعبیر کرتے ہیں جہاں حوصلہ یعنی قوتِ خیال ساقی ہے اور چشم تصور مستِ مۓ دیدار خوب شعر ہے۔

(ناطقؔ) ہے مۓ جلوہ اور ساغرِ چشم
ہم بھی آنکھیں بچا کے پیتے ہیں

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار! اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

نے بانسری نائے و نوش رباب اور شراب۔ اے خواہش دنیاوی کی بساط پر نئے آنے والو اگر تمہیں مۓ و نے یعنی عیش و نشاط کا خیال ہے تو ہوش پکڑو۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو! جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

اگر تمہاری نگاہ میں عبرت حاصل کرنے کا مادہ ہے اور کان سچ بات سننے کے روادار ہیں تو ادھر دیکھو اور میری سنو!

185

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

ساقی اور مطرب کی طرف کیا دیکھتے اور سُنتے ہو۔ یہ دونوں اپنی جلوہ گری اور نغمہ آرائی سے ایمان عقل خودداری اور ہوش کے دشمن ہیں۔

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

یا رات کو بزمِ نشاط کا یہ عالم نظر آتا تھا کہ فرش کا ہر گوشہ پھولوں کی کثرت کی بدولت باغبان کا دامن اور پھول بیچنے والے کا ہاتھ معلوم ہوتا تھا۔

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

ساقیِ گل اندام کا شراب دیتے ہوئے چلنے کا لطف اور چنگ کی آواز کا مزا جنتِ نگاہ اور فردوسِ گوش کا مزا دے رہا تھا۔

یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

یا اسی شبِ نشاط کی صبح کا عالم اگر آکر دیکھئے تو اسی بزم میں نہ وہ عالمِ سرور نہ وہ راگ نہ جوش و خروش شب کا یکساں خاتمہ نظر آئے گا۔ محفلِ شب شبِ عشرت کی تھکن پر ختم ہو جاتی ہے۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

چونکہ یہ قطعہ ہے اس لئے سب شعروں کا مطلب جوڑ کر اس شعر کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے اے دنیا کے لوگو گرفتارانِ عیش اگر تمہیں نالۂ دل کش

کی حسرت ہے تو مجھے جو ایک مرقعِ عبرت ہوں دیکھو اور اگر تمہیں اچھی بات پسند آتی ہے تو میری سنو! کہ ساقی اپنے جلوۂ ناز کے ساتھ ایمان اور آگہی کا دشمن ہے اور مطرب اپنے نغمے کے ساتھ تمکین و ہوش کو غارت کرتا ہے شبِ نشاط کا عالم یہ دیکھا ہے کہ گلہائے عیش کی کثرت سے ہر گوشۂ بساط دامانِ باغبان و کفِ گل فروش بنا ہوا تھا۔ خرامِ ساقی و صدائے چنگ سے چشم و گوش کو جنت کا مزا آ رہا تھا یا وہ عالم تھا یا صبح کو دیکھئے تو اسی بزم میں سناٹے کا عالم ہے اب اس صحبتِ گرم کی یادگار داغِ فراق سے بجھی ہوئی ایک شمع باقی ہے لیکن وہ بھی خاموش اس لئے شامِ جوانی کے عیش میں صبحِ پیری کو فراموش نہ کرو شمع کی صورت یا میری حالت دیکھو اور ان سے عبرت کا سبق حاصل کرو۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

چونکہ یہ مضامین القا ہوتے ہیں اس لئے اے غالب میرے قلم کی آواز نوائے فرشتۂ غیبی ہے۔ ہے تو کچھ ایسی ہی بات۔

۱۶۸

آکہ مِری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بے دادِ انتظار نہیں ہے

اب میری جان بیقرار بیدادِ انتظار کی تاب نہیں لاسکتی اس لئے کہیں جلد آ۔

دیتے ہیں جنتِ حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

جنت جو حیاتِ دنیوی کے بدلے دی جاتی ہے وہ ناکافی ہے کیونکہ اس سرور سے خمارِ مصائبِ دہر کی تلافی نہیں ہوتی یعنی دنیا کے مصائب بہت سخت ہیں۔

186

گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو
ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

جانتا ہوں کہ رونے کی بدولت تیری بزم سے نکالا جا رہا ہوں اس پر بھی روتا ہوں کہ اختیار ضبط نہیں اور بے اختیار رونا پڑتا ہے۔

ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر
خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

ہمارے مر جانے کو جو تم رنجشِ خاطر کا سبب سمجھتے ہو یہ عبث ہے کیونکہ گردِ ملال تو عشاق کے خمیر ہی میں داخل نہیں ہے یا یہ کہ ہم تم سے ناراض نہیں رہ سکتے کیونکہ ہماری خاک ہی میں غبارِ ملال نہیں

دل سے اٹھا لطف جلوہ ہائے معانی
غیرِ گل آئینہ بہار نہیں ہے

آئینہ ہے ظاہر ہے۔ یعنی جلوۂ گل کے بغیر اظہار بہار نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں جس طرح کہ جلوۂ گل کے بغیر اظہار بہار نہیں ہوتا اسی طرح بغیر لطفِ جلوۂ حقیقت آئینۂ دل بے نور ہے۔

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے
وائے! اگر عہد استوار نہیں ہے

اس نے میرے قتل کا عہد تو کیا ہے لیکن اگر یہ عہد بھی استوار نہیں ہے تو افسوس کی بات ہے کہ آخر امید بھی جاتی رہی۔

تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے اسد
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

غالب تو نے میکشی کی قسم کھائی ہے تیری اس قسم کا کچھ اعتبار نہیں۔ شرابی کی

قسم کا کیا بھروسہ۔ یہ اب اردو کے بحروں میں نہیں۔

(۱۶۹)

ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

بارِ غم نے میرے سر کو جھکا کر دامن سے لگا دیا ہے اس طرح تارِ نظر تارِ دامن سے ایسے مل گئے ہیں کہ اب امتیاز مشکل ہے

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

(ناطق) درد کی لذت ہے فکرِ چارہ سازی کا سبب
زخم منہ پھاڑے ہوئے بیٹھے ہیں سوزن کے لئے

وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب
چٹکنا غنچۂ گل کا صدائے خندۂ دل ہے

جس باغ میں اے غالب وہ گل ناز جلوہ فرما ہو وہاں کے رنگ مسرت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ غنچۂ گل کے چٹکنے سے صدائے خندۂ دل پیدا ہوتی ہے یعنی باغ سراپا مسرت ہو جاتا ہے۔

(۱۷۰)

پا بہ دامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد
خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے

پا بہ دامن الجھا ہوا رفتار سے بند۔ جب کسی کے کفِ پا میں کانٹا لگ جاتا ہے یا کانٹے لگ جاتے ہیں تو اسے زانو پر رکھ کر کانٹے کو دیکھتا ہے اور حسین بھی

(18)

بوقتِ آرائش آئینہ کو زانو پر رکھ کر دیکھتے تھے اور اب بھی بعض جگہ ایسا رواج ہے۔ خود زانو کو بھی آئینہ باندھتے ہیں۔ جوہرِ آئینہ کی خار سے تشبیہ مصنف کا معمول ہے۔ مطلب یہ کہ میں پافگار بیٹھا ہوا اپنی بے بسی کا نظارہ زانو پر کف پا کو آئینہ کی طرح رکھ کر دیکھ رہا ہوں جس کے کانٹے جوہرِ آئینہ کا لطف دے رہے ہیں۔ نہایت بلیغ شعر ہے۔

دیکھنا حالت مرے دل ہم آغوشی کے وقت
ہے نگاہِ آشنا۔ تیرا سر ہر مو مجھے

تیرا سر ہر مو میرے لئے ایک نگاہ آشنا ہے اس لئے میرے دل کی حالت یا مسرت ہم آغوشی کے وقت قابل دید ہے یعنی اس وقت ایسی خوشی ہے جیسے کسی کو ہزاروں بچھڑے ہوئے دوست ایک ہی وقت میں گلے لگا رہے ہیں۔

ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

اگر تو چار کے سامنے چھیڑ کر بولنے پر مجبور کرے گا تو میں کہہ چلوں گا اور تیری رسوائی ہوگی۔

(۱۷۱)

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے

تیری گفتارِ ناز میں وہ اعجاز بھرا ہے کہ جہاں تو گرمِ تکلم ہو یا تو ایسا عیسیٰ نفس ہے کہ جہاں تیرے منہ سے آوازِ ناز نکلے وہاں کی دیواروں کی تصویروں میں بھی جان پڑ جائے۔

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قدِ دل کش سے جو گلزار میں آوے

معشوق کو سروِ رواں باندھتے ہیں۔ تیرا قد ایسا دلکش ہے کہ اگر تو سیرِ گلزار کو آئے تو سرو و صنوبر دل باختہ ہو کر سائے کی طرح پیچھے پیچھے ہو لیں۔

(داغ) طبع آزاد بھی ہو گر قدِ آزاد کے ساتھ
ایک ہی پاؤں سے گل گشت میں شمشاد رہے

تب نازِ گراں مائگی اشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدۂ خوں بار میں آوے

یوں نازِ گراں مائگی اشک سے کیا فائدہ البتہ اگر ان کے ساتھ لختِ جگر بھی دیدۂ خوں بار میں آئے تو ہاں کچھ بات ہے۔ پانی کے قطرے ٹپکا دینا کسے نہیں آتا اور ان میں کیا وزن۔

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر!
کچھ تجھ کو مزہ بھی مرے آزار میں آوے

لذتِ آزار کی شکایت آزار کی داد ہوگی اور چونکہ تو ظالم ہے اس لئے اس میں تجھے لطف بھی آئے گا۔

اس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

طوطی آئینہ کو دیکھ کر چہکتی ہے اور شعرا طوطی اور آئینہ کو ملا کر اکثر باندھتے ہیں اس کے علاوہ بلحاظِ سبزی آئینۂ فولاد طوطی سے مشابہ ہے۔ کہتے ہیں جس طرح مالک کے اشارہ پر طوطا بولتا ہے اسی طرح وہ چشمِ فسوں گر بولنے کا اشارہ کرے تو آئینہ چہکنے لگے۔

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یا رب
اک آبلہ پا وادیِ پُرخار میں آوے

ایک سے مراد ہے خود ان کی اپنی ذات یعنی کاش اس وقت مجھے رخصت صحرا نوردی مل جائے۔

مرجاؤں نہ کیوں رشک سے؟ جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنّار میں آوے

زنّار کا دھاگہ جیسی بے حقیقت چیز اُس تنِ نازک کو اپنے آغوش میں لے اور میں محروم رہوں یہ رشک سے مرجانے کی بات ہے۔

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

اگر اس غارت گرِ ناموس یعنی ہوسِ زر کا وجود دنیا میں نہ ہو تو شاہدِ گل باغ سے بازار میں نہ آئے یعنی نازنینانِ چمن کو شاہدانِ گل اندام کو عشرت گاہِ ناموس کی ہوسِ زر ہے جو انھیں ایسا کام کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یا یہ کہ کمبخت ہوسِ زر نازنینانِ گل اندام کو ان کی عشرت گاہِ ناموس سے نکال کر شاہدانِ بازاری بناتی ہے۔

تب چاکِ گریباں کا مزا ہے دلِ نالاں
جب اِک نفَس اُلجھا ہوا ہر تار میں آوے

گریبان کو تار تار کرنے کا تو مزا جب ہے کہ ہر تار کے ساتھ سازِ زندگی کا بھی ایک تار ٹوٹتا جائے۔ لفظ "تب" اب متروک ہے اس کی جگہ "اُس وقت" بولا جاتا ہے۔

آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے! اگر معرضِ اظہار میں آوے

جس رازِ نہاں نے میرے سینہ کو آگ کی بھٹی بنا رکھا ہے اگر اس کا اظہار ہو تو غضب ہی ہو جائے یعنی دنیا سلگ اُٹھے۔ اس مضمون کے مصنف نے کئی شعر لکھے ہیں۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

میرے اشعار کثیر المعانی ہوتے ہیں اُوتیتُ جوامعِ الکَلِم۔

(۱۷۲)

حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

کیونکہ ماہِ کامل سے خورشید بہرحال اچھا ہے۔

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

دل جنسِ دلپذیر تو ہے جسے لینے کی فکر ہے لیکن وہ یہ چاہتے ہیں کہ بے داموں ہاتھ آجائے اور اس کی قیمت جو بوسہ ہے دینا نہ پڑے "ہے ہر لحظہ" میں تنافر ہے کیونکہ 'یے' تقطیع میں نہیں آتی۔ اس سے آج کل اجتناب کیا جاتا ہے۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے تو مرا جامِ سفال اچھا ہے

وہ چیز اچھی جس کے حصول میں تکلیف نہ اٹھانا پڑے اور استعمال میں تکلیف کی ضرورت نہ ہو۔

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

بے طلب دینا سے ہوتا ہے اور بے طلب پانے میں ذلتِ سوال نہیں اس لئے گدائے بے نوا خود اپنی ذات اور اہلِ کرم دونوں کے لئے اچھا ہے۔

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

سقیم الحال کی اطلاع پاکر جب وہ دیکھنے کو آتے ہیں تو اُنھیں دیکھ کر میرے منہ پر رونق آجاتی ہے چہرہ پر رونق دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ اس کا حال اچھا ہے بیمار نہیں۔ مصنف کا یہ شعر بے حد مقبول ہے مجھ سے منشی ممتاز علی صاحب آہ امیٹھوی نے جو امیر مینائی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور رجو دفتر امیر اللغات کے پہلے سکریٹری بھی تھے بیان کیا کہ اس زمین میں جب امیر مینائی نے غزل لکھی ہے تو آپ بتاتے جاتے تھے اور میں لکھتا جاتا تھا جب حال کے قافیہ پر آئے تو کئی شعر لکھائے لکھاتے تھے اور پھر اسی پر فکر کرتے تھے میں نے کہا کہ حضرت اب تو اس میں کئی شعر نکل آئے اور خوب خوب ہوگئے مزید فکر کی ضرورت نہیں اس پر انھوں نے زانو پر ہاتھ مارا اور یہی شعر پڑھا۔ دیگر اساتذہ نے بھی اس قافیہ پر بہت زور لگایا ہے۔ حضرت داغ مرحوم کا شعر بھی سہل ممتنع اور بیت الغزل ہے۔

(داغ) آپ گھبرائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں
آپ پچھتائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے
وہ عیادت کے لئے آئے ہیں لو اور سنو
آج ہی خوبیِ تقدیر سے حال اچھا ہے

"ان کے دیکھے سے" جو یہاں مصنف نے لکھا ہے اور جس سے مطلب ان کو دیکھنے سے ہے اب اس طرح نہیں بولا جاتا یہ لفظ اب خود اُن کے دیکھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

اچھا تو جب ہو جب اس سال عاشقوں کو بھی معشوقوں سے کچھ فیض پہنچے۔

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

تیشہ زنی کا پیشہ اگرچہ کوئی باعزت ہنر نہیں لیکن کمال پھر کمال ہے کہ تیشہ زنی کے کمال کی بدولت فرہاد کو شیریں سے گفتگو کرنے کا موقع مل گیا یعنی شیریں نے فرہاد کو طلب کرکے جوئے شیر کھودنے کی فرمائش کی اس سے معلوم ہوا کہ کمال کسی قسم کا بھی ہو انسان کے کام آتا ہے۔ مصرعہ ثانی میں "کا کہ کسی" میں تنافر ہے مگر قبیح نہیں اجتناب اس سے بھی بہتر ہے۔

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

قطرہ دریا میں مل کر فنا ہوتا ہے لیکن مآلِ فنا یہ ہے کہ وہ خود دریا ہو جاتا ہے اس لئے یہ فنا بھی اچھی۔ پہلے لکھ آئے ہیں۔

(غالب) دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

خضرِ سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ابوظفر بہادر شاہ کے چھوٹے لڑکے کو دعا دیتے ہیں جنھیں تازہ نہال بچہ ہونے کی حیثیت سے لکھا اور خضر کے لئے سرسبز لائے۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

جنت کی حقیقت تو یہ ہے کہ اسے کسی آنکھ نے دیکھا نہیں اور اس کے حالات کو کسی کان نے سنا نہیں اور اس کی حقیقت کا کسی کے دل پر خیال بھی نہیں گزرا۔ کہ وہ مقامِ رضامندی ذات ہے اور اس کی حقیقت دنیا والوں کے لئے اسی طرح ناقابلِ بیان و خیال ہے جس طرح رنگ کا امتیاز مادرزاد اندھے کے لئے۔ یہ جنت کی حقیقت ہے جو ہم کو معلوم ہے لیکن مرئیات سے جو اس کا بیان کیا جاتا

ہے اور دنیا کی بہترین اور دلپذیر اشیاء کے ساتھ جو اس کا ذکر ہوتا ہے یہ خیال اطمینانِ قلب کے لئے اچھا ہے'

(غالب) سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

اس سے یہ مطلب لینا کہ جنت حقیقتاً کچھ نہیں کم فہمی کی دلیل ہے تعجب ہے کہ مولانا حسرت موہانی نے اس شعر پر معاذ اللہ لکھدیا۔

(۱۷۳)

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو وہ بھی نہ سہی

اگر یہاں لفظ امتحان سے مصنف کی مراد خود معشوق کی قابلیت جورہے تو مطلب یہ ہوگا کہ اب میری نعش باقی ہے اس پر مشقِ ستم کرکے ارمان نکال لے لیکن اگر امتحانِ غالب مراد ہے تو یہ طنزاً ہوگا کیونکہ جاندہی سے بڑھ کر اور کیا امتحان ہوسکتا ہے۔ اہلِ ذوق حضرات مصنف کے اس شعر کو بہت پسند کرتے ہیں کہ اس کا بیان خوبیِ معنی کے ساتھ سہل ممتنع بھی ہے۔

خار خارِ الم حسرتِ دیدار تو ہے
شوق گل چینِ گلستانِ تسلی نہ سہی

اگر یہاں شوق دیدار کو باغ حسن کی گل چینی حاصل نہیں یعنی اُس گلِ رخسار کا نظارہ میسر نہیں جو وجہ تسلی ہوتا تو کیا یہی کم ہے کہ حسرتِ دیدار کے کانٹوں میں الجھا ہوا ہے اور اس کا درد رکھتا ہے جو وجہ دلبستگی ہے۔ اس مضمون کو مصنف نے بار بار لکھا ہے مگر ہر جگہ اچھا پہلو نکالا ہے چنانچہ ایک اور شعر اسی غزل میں آتا ہے۔

مے پرستاں خُمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

مے پرستی مشربِ رندی میں ایک امرِ ضروری ہے جس کا لطف ہے ساقی سے جو خوش اسلوبی سے پلاتا اور دورِ ساغر کا لطف آتا لیکن ایک دن ایسا آ گیا کہ صحبتِ ساقی کا لطف حاصل نہیں تو اب کیا کیجے کسی طرح مٹکا ہی منہ سے لگائیے کہ فرضِ مے نوشی ادا ہو۔

نقسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

نفسِ قیس کے لئے یہ کہنا درست نہیں کہ اس کے چشم و چراغ صحرا ہوتے کیا فائدہ جبکہ لیلیٰ کے گھر کی روشنی ہی نہ بن سکا کیونکہ اس کا جوہرِ ذاتی تو عیاں ہے اب اگر لیلیٰ اس سے فائدہ نہ اٹھائے اور گھر کی روشنی کو یوں برباد کرے تو یہ اسکی سیہ بختی ہے۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

ہنگامہ آرائی کا مقصد چہل پہل ہوتا ہے یہ بات جس طرح بزمِ شادی سے پیدا ہوتی ہے اسی طرح بزمِ ماتم سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ہماری شاعری لوگوں سے داد پانے اور انعام حاصل کرنے کے لئے نہیں ہے جو کسی کے اشعار کو بے معنی بتانے کا غم ہو۔

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

حیات دہر کی مصائب میں اگر کوئی چیز غنیمت ہے تو وہ صرف عشرتِ صحبتِ خوباں اب جو یہ کہتے ہیں کہ اِن باتوں میں رہوگے تو جلدی مرجاؤگے اس کی کوئی پروا نہیں کیونکہ بےلطف زندگی اگر طولانی ہو تو اس سے فائدہ کیا۔ عمرِ طبیعی اس ترکیب سے درست ہے ورنہ اُردو کا لفظ طبعی ہے طبیعی نہیں۔

(۱۷۴)

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

آفتاب عقب میں ہو تو سر کا سایہ پاؤں سے آگے آگے چلتا ہے اسی طرح ہم جلاد کے آگے جو چلے ہیں تو سایۂ سر پاؤں سے دو قدم آگے بڑھ کر ہے جس کا باعث شوقِ قتل اور نشاطِ شوق ہے۔

قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت
فقط "خراب" لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

محرومیِ قسمت دیکھیے کاتبِ تقدیر نے مجھے خرابِ بادۂ الفت لکھنا چاہا تھا لیکن خراب لکھنے کے بعد آگے قلم نہ چلا اور میں خراب محض ہو کر رہ گیا اس طرح بادۂ الفت کی شادکامی کی جگہ دنیا کی ہر برائی حصے میں آگئی اور کاتبِ تقدیر کی ناتمام تحریر نے میرا کام تمام کر دیا۔

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذّتِ الم آگے

جب تک بےفکری تھی دردِ عشق کے مزے لیتے تھے اور نشاطِ الم میں بسر ہوتی تھی لیکن جب سے غمِ معیشت نے گھیرا ہے ساری مستی نکل گئی اور سب راگ رنگ بھول گئے۔

خدا کے واسطے دادا س جنونِ عشق کی دینا
کہ اس کے در پہ پہونچتے ہیں نامہ بر سے دو قدم آگے

پہلے نامہ بر کو خط دے کر بھیجنا اور پھر اُس سے پہلے خود درِ دوست پر انتظارِ جواب میں جا پہونچنا دیوانگی تو ضرور ہے لیکن اس شوق کی طرف خیال کرتے ہوئے جو ہمیں یہاں لے آیا ہے داد دیجئے۔

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
تمہارے آئیو اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

آگے آئیو یعنی بدلے ملے اس محاورے کا استعمال بیشتر اچھے مفہوم میں نہیں آتا یار کے طرہ ہائے پرخم سے کہتے ہیں کہ یہ جو تمہاری بدولت ہم نے عمر بھر پریشانیاں اٹھائی ہیں یہ تمہارے آگے آئے یعنی تم بھی پریشان رہو۔ یہ بددعا خود دعا ہے کہ طرہ ہائے پرخم کے لئے پریشان رہنا حسن ہے اور آگے آئے کبھی دعا کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اب "تمہارے آگے آئیو" مستعمل نہیں ہے۔ اہلِ زبان اس موقع پر "تمہارے آگے آئے" بولتے ہیں۔

دل و جگر پر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

دم بمعنی روح۔ چونکہ روح مرئیات سے نہیں۔ اس لئے دہریوں کا عقیدہ ہے کہ حیاتِ عالم کی ساری کائنات صرف جگر و دل میں خون کی حرکت حرارت بخار اور اس کی لطافت سے ہے۔ روح وغیرہ کوئی جدا چیز نہیں۔ کہتے ہیں یہ عقیدہ معلوم ہونے کے بعد ہمیں اپنا سابقہ خیال باطل ثابت ہوا۔ یہاں مصنف نے مراعات النظیر کا بھی خیال کیا ہے کہ "دم" بھی عربی میں خون ہی کو کہتے ہیں۔ یا بقول مصنف۔

(غالب) دل تا جگر کہ جوششِ دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

کسی کی قسم بربنائے محبت یا عظمت کھائی جاتی ہے اور کسی امر کے خلاف قسم بربنائے نفرت و عداوت ہوتی ہے۔ کہتے ہیں یا تو انھیں ہم سے وہ محبت تھی یا یہ نفرت ہے۔ اس بحر کو اب اردو کی شاعری نے چھوڑ دیا ہے۔

(۱۷۵)

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

وہ بے مہر شکوے کے نام سے خفا ہوتا ہے لیکن یہ بھی کہنا نہیں چاہیے کیونکہ ایسا کہنا بھی تو گلا ہے کہ وہ شکوے کے نام سے خفا ہوتا ہے۔

پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

جس طرح باجے کو چھیڑتے ہی اس میں سے راگ نکلنے لگتے ہیں اسی طرح میں بھی کہہ چلوں گا ذرا چھیڑ دیکھیے۔ اسی مضمون کے مصنف نے کئی شعر لکھے ہیں جنھیں ہم دوہرا بھی چکے ہیں۔

گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

معشوق کہتا ہے ہم نہیں جانتے جور کیا ہے۔ یہ طنزاً کہتے ہیں کہ جفا کو سمجھتا تو نہیں لیکن یہ حسنِ تلافی ملاحظہ فرمائیے کہ شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہو جاتا ہے۔

عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال
سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

چرخِ گرداں کو مکوکب کہہ کر آبلہ پائی کا ثبوت دیا کہ ستاروں کو اس کے آبلے بنایا لفظ "مکوکب" اور عشق سے رات کی طرف اشارہ کر کے عاشق کی شبِ ہجراں کو پیدا کیا یعنی شبِ ہجراں میں آسماں کی رفتار سست پڑ جاتی ہے۔

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

جو تیر خطا ہوتا ہے وہ بھی ہم اٹھا کر لا دیتے ہیں کہ دمِ ناوک فگنی اس کا حوصلہ پست نہ ہو تو پھر کیوں نہ ہم ہدفِ ناوکِ بیداد ٹھہریں۔

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

ہماری خواہش کا اثر الٹا ہوتا ہے اس لئے بھلے کے بدلے اگر اپنا برا چاہتے تو اچھا ہوتا۔

(مومن) مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

(ناطق) اے سعیِ نابکار بھلائی تو ہو چکی
اب میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنا برا کروں

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

میرے ضعف کا یہ عالم ہے کہ وہی نالہ جو پہلے عرش سے بھی پرے نکل جاتا تھا اب اگر لب تک آ جائے تو سمجھو بڑی رسائی کی یا بڑا تیر مارا۔

خامہ میرا کہ جو ہے باربدِ بزمِ سخن
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

باربد اکبر کے درباری تان سین کی طرح ایک مشہور گویے کا نام ہے۔ کہتے ہیں میرا قلم جو سریرِ کلک سے باربدِ بزمِ سخن ہے شاہ کی مدح میں حسب ذیل نغمہ سرائی کرتا ہے۔

اے شہنشاہِ کواکب سپہ و مہر علم
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

اے مہر روشن کا علم اور کثرت کواکب کی فوج رکھنے والے بادشاہ کون تیرے مرتبہ کے لائق تری مدح کر سکتا ہے۔

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجئے
تو وہ لشکر کا ترے نعلِ بہا ہوتا ہے

تیری کثرتِ افواج کا یہ عالم ہے کہ اگر ہفت اقلیم کا خراج جمع کیا جائے تو صرف گھوڑوں کے نعل کی قیمت ہوتا ہے۔

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
آستاں پہ ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

بدر کے ہر مہینے ہلال ہو جانے کا سبب یہی ہے کہ عالم کمال میں آنے کے بعد چاند خود کو تیرے آستاں پر ناصیہ فرسائی کرنے کے قابل سمجھتا ہے اور وہ روز برابر تیرے آستانے پر ناصیہ فرسائی کرکے بدر سے ہلال ہو جاتا ہے۔

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزلخوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

آئینِ غزلخوانی میں اس طرح اشعار مدح کو داخل کرنا ایک طرح کی گستاخی ہے

مگر اس کا سبب یہ ہے کہ تیرا خیالِ کرم میرے ذوق کو بڑھا دیتا ہے۔

(غالب) ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

میری آج کی تلخ نوائی کا سبب درد دل کی زیادتی ہے غالب تمہیں اس سے تکلیف ہوئی ہو تو معاف کرنا۔ غزل کے باقی اشعار کو تلخ نوائی سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ یہاں مدح سرائی بھی ہے اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے۔ جواب یہ ہے کہ غزل کا ہر شعر آزاد ہوتا ہے جو حسب موقع استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ مقطع اور اوپر کا شعر حضرت ذوق اور بادشاہ پر چوٹ ہے۔ مطلب یہ کہ تیرا وہ کرم جس نے ذوق کو بڑھا دیا آئینِ غزل خوانی میں میرے گستاخ ہونے کا سبب ہے کیونکہ مجھے تیری سخن نافہمی کا یقین ہو گیا اور مقطع کی تلخ نوائی میں بھی اس کا بیان ہے۔ درد سوا ہوتا ہے کا یہ مطلب ہے کہ آج کچھ زیادہ جی دکھا ہوا ہے۔ اس پر صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ یار لوگوں نے لفظِ ذوق سے اپنی بدذوقی کا ثبوت دیا۔

(۱۷۶)

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

ہر بات پر جو تم مجھ سے کہہ دیتے ہو کہ تو ہے کیا، بھلا تمہیں انصاف سے کہو کہ یہ بھی کچھ اندازِ گفتگو ہے۔ خوب شعر ہے۔

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے

تندخوئی کے لئے شعلہ اور برق دو ہی چیزیں خاص ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ نہ شعلہ اس کے کرشمے کو پاتا ہے اور نہ برق کو اس ادا سے کچھ نسبت تو کوئی بتائے کہ خود اس شوخ تندخو کو کیا کہا جائے۔ آج کل کے استعمال میں "کوئی" کے ساتھ "بتاؤ" نہیں آتا "بتائے" آتا ہے البتہ تم کے ساتھ بتاؤ بولتے ہیں۔

(ناطق) ہے خاص اس طرح تری توصیف تیرے ساتھ
جس طرح کہئے رنگ گلابی گلاب کا

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بدآموزیِ عدو کیا ہے

اس کا کوئی خوف نہیں کہ دشمن میری طرف سے تمہارے کان بھرتا ہے البتہ اس بات کا رشک ضرور ہے کہ اسے تم سے گفتگو کرنے کا موقع حاصل ہے۔

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

دریدہ گریباں کو حاجتِ رفو اس لئے ہوتی ہے کہ تن پوشی ہو اور جب پیراہن خود لہو سے جسم پر چپکا ہوا ہے تو یہ مقصد حاصل ہو گیا اب رفو کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ "چپک رہا ہے" غالب کے زمانے کا نہایت فصیح محاورہ ہے لیکن اب نواحِ دہلی کے شرفاء اسے کم بولتے ہیں ایسے موقع پر زیادہ تر چپکا ہوا ہے بولا جاتا ہے۔

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

جلے ہوئے مکان کی راکھ اس خیال سے کریدی جاتی ہے کہ شاید کچھ زر و نقد مل جائے۔ دل کو نقد سے تعبیر کرتے ہیں۔ معشوق عاشق کے جسمِ سوختہ کی راکھ کرید رہا ہے جس پر یہ اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں کہ "جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہو" ایک ہندی مثل ہے اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

دورانِ خون سببِ حیات ہے اور حاصلِ حیات ہے غمِ عشق جس کے اظہار کے لئے گریۂ خونی کی ضرورت ہے۔ کہتے ہیں دورانِ خون سے جب مقصدِ حیات ہی حاصل نہ ہو تو حیات سے کیا حاصل۔

وہ چیز جس کے لئے ہو ہمیں بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام و مشک بو کیا ہے

جنت میں جو بادۂ دیدار کا وعدہ ہے وہی ایک ایسی نعمت ہے جس کے لئے ہمیں بہشت عزیز ہو سکتی ہے جیسا کہ لکھ آئے ہیں۔

(غالب) کہتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

یا یہ کہ شراب ہی بہشت میں ایک ایسی چیز ہے جس کے لئے ہم بہشت کی آرزو کر سکتے ہیں اور جب حصولِ بہشت کے لئے شراب ہی سے توبہ کرنا پڑے تو ایسی بہشت ہمیں کیا عزیز ہو سکتی ہے۔

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

اتنی سی شراب میں میری سیری نہیں ہو سکتی آخر ایک شیشہ ایک قدح اور ایک ساغر و سبو کی بساط ہی کیا ہے اور ان سے میرا کیا پورا پڑے گا کیوں تھوڑی سی پی کر نام بدنام کروں یا ساقی کا مرہونِ منت ہوں ہاں اگر دو چار مٹکے بھی نظر آئیں تو پی لوں گا۔

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہئے کہ آرزو کیا ہے

طاقتِ گفتار نہ رہنے سے اچھا ہوا کہ بات رہ گئی کیونکہ اگر بول بھی سکتے تو کیا بیانِ آرزو کرتے آخر کسی سے امید ہی کیا تھی اس مضمون کو مصنف نے بہت دُہرایا ہے۔

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ہماری عزت محض شاہِ والا کی عنایت سے ہے جس کی بدولت اتراتے پھر رہے ہیں ورنہ شہر میں ہماری کیا آبرو تھی۔ یہ مضمون ہم چشموں کے لئے یا کسی اور کے واسطے طنزاً بھی ہو سکتا ہے جس میں مصنف نے خود اپنا نام لیا ہے۔

(۱۷۷)

میں انھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پیئے ہوتے

انھیں بے وقت چھیڑا اس لئے پی گئے اگر پیئے ہوئے ہوتے تو میری چھیڑ پر چل نکلتے اور بگڑنے کا لطف آتا۔

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاشکے تم مرے لئے ہوتے

کہتے ہو کہ ہم قہر ہیں ہوتے کہتے ہوتے ہو کہ ہم بلا ہیں رہتے اور اس سے بھی زیادہ ہوتے مگر میری خوشی یہ تھی کہ یا ہر میرے لئے ہوتے یہ بات مجھے بلا ہے کہ کسی غیر پر تمھارا قہر بھی ہو۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

یا اللہ میری قسمت کا غم ایک دل کی بساط سے بہت زیادہ ہے۔

(ناطق) امانت خانہ ہے دل اس میں یہ سب ہم کہاں رکھیں
تمہارا غم یہاں ہے اب غمِ عالم کہاں رکھیں

(میر) کاشکے دل دو تو ہوتے عشق میں
ایک رکھتے ایک کھوتے عشق میں

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیئے ہوتے

غالب تم نے بڑی جلدی ہمت ہار کر جان دیدی اگر کوئی دن اور زندہ رہ کر اُسے ڈھب پر لانے کی کوشش کی ہوتی تو بھلا کوئی بات تھی کہ معشوق راہ پر نہیں آتا۔ یا اس شعر میں اہلِ ہمت کی طبعی خاصیت بتائی ہے کہ وہ کسی بات سے مایوس نہیں ہوتے اور جو کام تادمِ مرگ نہ ہو اس کا ذمہ دار زندگی کی کم فرصتی کو سمجھتے ہیں کہ اگر اور کوئی دن زندہ رہتے تو کر لیتے۔

(۱۷۸)

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

افسوس ہے کہ غیر ان کی بزمِ سرور میں شامل ہوں اور ہم بلاوے کو ترسیں۔

خستگی کا تم سے کیا شکوہ؟ کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

حسنِ شکایت ہے کہ تمھارے ہاتھوں جو خستہ حالی ہمیں نصیب ہوئی اس کا تم سے کیا شکوہ کریں اگر ہماری قسمت میں یہ سب کچھ نہ ہوتا تو تم کیوں درپے آزار ہوتے ایسا ہی ایک شعر لکھ آئے ہیں۔

نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

خط لکھیں گے گرچہ کچھ مطلب نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

خط میں لکھنے کے لئے کچھ مطلب نہ ہو تو نہ سہی تمہارا نام تو اس میں لکھا جائے گا بس اس سے ہمیں غرض ہے۔

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے

جامۂ احرام سے موسمِ حج نکلتا ہے۔ چونکہ بوقت شب کوئی فریضہ برائے انصرام نہ تھا اس لئے وقت کو نہ ضائع کرتے ہوئے زمزم پر بیٹھ کر اس بے پروائی سے شراب پی کر جامۂ احرام بھی مے آلودہ ہوگیا اور صبح جب نماز کا وقت آیا تو پھر دھو کر پاک صاف ہوگئے۔

(غالبؔ) سرِ خشتِ خم پہ چاہیے ہنگامِ بے خودی
منہ سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

اسی مضمون کو ذرا بدل کر یوں لکھ آئے ہیں۔

(غالبؔ) اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا؟ مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

ہر جال میں حلقے ہوتے ہیں دامِ زلف جس میں بخیال عشاق دل گرفتار کیا جاتا ہے حلقہ بہ حلقہ ہوتا ہے خانۂ چشم کو بھی حلقۂ چشم کہتے ہیں۔ اس شعر کی نثر یوں ہوگی دل کو آنکھوں نے کیا پھنسایا شاید یہ بھی تمہارے دامِ زلف کے حلقے ہیں یعنی آنکھوں نے دھوکہ دے کر کس صفائی سے دل کو گرفتار کرایا ہے شاید یہ دونوں بھی تمہارے دامِ محبت کے حلقے ہیں جو میرے چہرے پر لگا دیے گئے۔

شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر
دیکھئے کب دن پھریں حمام کے

شاہِ والاجاہ کا صحت یاب ہونا خود سامان تندرستی کی خوش بختی ہے۔

عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

یہ شعر نہ صرف یہ کہ سہل ممتنع ہے بلکہ مشہور بھی بہت ہے اور تقریباً ہر شخص پڑھ دیتا ہے۔

(داغؔ) ہم نکمّے ہوئے زمانے کے
کام ایسا بتا دیا تو نے

(میرؔ) پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

(ناطقؔ) فکر کیسی انتظامِ زیست کی
کون سا ایسا ضروری کام ہے

(۱۷۹)

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

نئی بہار اس انداز سے آئی کہ مہر و مہ بھی تماشائی ہوگئے یعنی چشمِ فلک نے بھی ایسی بہاریں کم دیکھی تھیں۔

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

یہاں ساکنانِ خطۂ خاک کو مخاطب جو کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ خاک کو جو خاک بھی

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

جذبِ دل کا تو یہی کام ہے کہ تمہیں کھینچے اب تم بلاوجہ اپنی طرف کھینچ کر نہ بیٹھو تو کشاکش تک نوبت کیوں آئے اس میں دیکھ لو کہ کس کی زیادتی ہے اور جو تم جذبِ دل کا شکوہ کرتے ہو یہ کہاں تک درست ہے۔

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

تم جس کے دوست بن جاؤ آسمان اس کی بربادی کی کیوں فکر کرے اسے معلوم ہے کہ تم کیسے یار مار ہو اور یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے۔ عوام میں ایک مثل مشہور ہے کہ۔ جس کا بنیا ہووے یار ۔ اُس کو دشمن کیا درکار

(ناطق) بتوں کی دوستی ہے دشمنی اپنے مقدر کی
کوئی کیا چین سے بیٹھے بُروں کا ہم نشیں ہو کر

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

تم دشمن کے اپنے ہو کر میرا کیا امتحان لیتے ہو اس کا نام تو ستانا ہے آزمانا نہیں میں اسے کیونکر برداشت کر سکتا ہوں کہ تم میرے صبر کا امتحان لینے کے لئے دشمن کے دوست بنو اور میں اس پر کیونکر صبر کر سکتا ہوں۔

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر سے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

”پھر کہیو“ پھر تو کہو یا پھر کہنا۔ یہ لفظ میر کی زبان کا ہے نواحِ دہلی میں اب بھی مستعمل ہے مگر اردو زبان اسے متروک قرار دے چکی ہے۔ چونکہ معشوق ایک

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

وہاں یہ چالیں نہیں چلتیں اور وہ ایسے دم جھانسوں میں نہیں آتے۔

(۱۲۵)

رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

یارانِ ہم سخن و ہمزبان کی تلخ گوئی کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو کہ ہزاروں کو آزما دیکھا اور کوئی ایسا نہ ملا جو سیدھی بات کرتا۔

بے در و دیوار سا اِک گھر بنایا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

دیوار سے ہمسایہ کا تعلق ہوتا ہے اور در سے پاسباں کا اس لئے ایسا گھر بنایئے جو بلحاظ نہ ہونے ہمسایہ اور پاسباں کے بے در و دیوار سا ہو کیونکہ ہمسایوں کی رخنہ اندازی اور دربانوں کی لوٹ مار قابلِ برداشت نہیں رہی۔

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

ایسے تیمارداروں کو لے کر کیا کرے جو سبب آزار ہوں ایسے نوحہ خواں کس کام کے جو جان لینے کے بعد رونے کو بیٹھیں۔ یہ تینوں شعر ملکر ایک قطعہ ہے۔

———•×•———

کو ایسا بلند کر دیا ہے کہ اگر تم پہلوتہی بھی کرو تو میں سمجھوں گا کہ میرے لئے جگہ خالی کی یعنی مجھے آغوشِ تغافل میں جگہ دی۔ یہاں معشوق کی پہلوتہی سے اپنے لئے جگہ نکال کر مصنف نے کمال نظم دکھا دیا ہے۔

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

جام و سبو کا بھرا ہوا ہونا میخانہ کے خالی ہونے کی دلیل ہے یعنی اگر رندانِ قدح نوش سے میخانہ بھرا ہوا ہو تو جام و سبو خالی ہو جائیں جن کے بھرے ہوئے ہونے سے میخانہ اہلِ ذوق سے خالی ہے اسی طرح عالم کی آبادی سے بھی اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اہلِ ہمت کا وجود نہیں کیونکہ اگر ایسے لوگ موجود ہوتے تو دنیا کو کھا پی کر ختم کر دیتے اور اس کے سارے طمطراق کا خاتمہ ہو جاتا۔ خوب شعر ہے۔ ایسا ہی ایک شعر پہلے لکھ آئے ہیں۔

(غالب) لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

(۱۸۱)

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

میری تمنا ہے کہ وہ میری کہانی خود مجھ سے سُنے لیکن معشوق کو یہ سُننا ہی منظور نہیں تو اب میری زبانی کا کیا ذکر۔ مثل مشہور ہے کہ بنیا پاس ہی نہیں کھڑا ہونے دیتا آپ کہتے ہیں پورا تول

خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ
دیکھ خوں نابہ فشانی میری

میری خوں نابہ فشانی سے غمزۂ خوں ریز کی خلش ظاہر ہے اس میں پوچھنے اور

بتانے کی ضرورت نہیں۔

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار؟
مگر آشفتہ بیانی میری

جب کسی مرے کو روتے ہیں تو اس کے اوصاف بھی بیان کرتے ہیں جسے بیان یا بین کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں مجھ میں اور تو کوئی ایسا وصف نظر نہیں آتا جس کے لئے کوئی روئے البتہ ایک آشفتہ بیانی ہے اگر احباب اسے بیان کر کے روئیں تو روئیں۔

ہوں زخود رفتۂ بیدائے خیال
بھول جانا ہے نشانی میری

بیدا میدان کو کہتے ہیں میں گویا ہوں میدانِ خیال کی از خود رفتہ ہستی یعنی خود فراموشی میرا خاصہ ہے اس لئے دوستوں کے پاس بھی فراموشی ہی میری نشانی ہے یعنی مجھے دل سے بھلا دینا میرے وصفِ خاص کو اپنے پاس بطور نشانی رکھنا ہے۔

متقابل ہے مقابل میرا
رک گیا دیکھ روانی میری

عاشق کا مقابل معشوق متقابل متضاد۔ کہتے ہیں میرے معشوق میں اور مجھ میں تضاد کی نسبت ہے اس لئے جو نہیں ترقی الفت کی روانی کو دیکھا تو رک گیا یعنی اجتناب کرنے لگا۔ آج کل ایسے موقع پر "دیکھ کی" جگہ "دیکھ کر" لکھا جاتا ہے۔ اور لفظ "دیکھ" بیان امر ہوتا ہے۔

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے گرانی میری

میری گراں باری کی حالت سنگِ سرِ راہ کی سی ہے جس کی کوئی قدر و قیمت

نہیں اور جو ہمیشہ راہگیروں کی ٹھوکریں کھاتا ہے۔ یہ شعر سفلا مزاج اہلِ دولت کے بالکل شایان شان ہے فارسی میں اسی مضمون کو مصنف نے یوں لکھا ہے۔

(غالب) تا کس ز تنومندی ظاہر نہ شود کس
چوں سنگ سرِ رہ گر گراں ہست گراں نیست

(ناطق) بھاری بھر کم نہیں لگتے ہیں سبک رو نہیں
بارِ خاطر ہے جدا اور سبک سار جدا

گرد بادِ رہِ بے تابی ہوں
صرصرِ شوق ہے بانی میری

گرد باد بگولہ۔ ہوائے شوق کی تندی نے مجھے راہِ شوق کا بگولہ بنا کر گھومنے کو لگا دیا ہے۔

دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی ہیچ مدانی میری

دہانِ معشوق کو معدوم باندھتے ہیں اور معدوم کے لئے لفظ ہیچ بولا جاتا ہے یہ اس سے فائدہ اٹھا کر کہتے ہیں معشوق کا دہن معلوم نہ کرنے سے میری ہیچ مدانی کا ثبوت مل گیا۔ خوب کہا۔

کر دیا ضعف نے عاجز غالب
ننگِ پیری ہے جوانی میری

جوانی میں ضعف کا یہ عالم ہے جو کسی بوڑھے کو بھی نہیں ہوتا اور جس نے مجھے بالکل بیکار اور عاجز کر دیا ہے۔

(ناطق) جوانی ولولوں کی عمر ہی کا نام ہے ناطق
ہماری بھی جوانی کچھ جوانی میں جوانی ہے

(۱۸۲)

نقشِ نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

مانی ایک مشہور مصور۔ آغوشِ رقیب میں کھینچے جانے کے لیے بتِ طناز کا نقشِ ناز خامۂ مانی کے واسطے پائے طاؤس چاہتا ہے۔ جس طرح مور کے پاؤں لحاظ بدنمائی ننگِ طاؤس ہوتے ہیں اسی طرح آغوشِ رقیب میں بتِ طناز کا نقشِ ناز بھی ننگ نقش و ناز ہوگا۔ نیز یہ کہ ایسی تصویر کے لیے جو ننگ مصوری ہے قلم بھی ایسا چاہیے جو ننگِ رقم ہو۔ ایک تکلف ہے۔

تو وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانے
غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

تیری بدخوئی کا یہ عالم ہے کہ تحیر سے بھی چڑتا ہے اور کہتا ہے کہ کیا ہم کوئی تماشا ہیں جو یوں دیکھ رہے ہو تو اب تیرے سامنے بیانِ غم کیا کریں تیری نازک مزاجی ایسی آشفتہ بیانی کی کہاں تاب لا سکتی ہے۔

وہ تپِ عشق تمنا ہے کہ پھر صورتِ شمع
شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

شمع کے دھاگے کو شعلہ کی ریشہ دوانی سے تعبیر کیا جو شمع کے وسط میں ہوتا ہے شعلہ شمع کو پکڑ کر رفتہ رفتہ فنا کر دیتا ہے۔ تارِ نفس سینہ سے وابستہ ہوتا ہے جو مقامِ جگر ہے اس لئے اسے نبضِ جگر قرار دیا ہے کہتے ہیں مجھے ایسے سوزِ عشق کی تمنا ہے جس کا شعلہ آنکھوں سے نبضِ جگر تک ریشہ دوانی کی راہ نکالے اور مجھے شمع کی طرح فنا کر دے۔

(۱۴۳)

گلشن کو تری صحبت ازبس کہ خوش آئی ہے
ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

باغ کو تیری صحبت بہت مرغوب ہے یہاں جو کلیاں کھلتی ہیں وہ فی الحقیقت تجھ سے گلے ملنے کے لئے آغوش کشائی کرتی ہیں۔

واں کنگرِ استغنا ہر دم ہے بلندی پر
یاں نالے کو اور الٹا دعوائے رسائی ہے

وہاں کنگرِ بامِ استغنا ہر دم بلند ہوتا جاتا ہے یعنی ان کی لاپروائی اور خودپسندی بڑھتی جاتی ہے اور یہاں نالے کو الٹا رسائی کا دعوائے ہے یہی کمبخت اگر ایسا رسا ہوتا تو اُن کا استغنا بڑھتا کیوں۔

(ناطق) اڑ گئی اپنی بات جو تھی بھی واہ اچھا اثر ہے نالوں کا

ازبس کہ سکھاتا ہے غم ضبط کے انداز ے
جو داغ نظر آیا اِک چشم نمائی ہے

چشم نمائی تشبیہ داغ کو آنکھ سے مشابہ کیا اور آنکھ سے چشم نمائی نکالی۔ کہتے ہیں درد غم سے جو ہر نیا داغ پڑ کر نظر آتا ہے وہ غم کی چشم نمائی ہے جس سے ضبط کی تعلیم دی جاتی ہے۔ پہلے اسی مضمون کو یوں لکھ آئے ہیں۔

(غالب) گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یارب اسے قسمت میں عدو کی

زخم سے مراد ہے زخمِ دل جس کا سبب ہوتا ہے عشق۔ تدبیر رفو سے مراد ہے

قابل علاج ہونا جو عشق صادق کے منافی ہے اور جسے بوالہوسی کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ زخم عشق جس کی تدبیر رفو ہو سکے اہلِ ہوس ہی کو مبارک رہے۔ یا زخم سے مراد زخم یہ لذت کشِ درد ہیں اس لئے وہ درد جو قابل علاج ہو انھیں منظور نہیں۔

اچھا ہے سر انگشتِ حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

معشوق کے حنا مالیدہ پوروے کی لہو کی بوند سے تشبیہ مصنف کی جدت ہے جس سے کمالِ نازکی کو بھی نکالا۔ شعراء عام طور پر معشوق کے دستِ حنائی کو خون عشاق سے آلودہ باندھا کرتے ہیں۔

(سعدی) بہ خونِ عزیزاں فرو بردہ چنگ
سر انگشت ہاں کردہ عناب رنگ

(غالب) خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنے
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

(ناطق) پائے بتِ نازک نہ ہو محتاج حنا کا
اے گریۂ خوں وقت پہ بگڑے نہ مری بات

اسی طرح معشوق کو عاشق کے خون کا پیاسا بھی باندھا جاتا ہے۔ یہاں یہ حال ہے کہ سارا خونِ جگر نذر عشق ہو گیا جسم میں ایک قطرہ بھی باقی نہیں اس پر بھی سر انگشتِ حنائی کا تصور باقی ہے جس کی نیازمندی میں گھر کا صفایا ہوا خیال ہوتا ہے کہ اب تو اسے نکالئے اس کا جواب دیتے ہیں کہ اس تصور کی بدولت دل میں لہو کی ایک بوند تو نظر آتی ہے چلو غنیمت ہے اگر یہ بھی نہ ہو تو میدان صاف ہے۔

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

بے حوصلگی پست ہمتی جو عشاق کے لئے فریاد کا سبب ہے۔ کہتے ہیں اس دنیا میں تو کوئی ایسا ہے نہیں جو کسی کی فریاد رسی کرے پھر تم جفا کرتے ہوئے اس خیال سے ڈرتے کیوں ہو کہ عشاقِ بے حوصلہ فریاد کریں گے۔ لفظ "کسو"

بمعنی "کسی" اب کہیں نہیں بولا جاتا اور خود مصنف کے متروکات میں سے ہے جسے انھوں نے یہاں قافیہ کے لئے نظم کر دیا ہے جو لفظ متروک ہے وہ بہر حال متروک ہے۔

دشنے نے کبھی منھ نہ لگایا ہو جگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

عاشق کی تمنا تو یہ تھی کہ دشنہ یا دشنۂ غمزہ جگر کی تواضع کرتا اور خنجر یا خنجر ناز گلو کی یہ امید معشوق کی بے التفاتی سے بر نہیں آئی اس لئے یہاں مستقبل کے لئے بیان ماضی کے ساتھ معشوق سے طنز اً کہتے ہیں کہ دیکھو دشنے نے کہیں منہ نہ لگایا ہو الخ اس طرح مستقبل کا بیان ماضی کے ساتھ حسن بیان ہے۔ یا یہ کہ جگر و گلو کچھ اترائے ہوئے سے نظر آ رہے ہیں اس پر یہ سوچتے ہیں کہ دشنۂ غمزہ اور خنجرِ ناز کی تو ان پر عنایت نہیں جو پھولے پھولے پھر رہے ہیں۔

صد حیف! وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بُتِ عربدہ جو کی

جو شخص جنگجو معشوق سے دوستی کی تمنا رکھے اس کی ناکامیِ دوام یقینی ہے اس لئے اس شخص کے فضول عمر ضائع کرنے پر افسوس کرتے ہیں۔ مصنف کا یہ طرز بیان درست نہیں معلوم ہوتا "اک عمر سے" کے ساتھ رہا ہو ہونا چاہئے اور "رہے" کے لئے "ایک عمر تک" کہنا درست ہو گا مگر یہاں انھوں نے فارسی کا ترجمہ کیا ہے جو ایسے محلِ استعمال میں "از یک عمر" صحیح ہوتا ہے۔

(۱۸۴)

[illegible] گرمیِ آئینہ دے ہے کہ ہم
حیراں کئے ہوئے ہیں دلِ بے قرار کے

پشت گرمی اعانت تقویت سیماب بیقرار ہوتا ہے اور آئینہ حیران لیکن آئینہ کو

سیماب کی پشتی سے آئینہ بنلتے ہیں گویا آئینہ سیماب کی مدد سے آئینہ بنتا ہے جو ایسا اثر ہے کہ سیماب کی ضد ہے اس مثال سے اپنی حالت کے متعلق دعوٰی عمل مقدر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ہماری حیرانی کو دیکھ کر یہ نہ سمجھو کہ دل بیقرار نہیں بلکہ سیماب کی پشت بانیِ آئینہ کی طرح خود ہمارا دلِ بیقرار ہی ہماری حیرانی کا سبب ہے۔

(ناطق)
بہ ذوقِ جلوہ سیماب اضطراب آگاہ ہے معنی
کہ آئینے کی حیرانی ہے صاف آئینہ حیراں کا

آغوشِ گل کشادہ برائے وداع ہے
اے عندلیب اچل کہ چلے دن بہار کے

بہار کی بے ثباتی کا بیان کرتے ہیں کہ پھول کا کھلنا ہی آغوشِ وداع کا کشادہ کرنا ہے۔ دوسرے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ اے غافل فرصت کو غنیمت جان۔ خود مصنف نے اس مضمون کے کئی شعر لکھے ہیں مگر یہ سب سے اچھا ہے۔

(۱۸۵)

ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں
معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہئے

شوخ چنچل دیوانہ گستاخ۔ کہتے ہیں اگر وصل میں معشوق پر تمکین اور عاشق پابند ضبط ہو تو وہ وصل وصل نہیں رہا بلکہ ہجر ہو گیا کیونکہ اس طرح چھیڑے گا کون اور ابتدا کس کی طرف سے ہو گی یا ہو بھی تو بہ عالمِ تمکین و ضبط لطف کیا آئے گا ایسے وقت کے لئے تو اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک طرف سے ہمت افزا شوخیاں ہوں اور دوسری طرف سے چھیڑ چھاڑ۔

اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہئے

فضول بفاصل زائد بڑھا ہوا جو یہ ترکیب فارسی درست ہے لیکن لفظِ "فضول" اُردو ہو کر بیکار کے سوا دوسرے معنی میں نہیں بولا جاتا اس لئے اگر یہاں یہ لفظ بے ترکیب فارسی استعمال ہوتا تو غلط ہو جاتا۔ کہتے ہیں کہ لب یار سے بوسہ کبھی نہ کبھی مل ہی جائے گا لیکن اس کے لئے شوقِ مُفرط اور بے حجابانہ جرأت کی ضرورت ہے کہ موقع کی تاک میں رہے اور وقت آنے پر چوکے نہیں۔

(۱۸۶)

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

یہ اگر چاہیں یعنی یہ اگر محبت کرنے لگیں۔ کہتے ہیں خوبانِ عالم حاصلِ عالم ہیں اس لئے انسان کو جتنا چاہیے اسے اچھوں کی چاہت میں مختصر کر دے کیونکہ ان کا مل جانا سب کچھ مل جانے کے برابر ہے۔

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے

شراب پینے کو فارسی میں مے کشیدن کہتے ہیں لفظ "کھینچا چاہیے" اپنے اور شراب دونوں کے لئے استعمال کیا ہے۔ کہتے ہیں صحبتِ رنداں سے پرہیز لازم ہے اس لئے ان کے ساتھ مے کھینچنے کی عیوض خود اس صحبت سے کھینچ جانا چاہیے۔

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل؟
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

یہاں بھی لفظ "سمجھا" دو جگہ دو معنوں استعمال کیا ہے یعنی خیال کرنا اور سزا دینا۔ معشوق سے کہتے ہیں دل نے تری محبت کیا سمجھ کر کی اسے اس کی سزا دینا چاہیے۔

چاک مت کر جیب بے ایّامِ گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے

اُدھر کا اشارا حکمِ خداوندی جو بہار کی آمد کا سبب ہوتا ہے اور جب غنچہ اپنے گریبان کو چاک کرتا ہے موسمِ بہار ہی میں دورانِ خون بڑھ جاتا ہے اور اکثر دیوانوں کو جوشِ جنوں بھی ہوتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ بہار گریبان دری کے لئے ایک غیبی اشارہ ہے۔ کہتے ہیں کہ جنونِ عشق کے لئے اُدھر کے اشارے کا منتظر رہ کہ ابتدا ادھر سے ہو جسے بہار زندگی کہا جائے۔ اہلِ تصوف کی اصطلاح میں اسے مرتبہ قلندریت کہتے ہیں جس میں محو ہو کر سالک بہت آسانی سے تمام مراتب کو طے کر جاتا ہے۔

(ناطق) ہے وضعِ راہِ مست قلندر یہاں نصیب
لے جا رہا ہے کوئی اِدھر سے اُدھر مجھے

(عراقی) ضمارے قلندر سزد ار بہ من نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسمِ پارسائی

دوستی کا پردہ ہے بے گانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

تم جو مجھ سے شرماتے اور منہ چھپاتے ہو اس پر لوگ شک کریں گے دوستی کا پردہ تو بیگانگی ہے تم بے محابا میرے سامنے آیا کرو جس سے لوگوں کو صفائیِ خاطر کا گمان ہو اور لوگ یہ سمجھیں کہ اگر کوئی ربط ہوتا تو یہ غالب سے بے حجابانہ نہ ملتے۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ یوں لکھا ہے۔

(غالب) در پردہ انھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردا ہے کہ پردا نہیں کرتے

(ناطق) کرے گی راز کو افشا یہی جناب کی بات
حجاب کس لئے جب کچھ نہیں حجاب کی بات

دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے ؟ دیکھا چاہیئے

دیکھئے دشمن بھی کس قدر دشمن ہے کہ میری برائی کی فکروں نے اسے دنیا میں کسی کام کا نہ رکھا۔

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے

ہم اپنی کوشش سے اپنے لئے ہنگامۂ رسوائی گرم نہیں کرسکتے یہ تماشا تو اُسی کے کئے ہوتا ہے آیۃ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ۔

(ناطق) آتا ہے میرے حال پہ اہلِ ہوس کو رشک
ان کو بھی آرزو ہے کہ رسوا کرے کوئی

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیئے

جس کی امیدوں کا انحصار موت پر رہ گیا ہو یعنی صرف موت کی تمنا رکھتا ہو سمجھ لو کہ وہ دنیا سے کس قدر نا اُمید ہوگا۔ یا یہ کہ عاشقانِ ذات کے لئے جنت میں وعدۂ دیدار ہے جس کا حصول بعدِ مرگ ہوگا تو ان کی اُمید مرنے پر منحصر ہوئی اور دنیا ایسے لوگوں کے لئے ہر طرح نا امیدی کا گھر ہوگیا۔

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے

صورتِ معشوق سے دلِ عاشق کا تعلق ہوتا ہے اس لئے ان ماہ طلعتوں کی چاہت کے لئے روشن ضمیری کی ضرورت ہے۔ یہاں غافل کو جو مخالف بنایا ہے اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ شان منافی عشق ہے۔

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

اسدؔ اور عشقِ بتاں ذرا آپ کا حلیہ تو ملاحظہ کیجئے۔ یہ شعر مندرجہ بالا شعر کے ساتھ مل کر اگر قطعہ بھی ہو تو خوب ہوگا۔

(۱۸۷)

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

کیونکہ منزلِ مقصود کے لئے جس بیاباں کو میں طے کر رہا ہوں وہ میری رفتار کو دیکھ کر مجھ سے وحشت کرتا اور بھاگتا ہے اس لئے ہر قدم پر منزلِ مقصود کا مجھ سے دور ہوتا جانا نمایاں ہے۔

درسِ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر
ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

عالم کو تماشا گاہ باندھتے ہیں جس کے حوادث درسِ عبرت ہیں مصنف نے لکھا ہے۔

(غالبؔ) اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

عنوانِ تماشا سے مراد ہے خود اپنی ذات جو ہمیشہ پیشِ نظر ہو اور جس پہ پہلے پڑتی ہے۔

(سعدی) اے تماشا گاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہرِ تماشا می روی

تارِ نظر کو رشتۂ نظر بنایا اس کا اولین تعلق ہے مژگاں سے یہاں ردیف خصوصیت سے قابلِ لحاظ یعنی خود میری ذات سے بھی جو میرے لئے عنوانِ تماشا ہے "تارِ نظر" رشتۂ شیرازۂ مژگاں بنا ہوا ہے یعنی خود اپنے وجود پر نظر ڈالنے

سے تغافل ہے اور میں نے اپنی نگہ کو اس حد تک روکا ہے کہ تارِ نظر گویا رشتۂ شیرازۂ مژگاں بن کر رہ گئے ہیں۔ مطلب یہ کہ تماشا گاہِ عالم کو دیکھنا اور اس سے سبق حاصل کرنا تو دور رہا میں تو عنوانِ تماشا کا درس بھی صرف تغافل سے بہتر سمجھتا ہوں اس لئے میں نے اپنی نظر کو شیرازۂ مژگاں کا رشتہ یعنی دھاگہ بنا کر رکھ دیا ہے کہ وہ بُنِ مژگاں سے آگے بڑھنے نہیں پاتی حاصل یہ کہ تماشا گاہِ عالم سے مجھے خود فراموشی کا سبق لینا ہی بہتر معلوم ہوا۔ نہایت بلیغ شعر ہے۔

(ناطقؔ) نظر بندی بہ مژگاں خوشتر از بندِ نظر بندی
سر کوتاہ بیں کوتاہ کن چشمِ تماشا را

(ولہ) مجھ سے بڑھ کر اور دنیا میں کسی نے کیا کیا
جس نے خود کو کھو دیا اس نے تو سب کچھ پالیا

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں
صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے

سوزشِ دل کی بدولت شبِ تنہائی میں میرے سائے کو ایسی وحشت تھی کہ وہ مجھ سے اس طرح دور بھاگتا تھا جس طرح آگ سے دھواں اسی مضمون کا ایک شعر اور لکھا ہے۔

(غالبؔ) سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں
کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

یہاں "نہ ہو" کا استعمال بددعا کے لئے ہے۔ عورتیں کہا کرتی ہیں "نوج ہو یہ رنڈاپے کی زندگی جس کی بدولت جیتے جی مٹی لینا پڑے" کہتے ہیں نہ ہو یہ غمِ عشاق جس کا وصف ہے سادگی آموزِ بتاں ہونا اس نے انھیں میرے سوگ میں ترکِ آرائش کرنے پر مجبور کر کے آئینہ خانہ میں خاک اڑا دی۔ اس سے ملتا ہوا

ایک شعر اور لکھا ہے۔

(غالبؔ) درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا
نگہِ ناز ہے سرمہ سے خفا میرے بعد

یا غمِ عشاق کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ بتوں کے لئے سادگی آموز نہ ہو دیکھ تو میرے سوگ میں انھوں نے تمام سامانِ آرائش کو بیکار کر دیا۔

اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں
صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

جس طرح گوہرِ تاباں کے پرتو سے رشتۂ گوہر منور نظر آتا ہے اسی طرح میرے آبلۂ پا کے اثر سے جادۂ صحرائے جنوں جس پر میرا گزر ہوتا ہے چراغاں ہوتا چلا جا رہا ہے۔

بیخودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو
پر ہے سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

خدا اس بیخودی کو تمہیدِ فراغت کا بستر بنائے جس کے بدولت میرا شبستان جو معناً میرا سایہ ہے (اور جس کے لحاظ سے پڑوسی کو ہمسایہ کہتے ہیں) میرے وجود سے اس طرح پُر ہے جیسے سایہ اس چیز کے وجود سے پُر ہوتا ہے جس کا وہ سایہ ہو یعنی بیخودی نے میرے وجود سے میرے شبستاں کو آباد کر رکھا ہے کہ اب مجھ میں خواہشات کا وجود باقی نہیں جو اٹھا کر کہیں لے جائیں خدا اسے تمہیدِ فراغت کا بستر بنائے اور یہی بیخودی دنیا و مافیہا سے استغفار کی ابتدا ہو۔ اب اس معنی میں "ہُو جو" اور رہو جیو دونوں متروک ہیں ان کی جگہ صرف "ہو" یا "ہو جائے" بولتے ہیں۔

شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے
ہو نگہ مثلِ گلِ شمع پریشاں مجھ سے

مجھے گردن مارے "مرا گردن زدنی" کا ترجمہ ہے جس کا استعمال مصنف نے

حسب عادت کیا حالانکہ اردو زبان میں ایسا استعمال جائز نہیں۔ اسی طرح ردیف کا استعمال بھی "از من" کا ترجمہ ہے جو یہاں کچھ حشو سا بھی ہے مطلب یہ کہ میرا شوقِ دیدار تمام جسم سے سمٹ کر اس طرح آنکھوں میں آگیا جس طرح گلِ شمع زیرِ شمع جمع ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر تو میری گردن مارے تو جس طرح گل مقطوع کا شعلہ پریشان ہو کر فوری طور پر پھیلتا ہے یہی عالم میری نگہ کا بھی ہوگا۔ ایک تکلف ہے۔

بے کسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے ہے
سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

سایہ تاریکی کی طرح روشنی کی ضد ہوتا ہے یعنی ہمیشہ روشنی سے اُس جسم کی آڑ لیتا ہے جس کا وہ سایہ ہے۔ خورشیدِ قیامت اپنی تابش کے لئے ضرب المثل ہے اور سایہ کا نور میں چھپنا اجتماعِ ضدین۔ کہتے ہیں "ہے ہے" شبِ ہجر میں اہلِ جہاں کے مجھ سے عام طور پر وحشت کرنے کی بدولت جس بیکسی کا عالم پیدا ہو گیا ہے اس کا کیا بیان کروں کہ خود میرا سایہ مجھ سے گریز کر کے بہ عالمِ بدحواسی خورشیدِ قیامت میں جا چھپا ہے۔

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

جس طرح آئینہ حسینوں کے لئے جلوہ آموز ہوتا ہے اسی طرح مشتاقِ دید کا دیدۂ حیراں بھی جیسا کہ پہلے لکھ آئے ہیں۔

(غالبؔ) رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا

کہتے ہیں تجھ سے بزمِ جہاں میں صد جلوۂ رنگیں کی گردشِ ساغر ہو رہی ہے اور مجھ سے ایک دیدۂ حیراں کی آئینہ داری یعنی ایک میرے دیدۂ حیراں کی آئینہ داری میں تیرے صد جلوۂ رنگیں کا راز پنہاں ہے۔ یا یہ کہ معشوقِ حقیقی سے خطاب کر رہے ہیں کہ تیرے صد جلوۂ رنگیں کی گردشِ ساغر ہو رہی ہے اور میں آئینہ حیران بن کر

تک رہا ہوں۔ یا یہ کہ اُسی معشوقِ حقیقی سے کہتے ہیں کہ تری گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں کا ایک نظارہ یہ بھی ہے کہ میں دیدۂ حیراں کی آئینہ داری کرتا ہوں۔

(غالبؔ) مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہو جیو
نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

نگہِ گرم سے اِک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

نگہ گرم نگہِ عاشق جس میں گرمیِ شوق ہوتی ہے۔ آگ ٹپکتی ہے بمعنی مجاز یعنی ضیا بار ہے کہ اس نے چمکا دیا ہے یا روشن کیا ہے۔ کہتے ہیں دمِ نظارۂ گل میری نگہ شوق کے اثر سے باغ میں آگ سی لگی ہوئی ہے جس کی بدولت خس و خاشاکِ گلستاں میں چراغاں کا عالم پیدا ہے۔

(۱۸۸)

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

نکتہ چیں باریکیاں نکالنے والا معترض۔ بات بنے مقصد بر آری ہو۔ بات بنانا ایسا طرزِ کلام جو حصولِ مقصد کا ذریعہ ہو۔ کہتے ہیں معشوق کو حالِ دل باتیں بنا کر سنائیں بھی تو ان کی نکتہ چینی کو دیکھتے ہوئے بات بننے کی اُمید نہیں۔

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

اُس پہ بن جائے وہ مجبور ہو جائے۔ کہتے ہیں اے جذبۂ دل میں اُسے بلاتا تو ہوں لیکن اس بلانے کی بات رکھنا تیرے ہاتھ ہے اب تو اُسے ایسا مجبور کر دے کہ آتے ہی بنے۔ مصنف کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

معشوق کمسن کا ظلم بھی میرے لئے باعثِ راحت ہے لیکن چونکہ وہ میرے ستانے کو ایک کھیل سمجھ رہا ہے اس لئے خوف ہے کہ کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے کاش یوں بھی ہو کہ اُسے اس میں ایک دل بستگی ہو جائے کہ مجھے ستانے کے بغیر چین نہ آئے۔

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

رقیب کو جو تو نے خط لکھا ہے اُسے وہ اس طرح کھلا ہوا لئے پھرتا ہے کہ اگر کوئی پوچھ بیٹھے کہ یہ کیا ہے تو چھپا بھی نہیں سکتا یعنی تو نے ایک اوچھے کو خط لکھ کر اپنی رسوائی کا سامان کیا۔

اس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئیں تو اُنھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

اگر ان کے حسن سلوک کی بدولت ملنا ممکن بھی ہو تو کیا فائدہ بُرا ہو اس نزاکت کا کہ ہاتھ آنے پر بھی انھیں ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ طرزِ بیان دیکھئے کہ یہاں مصنف نے نزاکت کو کوستے ہوئے نزاکت کی تعریف کی ہے۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے؟
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

اس نے یعنی جس کی یہ جلوہ گری ہے۔ کہتے ہیں کہ عالمِ وجود کو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کس کی جلوہ گری ہے کیونکہ اُس نے تو ایسا پردہ چھوڑا ہے یا ایسے حجاب ڈال دیئے ہیں جنھیں اُٹھایا نہیں جا سکتا اس لئے اگر ہم کہیں کہ یہ سب اس کی جلوہ گری ہے تو کور باطنوں کو سمجھائیں کیونکر۔

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

اس شعر کی نثر یوں ہو گی تم کو تو بلائے نہ بنے اس لئے چاہوں کہ نہ آؤ اب موت ہی کی راہ نہ دیکھوں جو بن آئے نہ رہے یعنی میری خوشی تو یہ تھی کہ تمہیں بلاؤں اور تم آؤ لیکن تمہارا آنا ممکن نہیں اس لئے ایسی تمنا کر کے کیوں اوقات ضائع کروں اور جب تمہارا ملنا ہی ناممکن ہے تو مجھے ایسی نامراد زندگی سے مرجانا بہتر ہے اس لئے اب موت ہی کی راہ نہ دیکھوں جس پر ناکام زندگی کا انحصار ہو گیا ہے اور جس کا آنا یقینی بھی ہے بس اسی موت کی آمد کا یقین اپنی پرمصیبت زندگی میں مجھے وجہ راحت ہو گا۔

(ناطق) کٹ جائے انتظارِ اجل ہی میں زندگی
وہ دن کوئی بتائے تو میں دن گنا کروں

مصنف نے اس شعر کو الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھا دیا جن میں خصوصاً "تو" کا استعمال تو بڑی ہی زیادتی ہے مگر لطف دیکھئے کہ یہاں نہ کوئی فارسی کا اجنبی لفظ لکھا ہے نہ کوئی فارسی ترکیب ہے۔

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

یہ نظم نثر سے اومنع ہے اسی کو سہلِ ممتنع کہتے ہیں۔ مصنف کا یہ شعر مشہور بھی بہت ہے۔ آن پڑا اب متروک ہے۔ آپڑا ہے لکھنا چاہئے۔ میں اس سے ملتا ہوا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔

(ناطق) ضعف ہے ماتمِ حسرت مرحوم افسوس
ہم تھکے بیٹھے ہیں اور آ کے پڑا کام ابھی

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

عشق کوئی اختیاری چیز نہیں یہ تو وہ آگ ہے جسے کوئی لگانا چاہے تو لگ بھی نہیں سکتی اور بجھانا چاہے تو بجھے بھی نہیں۔

(ناطق) لگی نہ آتشِ الفت کہیں نہ ان سے بجھے
بہت حریف لگائی بجھائی کرتے رہے

(۱۸۹)

چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے
صبح کی مانند زخمِ دل گریبانی کرے

شعرا طلوعِ مہر کو گریبان سحر کے چاک ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔

(ناسخ) مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

کہتے ہیں اگر بہ عالمِ عریانی وحشت چاک گریباں کی متمنی ہو تو آفتابِ زخمِ دل سینہ کو گریبانِ سحر کی طرح چاک کرکے نکل آئے۔

(ناطق) جنوں کی رونمائی ہو گئی چاک گریباں سے
وہاں سے ہم نکل آئے جہاں سے آستیں نکلی

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجے خیال
دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

تیرے جلوے سے چشمِ ظاہر کا حیراں ہونا تو درکنار اس کا تو وہ عالم ہے کہ جس کا خیال کرنے سے دیدۂ دل نہ صرف حیراں بلکہ زیارت گاہِ حیرانی بن جائے۔
منشی معشوق حسین صاحب اطہر ہاپوڑی کا جو ایک کاملِ فن شاعر تھے یہ خیال ہے کہ اب "کیجے" لکھنا درست نہیں اس کی جگہ "کیجیے" ہونا چاہیے۔ مگر میرے نزدیک ایسا لکھنا یا بولنا قابلِ گرفت نہیں۔

ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک
آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

غم و الم کو پہاڑ سے تعبیر کرتے ہیں جن کی کثرت ہمیشہ ہمت شکن ہوتی ہے اور دل شکنی سے ناامیدی کی ابتدا ہے جس کی بدولت رنج و اضطراب کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو وجہ گراں جانی ہے۔ کہتے ہیں کہ اب تو ٹوٹ جانے سے بھی دل کو مایوسی ہو گئی یا اللہ کب تک یہ آبگینہ اپنی گراں جانی کو کوہِ غم پر پیش کرے جو ہمیشہ اس سے ٹکراتا ہے اور ٹوٹتا نہیں۔ مصادرِ فارسی کا استعمال اب اردو شاعری میں مفرد جائز نہیں۔

میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پائے شکست
موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

اگر چشمِ مستِ ناز سے میکدہ کو شکست ہو جس کے معنی ٹوٹ جانے کے ہیں تو بھی ٹوٹے ہوئے بال دیدۂ ساغر کی مژگانی کے کام آئے اس طرح بہ شکست بھی چشمِ مست کا پورا عکس بن کر مستی افزا ہو۔ ایک تکلف ہے۔

خطِ عارض سے لکھا ہے۔ زلف کو الفت نے عہد
یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

خطِ عارض ایک عہد نامہ ہے جس میں رسمِ الفت نے زلف کو لکھ دیا ہے کہ وہ جو کچھ بھی پریشانی کرے سب یک قلم منظور۔

(۱۹۰)

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
مگر یہاں تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

یہ عالمِ اضطراب یہ تو ممکن ہے کہ وہ خواب میں آئے اور تسکین دے لیکن یہاں دل کی بیتابی کہیں ہمیں سونے بھی تو دے۔

(ناطق) خواب میں آپ تو آجائیں گے حسبِ وعدہ
یہ تو کہیے کہ شبِ غم کیسے خواب آئے گا

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

یہاں آبِ اشک کو آبِ تیغ بنایا ہے۔ کہتے ہیں تیرا لگاوٹ میں رو دینا تیغِ نگہ کو آب دینا ہے جس سے تو عشاق کو قتل کر ڈالتا ہے دوسرے مصرعہ کا ماحصل یہ ہے کہ تیری طرح کسی کو مل کر مارنا نہیں آتا ہے

کون یہ دیکھ سکے کوئی حسین روتا ہے
ہو بناوٹ سے بھی رونا تو قلق ہوتا ہے

دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

ہم نیم جاں لبِ جاں بخش کے بوسہ کے طلبگار ہیں اور تو خاموش یہ بھی کوئی بات ہے اس وقت یا تو بوسہ ہی دیدے کہ جی بچیں یا اگر یہ منظور نہیں تو صاف جواب دیدے کہ جس سے بہ عالم یاس ہمارا کام تمام ہو کر دوسری طرح نیم جانی سے نجات ہو۔

پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

ساقی اگر تجھ کو ہم سے نفرت ہے اور ہمارے ہاتھ میں جام دینے سے چھوت ہوتی ہے تو اچھا اوک ہی سے پلا دے محرومِ مے تو نہ رکھ۔

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

پاؤں دابنا گو ایک ذلیل خدمت ہے لیکن معشوق نے اس کا بھی جو مجھے حکم دیا تو

خوشی کے مارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ یا یہ کہ معشوق کے پاؤں دابنے کی خدمت ہے جس سے خوشی کے مارے عاشق کے ہاتھ پاؤں پھول جانا ہی چاہئے۔ یا یہ کہ یہ ایسی بڑی خوش وقتی کی اجازت ہے جس کی ناگہانی اطلاع سے ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

(۱۹۱)

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے

میرا سر تکیہ کے لئے آزار اور میرا جسم بستر کے لئے بار ہے کیونکہ میرے تڑپنے نے بستر کے ہر تار کو وقفِ کشمکش کر رکھا ہے۔

(غالب) خوابِ جمعیتِ مخمل ہے پریشاں مجھ سے
رگِ بستر کو ملی شوخیِ مژگاں مجھ سے

سرشکِ سر بہ صحرا دادہ نور العین دامن ہے
دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

شورشِ عشق کے لئے طوفانِ گریہ اور اضطرابِ دل کی ضرورت ہے لیکن یہ اپنی بے بسی کا عالم بتاتے ہیں کہ سرشک جس کی صفت سر بہ صحرا دادہ ہونا چاہیے طفلِ اشک ہو کر نور العین دامن بنا ہوا ہے اور دل جسے شوریدہ ہونا چاہیے تھا بہ عالمِ بے دست و پائی برخوردارِ بستر ہو کر پڑا ہے۔ کہاں ہیں مراعات النظیر سے گھبرانے والے اور مناسبات کو اپنی نا اہلی کی بدولت برا سمجھنے والے۔ یہاں پوری ردیف بغیر قافیہ کے پہلے مصرع میں آ گئی حالانکہ ردیف کے آخری ٹکڑے کا بھی پہلے مصرعہ میں لانا عیب ہے۔

خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

میری بیماری کا بھی کیا اچھا اقبال ہے کہ تم عیادت کو آئے ہوا سے تو یوں

کہنا چاہیے کہ گویا فروغِ شمعِ بالیں مریضِ بستر کا طالعِ بیدار ہے۔ یا یہ کہ تم خود شمعِ بالیں ہو کر اپنے فروغِ حسن سے صاحبِ فراش کے طالعِ بیدار ہو۔

یہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

محشر روزِ اضطراب ہے صبحِ محشر کا آفتاب اپنی تپش سے اضطرابِ حشر میں اضطرابِ مزید کا سبب ہو گا کہتے ہیں جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی کی طوفان گاہ میں آفتابِ صبحِ محشر کی ایک شعاع ایک تارِ بستر ہے یعنی دیگر وجوہِ اضطراب میں سے ایک تار کے برابر یہ بھی ہے جن سب کے مقابلے میں اضطرابِ حشر کی کوئی ہستی باقی نہیں رہتی۔ یہ شعر پورا کا پورا فارسی کا ہے صرف ایک لفظِ "ہے" لاکر مصنف نے اردو بنا دیا اب اردو شاعری اسے پسند نہیں کرتی مزید یہ کہ اس میں اول سے آخر تک اضافتوں کی بھرمار ہے۔

ہنوز آتی ہے بو بالش سے اُس کی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

ابھی کل ہی کی بات ہے کہ وہ ہمارے بستر پر محوِ خوابِ استراحت تھا چنانچہ اُس کے زلفِ مشکیں کی بو ہنوز تکیہ سے گئی نہیں اور دماغ میں سمائی ہوئی ہے ایسی حالت میں یوسفؑ کے خواب ہم کیونکر دیکھ سکتے ہیں خوابِ زلیخا تو ہمارے لئے عارِ بستر ہوگا۔ میں کیا بتاؤں مصنف کے اس شعر میں کیا ہے جس نے کئی بار میری آنکھوں کو پُرنم کیا۔

(طالب)	ہم آغوشِ تصور دارم آں یارِ دل آرا را
	خجل وارد شب بے خوابیم خوابِ زلیخا را

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالب
کہ بیتابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

ہجرِ یار میں بیتابی کی بدولت میرا یہ عالم ہے جیسے کوئی کانٹوں کے بچھونے پر ہو۔

(۱۹۲)

خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جائے
غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے

رگ گردن رگِ جان کو بھی کہتے ہیں جس کے لئے قرآن میں حبل الورید آتا ہے اور رگ گردن کا استعمال بمعنی نخوت بھی ہوتا ہے جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے۔

(غالب)	لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
	موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

مصنف نے یہاں ایک رگ کو پکڑ کر دونوں مفہوم نکال لئے ہیں۔ کہتے ہیں مجھے ڈر ہے کہ رشتۂ الفت جو مضبوط ہوتا جا رہا ہے رگِ جان نہ ہو جائے اور چونکہ رگِ جاں رگ گردن ہو کر علامتِ غرور بن جاتی ہے جو ایسی بلا ہے کہ دوستی میں مجھے پسند نہیں اس لئے ڈر ہے کہ یہی رشتۂ الفت مستحکم ہوتے ہوتے تیری دشمنی کا باعث نہ ہو اور عاشق کی تباہی کا سامان نہ بن جائے۔

(غالب)	اسد یہ عجز و بے سامانیِ فرعون توام ہے
	جسے تو بندگی کہتا ہے دعوائے خدائی ہے

سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما غالب
اگر گل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

سرو کو آزاد باندھتے ہیں کہ نہ تو بہار کا اس پر اثر ہوتا ہے نہ خزاں کا اور نہ اس میں پھول پھل آتے ہیں یعنی ہمیشہ یہ درخت ایک ہی حالت میں رہتا ہے۔ اردو کی ایک مثل ہے کہ "ساون سوکھے نہ بھادوں ہرے" اور فصل بہار موسم نمو ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر اس فصل میں سرو ہی پر اتنے پھول نہ آئیں کہ اُن سے وہ سر سے پاؤں تک ڈھک جائے تو سمجھو کہ کچھ بھی نشو و نما نہ ہوا یا یہ کہ گلاب کا پھول اگر اپنے تن و توش میں اتنا بڑا نہ ہوا کہ پورے سرو کا سرپوش ہو جائے تو سمجھو کہ اس فصل میں نشو و نما نے کوتاہی کی یعنی یہ کہ اب کی فصلِ بہار

ایسی ہے کہ جس میں نشو و نما کی بہت افراط ہے۔

(۱۹۳)

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

سوز کو برائے اثر ساز کی ضرورت ہے اس لئے اسے کسی لَے میں ہونا چاہیے لیکن نالہ یونہی مؤثر ہوتا ہے اس لئے فریاد کو کسی لَے کی پابندی نہیں۔ یا یہ کہ نغمہ سامانِ سرور ہے اس کے لئے تکلفات کی ضرورت ہوگی نالہ تو اس کی ضد ہے اس کے لئے تال و سُر کی کیا ضرورت ہے۔

کیوں بوتے ہیں باغبان تونبے؟
گر باغ گدائے مَے نہیں ہے

کدو کی وضع ظروف مے نوشی میں خاص ہے چنانچہ جب شراب ممنوع ہوئی ہے تو اس کے ساتھ چار قسم کے ظروف کا استعمال اسلام نے منع کیا تھا ان میں ایک کدو بھی ہے جس کو عربی میں دبا کہتے ہیں۔

(سعدی) بہ مے خانہ چند سنگ بر دن زدن
کدو را نشاندند و گردن زدند

فقیر کدو کے تونبے بنا کر اس میں بھیک مانگتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر باغ گدائے مے نہیں ہے تو باغبان کو تونبے بونے کی اور کیا ضرورت ہے۔

ہر چند ہر ایک شئے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شئے نہیں ہے

اگرچہ ہر شئے میں تو ہے لیکن تجھ سی کوئی چیز نہیں کیونکہ تو عالمِ اجسام سے منزّہ ہے۔

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

عالمِ ہستی کا ہر چند وجود نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں یہ کچھ بھی نہیں دیکھ کہیں کسی کے اشکالِ ظاہر کو بتانے سے دھوکہ نہ کھا جانا۔

(ناطق) کچھ نہیں جز وہم اشکالِ حوادث کا وجود
قیس اک دھوکے کی ٹٹی پردۂ محمل میں ہے

شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے
اُردی جو نہ ہو تو دَے نہیں ہے

"اردی" اور "دَے" دونوں ایرانی سال کے مہینے ہیں جن کا حساب اب یہاں دولت حیدر آباد فرخندہ بنیاد میں موجود ہے "اُردی" موسمِ بہار کا مہینہ ہے اور "دَے" خزاں کا۔ کہتے ہیں اگر تو چاہتا ہے کہ غم نہ ہو تو خوشی کے خیال کو دل سے نکال دے کیونکہ اگر بہار ہی کا وجود نہ ہو تو خزاں کا کھٹکا نہیں رہتا یہی مضمون پہلے یوں لکھ آئے ہیں۔

(غالب) حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

کیوں؟ ردِّ قدح کرے ہے زاہد؟
مَے ہے یہ مگس کی قَے نہیں ہے

شراب کے مقابلے میں جو افشردۂ انگور ہے شہد پر طعن کرتے ہیں جو مکھی کی قے ہوتا ہے۔ کہتے ہیں اے زاہد آخر تو شراب کے پیالہ کو نفرت سے واپس کیوں کرتا ہے اس میں تو بادۂ انگور ہے کچھ مکھی کی قے نہیں جس سے گھن آئے۔

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے؟ اے "نہیں ہے"

اے غالب تیری ہستی کیونکہ ہستیِ مطلق نہیں اس لئے اسے ہستی نہیں کہہ سکتے تو ایسا نہیں ہوا اور چونکہ تیرا وجود عدم محض بھی نہیں اس لئے اس پر کچھ عدم کا اطلاق بھی نہیں ہو سکتا اس لئے تو "ہے" ہوا۔ تو یاں اجتماع ضدین اسے نہیں ہے اب یہ تاکہ تو ہے کیا۔ بڑا اچھا طرزِ بیان ہے۔

(۱۹۴)

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

مرہم اہلِ زخم کے لئے وجہ راحت ہوتا ہے اور جراحتِ دلِ عشاق میں چونکہ درد وجہ راحت ہے اس لئے اس کے مرہم کا نسخہ ایسا ہے جو درد افزا ہو تو ریزۂ الماس اس کا جزوِ اعظم ہوا باقی اجزا جو مشک و نمک وغیرہ ہیں وہ بھی شامل کئے جاتے ہیں مگر کم۔

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بہ ظاہر نگاہ سے کم ہے

تیرے تغافل نے بہت دنوں میں جا کر ایک نگہ پیدا کی یعنی صورتِ التفات نکالی مگر وہ نگہ ایسی ہے جو بظاہر نگاہ سے کم ہے یعنی التفاتِ ظاہر گو پیدا نہیں ہوا لیکن تیرا جان کر تغافل کرنا جو تو نے شروع کیا یہی التفات ہے پہلے لکھ آئے ہیں۔

(غالب) جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

یہاں تجنیس لفظی سے یہ نکالا ہے کہ نگہ میں نگہ سے ایک الف کم ہے جیسا کہ پہلے لکھ آئے ہیں۔

(غالب) بنیم غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز
نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

(۱۹۵)

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں مگر تیری تمنا نہیں کرتے

تجھ پر مرتے ضرور ہیں تیرے بغیر مرے بھی جاتے ہیں مگر تیرے ملنے کی تمنا اس لئے نہیں کرتے کہ خود ہمیں اپنے اوپر رشک آتا ہے جو دل کو گوارا نہیں۔ ایک ایسا ہی شعر اور لکھا ہے۔

(غالب) دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے

در پردہ انھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے

محرم سے پردہ نہیں کیا جاتا اس لئے انھوں نے غیر سے ربطِ نہانی کو نباہنے کے واسطے یہ ظاہر کا پردہ بنایا ہے کہ وہ تو ہمارا محرم ہے محرم سے کیا پردہ یہی مضمون پہلے یوں لکھا ہے۔

(غالب) دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

یہ باعثِ نومیدی اربابِ ہوس ہے
غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

غالب عاشقِ صادق ہے اسے تو ایسی باتوں کی پرواہ نہیں لیکن اربابِ ہوس ان برائیوں کو سن کر ناامید ہو جائیں گے اور سمجھیں گے کہ جب ایسے فدائی ہی کی قدر نہیں تو ہم کس گنتی میں اس طرح تمہارے چاہنے والوں کی تعداد کم ہو جائیگی۔

(داغ) ان کے ہاتھوں سے ہی ذلت و خواری ہوگی
غیر اپنی تو خبر ہیں مجھے کیا کہتے ہیں

(۱۹۶)

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گل چیں ہے

بادۂ تاب تیرے لبِ رنگیں کے عکس سے تابِ فروغ حاصل کرتا ہے اور خطِ پیالہ سراسر گل چینِ باغِ حسن کے تارِ نظر کا کام دے رہا ہے جس سے چشمِ ساغر ترے گلِ رخسار کی بہاریں لوٹتی اور نور حاصل کرتی ہے۔

کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے
کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے

دل کی شوریدگی بربنائے شوق ہے جو تمنائے وصل میں سرگرداں ہے ایسی حالت میں ایک عمر گزر گئی کہ خوابِ استراحت میسر نہیں اور حسرتِ بالیں میں ہے جس کا بغیر تری غم خواری کے لطف نہیں کبھی تو اس شوریدگی کی داد دے اور کبھی تو میری حسرتِ بالیں نکلنے کا خیال کر۔

بجا ہے گر نہ سنے نالہ ہائے بلبلِ زار
کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

کان میں روئی بھرنا ثقلِ سماعت کا سبب ہوتا ہے۔

(سعدی) پنبہ ام در گوش کن تا نشنوم
یا درم بکشائے تا بیروں روم

پھول کو کان سے مشابہ کرتے ہیں اور شبنم سبزہ یا پھول پر گر کر اکثر روئی سے بھی مشابہ ہوتی ہے۔ کہتے ہیں اگر بلبلِ زار کے نالے پھول نہیں سنتا تو بیجا نہیں کیونکہ اس کے کان میں شبنم کی روئی بھری ہوئی ہے اس لئے معذور ہے شبنم نے اس کے کان بھر دئے ہیں۔ یہاں مجھے اپنا ایک گل و شبنم کا شعر یاد آیا جس کا مضمون اس سے مختلف ہے اور جس میں اربابِ زمانہ کی بدگوئیوں

کا جواب ہے۔

(ناطق) دیکھ لو اہلِ چمن رسوائی صبحِ بہار
کون سا گل ہے کہ جس پر قطرۂ شبنم نہیں

اسدؔ ہے نزع میں چل بے وفا برائے خدا
مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

اے بے وفا غالب کا آخر وقت ہے اب تو اسے چل کر دیکھ لے یہ تو حجاب کا موقع نہیں اس وقت تو تجھے پاسِ تمکیں نہ ہونا چاہئے یعنی چل بس اب ایسے بہانے نہ کر۔ یہ رسم ہے کہ کوئی اپنا اگر مر رہا ہو تو کہا کرتے ہیں کہ اب رنجش کا وقت نہیں۔ اس رسم کو انھوں نے یہاں معشوق سے خطاب کرتے ہوئے ترکِ حجاب و وداعِ تمکین سے بیان کر کے زور پیدا کر دیا۔

(۱۹۷)

کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل کیوں نہ ہو
یعنی اس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے

چشمِ معشوق چشمِ بیمار ہوتی ہے اور بیمار کو بعض اشیاء سے پرہیز کرنا لازم ہوتا ہے۔ کہتے ہیں اس بیماری میں نظارے سے پرہیز لازم ہے اس لئے چشمِ بتاں محوِ تغافل ہونے میں نہ صرف معذور ہے بلکہ اس پر مجبور ہے۔

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

آرزوئے دید وعدۂ قتل پر منحصر ہے لیکن اس میں مرتے مرتے جی بھر کر دیکھ لینے کی آرزو رہ جائیگی کیونکہ بدقسمتی سے اس کا خنجر ایسا تیز ہے کہ دم کے دم میں گلا کٹ جائے گا۔

(۲۱۳)

عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسد
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

جوششِ بہار اشتیاق انگیز ہے کیونکہ عارضِ گل کو دیکھ کر مجھے روئے یار کی یاد اور زیادہ ہوگئی۔ اب ایسے محل میں صرف "دیکھ" کا استعمال جائز نہیں "دیکھکر" لکھنا چاہیئے۔

(۱۹۸)

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیئے؟
ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیئے

نامہ بر نے جو ہمارا خط لے کر گیا تھا اگر معشوق کو دل دیدیا یعنی اسے دیکھکر عاشق ہوگیا تو اب اسے کیا کہیں کیونکہ ہمارا آدمی ہے اور آدمی کی یہ مجال نہیں کہ ایسے دیکھے اور دل بچالائے تو اب اگر وہ ہمارا رقیب ہوگیا تو ہونے دو ہمارا نامہ بر تھا ہم نے اسے بھیج کر دید کا موقع دیا اس میں اس کا کیا قصور ہے اور اب اس سے کیا کہیے۔

یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیئے؟

قضا سے بھی ہمیں کس قدر شکوہ ہے کہ کمبخت ایک دن آئے گی تو ضرور لیکن ضد دیکھیئے کہ آج یعنی شبِ فرقت میں آنے کو راضی نہیں ہوتی۔

(ناطق) شامِ غم کیوں آ نہیں جاتی کہ تھی موقع کی بات
موت پھر کمبخت کب آئیگی مرنے کے لئے

رہے ہے یوں گہ و بے گہ کہ کوئے دوست کو اب
اگر نہ کہیئے کہ "دشمن کا گھر ہے" کیا کہیے

کوئے دوست کو اب رقیب کا گھر نہ کہیں تو کیا کہیں کیونکہ وقت بے وقت جب دیکھو وہیں نظر آتا ہے۔

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہیئے؟

اس نے اپنی کرشمہ گری سے ہمیں یہ فریب دے رکھا ہے کہ تمہارا حالِ دل معلوم ہے تو اب کیا کہیئے یعنی ششش و پنج میں ہیں کہ کہیں یا نہ کہیں کیونکہ اگر کہیں تو بیوقوف بنتے ہیں اور اگر نہ کہیں تو یہ محض فریب ہے اصل میں اسے کچھ معلوم نہیں اور بالآخر ہم پر یہ الزام آئے گا۔ ع جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر "بغیر" کا مخفف "بن" اب بولا جاتا ہے نہ لکھا جاتا ہے۔

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ سرِ رہ گزر ہے کیا کہیئے؟

پہلے وضع شرفا یہ تھی کہ سرِ رہ گزر گفتگو کرنے کو عیب سمجھتے تھے چنانچہ شاہِ اودھ اور میر تقی کا قصہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں۔ یہ اپنے معشوق کی عیاری بیان کرتے ہیں کہ وہ اس لئے بازار میں پرسشِ حال کرتا ہے کہ میں کہہ دوں "سرِ رہ گزر ہے کیا کہیے" اور اس پر بات نہ رہے۔

(ناطق) چلئے گزر رہی ہے بہرحال زندگی
اب رہ گزر پہ بیٹھ کے قصہ سنائے کون

تمہیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہیئے؟

یہاں رشتۂ وفا کو جسم مجسم غیر مرئی ٹھہرایا ہے۔ کہتے ہیں ہماری جو مٹھی بند ہے اس میں کوئی چیز ہے مگر اب تم سے کیا کہیں کیونکہ تمہیں تو سر رشتۂ وفا کا خیال ہی نہیں یا اگر کہیں کہ اس میں وہ چیز ہے تو مٹھی کھول کر بتائیں کیا۔ یا یہ کہ معشوق سے پوچھتے ہیں ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر کیا ہے کہیے اور بتایئے اور جو چیز ہے اس کا نام لے کر خیال دلا دیا جیسے امیر خسروؒ کی پہیلی ہے کہ چوری کی یا خون کیا اس کا سر کیوں کاٹ لیا۔

یا انھیں کی یہ پہیلی کہ "بالا تھا تو سب کو بھایا بڑا ہوا تب کام نہ آیا بتا دیا ہے اس کا نام۔

انہیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیئے
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیئے؟

انھیں ہمارے سوال پر دیوانے کی بڑ کا خیال ہوتا ہے اور ایسا ہی جواب دیتے ہیں اس لئے ہم جواب سے قطع نظر کرتے ہیں اس میں کہنا کیا اور جھگڑا کس بات کا۔

(ناطق) ملتا ہے جواب اب تو نہ ہاں کا نہ نہیں کا
ہر بات پہ کہتے ہیں وہ دیوانہ کہیں کا

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجیے؟
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیئے؟

کمالِ سخن کی یہ سزا ہے کہ لوگ حسد کرتے ہیں اور متاعِ ہنر کی یہ قیمت ہے کہ زمانہ اہلِ ہنر کا دشمن ہو جاتا ہے تو اب بہ عالمِ مجبوری کیا کہیئے اور کیا کیجیے۔ یا یہ کہ جب کمال کمالِ سخن کی سزا ہے تو کیا سخن گوئی کیجیے اور متاعِ ہنر کی قدر و قیمت جفا ہے کہ زمانہ دشمنِ اہلِ کمال ہوتا ہے تو کیا اظہارِ کمال کریں فرمایئے۔

کہا ہے کس نے کہ غالب برا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیئے

کون کہتا ہے کہ غالب برا ہے ایسا نہیں اس کے سوا اسے کیا کہہ سکتے ہیں کہ ذرا سرپھرا ہے۔

(۱۹۹)

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

دامن افشانی تعلقاتِ دنیوی سے بیزاری۔ عریانی بمعنی مجاز یعنی وہ حالت جو تعلقات کا لباس اتار دینے کے بعد حاصل ہو تن یا جسمِ ظاہر بھی تعلقاتِ دنیوی میں سے ہے۔ کہتے ہیں میری عریانی نے جو یہ دیکھا کہ میں در پردہ تعلقات کے لباس کو اتار کر پھینک رہا ہوں تو اس نے یہ ستم کیا کہ مجھے جسمِ عریاں سے وابستہ کر گئی یعنی میں بہ مجبوری اس کا پابند ہو کر رہ گیا۔ حقیقی عریانی جس کی تمنا تھی حاصل نہ ہو سکی کہ جسم میں جسمِ عریاں مجھ سے دور ہو جاتا۔

(ناطق) اب کہاں تر دامنی یا پاک دامانی مری
سب جھٹک کر پھینک آئی دامن افشانی مری

(ولہ) رہتے ہیں دور زندگیٔ مستعار سے
ہے کس کی جستجو میں فنا ہم یہاں نہیں

(فارسی) مرغِ الہی ز قفس پر شدہ
قالبش از قلب سبک تر شدہ

بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں
مرحبا میں، کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے

سنگِ فساں سان کا پتھر جس پر رگڑ کر ہتھیار تیز کئے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں تیغِ نگاہِ یار مجھ پر برابر رہتی جا رہی ہے لیکن گراں جانی کی بدولت مرتا نہیں تو یہ گراں جانی مجھے کتنی مبارک ہے اور میں کیا خوش قسمت ہوں کہ نگاہِ یار سے میرا ایک دائمی واسطہ قائم ہے۔

کیوں نہ ہو بے التفاتی؟ اس کی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محوِ پرسشہائے پنہانی مجھے

میری ظاہری بے التفاتی سے خاطر جمع ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ میں محوِ پرسشہائے پنہاں ہوں اس لئے بے التفاتی کرتا ہے اگر اسے یہ معلوم ہوتا کہ میری بے التفاتی ترکِ محبت کی بنا پر ہے تو ضرور التفات کرتا کیونکہ کسی کا دامِ الفت سے نکل جانا معشوقوں کو گوارا نہیں ہوتا۔

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

کاتبِ تقدیر نے جن اشیاء کو میرے گھر کے لئے اسبابِ ویرانی میں لکھا ہے ان میں سے ایک میرا وجود بھی ہے یعنی میں خود بھی اپنی خانہ ویرانی کا سبب ہوں۔

(ناطق) ابھی فرصت کہاں اہلِ وطن صحرائے غربت سے
اُجڑنے دو بنا لینا ہمیں کاشانہ آتا ہے

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاش کے
اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے

کہتے ہیں کاش میرے دل کو نوائے مُرغِ دبستاں کا ذوق نہ ہوتا جو بر بنا رہمر نگیِ درد ہے بقول شاعر

آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

کیونکہ وہ کافر اس سے بدگمان ہوتا ہے اور مجھے شیدائے نوائے بلبل سمجھتا ہے یہی مضمون پہلے لکھ آئے ہیں۔

(غالب) کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

(دیگر) اشک ہم طرحِ و دردِ اثرِ بانگِ حزیں
نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہم کو

وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

شورِ ہستی سے گھبرا کر میں کنجِ گور میں آرام کی نیند سونے گیا تھا لیکن افسوس ہے وہاں بھی شورِ محشر نے دم نہ لینے دیا اور پھر سے اُٹھنا پڑا۔

(ناطق) ابھی ہم جانِ دیگر سوئے ہیں دم لیکے اٹھیں گے
نہ چھیڑ اے شورِ محشر ہٹ ذرا آرام لیتے ہیں

(مومن) خیالِ خواب راحت ہے علاج اس بدگمانی کا
وہ کافر گور میں مومن مرا شانہ ہلاتا ہے

(سودا) سودا کی جو بالیں پہ اُٹھا شورِ قیامت
خُدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے در کی دربانی مجھے

تم نے جو آنے کا وعدہ کیا ہے تو میں اپنے دروازہ پر راستہ دیکھنے کھڑا ہوں اس تاخیر کا بھی کیا انداز ہے اجی مہربانی کر کے کہیں جلدی آیئے اور مجھے اس دربانی سے نجات دلایئے۔ آج کل کی اردو میں "کیجے کے ساتھ" "تم نے" نہیں بولا جاتا۔ "کیجیے کے ساتھ" آپ نے لکھا جائے گا اور تم نے کے ساتھ کرو۔

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ واہ
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزلخوانی مجھے

ہاں اے نشاطِ فصلِ بہاری تو بھی کیا مبارک ہے کہ تیری آمد سے میرے سر پہ پھر غزلخوانی کا جنون سوار ہو گیا۔ یا مجھ سا بلبلِ باغِ سخن پھر چہچہانے لگا۔ اسی مضمون سے ملتا ہوا مصنف کا یہ شعر ہے۔

(غالب) پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالب یوسفِ ثانی مجھے

میرزا یوسف برادر مصنف۔ از سرِ نو زندگی ہونا ایسی بیماری کے بعد تندرستی کو کہتے ہیں جس میں صحت کی امید باقی نہ رہ گئی ہو میرزا یوسف کی تندرستی از سرِ نو زندگی ہوئی۔ یہاں یوسفِ ثانی کا استعمال اس معنیٰ میں بھی ہے کہ گو یہ وہ یوسف تو نہیں لیکن مجھے ایسا ہی عزیز ہے جیسے حضرتِ یعقوبؑ کو حضرتِ یوسفؑ اس لئے

اس کی تندرستی میری زندگی ہوگئی۔ یا یوسفِ ثانی کا یہ مطلب ہے کہ پھر سے جو زندگی ہوئی تو گویا یہ خدا نے دوسرا مرزا یوسف مجھے بخشا۔

(۲۰۰)

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے
سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے

ہنگامۂ یارب فارسی میں شورِ فریاد کا مرادف ہے اور یوں بھی مصیبت میں خدا یاد آتا ہے۔ سبحۂ زاہد کی تسبیح ذکرِ خفی سے مراد ہے جو زیرِ لب ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ میں خوشی میں بھی ہنگامۂ یارب کو بھولا نہیں ہوں چنانچہ میرا خندۂ زیرِ لب بھی جو علامتِ شادمانی ہے لبوں کے یارب آشنا ہونے کی وجہ سے سبحۂ زاہد بنا ہوا ہے کہ اس میں بھی وہی ہنگامۂ یارب موجود ہے۔ ایک تکلف ہے۔

ہے کشادِ خاطرِ وابستہ درِ رہنِ سخن
تھا طلسمِ قفلِ ابجد خانۂ مکتب مجھے

مکتب خانہ جہاں میں نے تعلیمِ سخن حاصل کی ہے وہ میرے لئے قفلِ ابجد کا طلسم تھا کہ سخن کو ملا دینے سے خاطرِ وابستہ کو کشاد حاصل ہوئی یعنی میری کشودِ خاطر فنِ سخن کی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ جب میں مضامینِ سخن کو جوڑنے کے لئے بیٹھتا ہوں تو ذہن کا پھیر اکھل جاتا ہے جس طرح قفلِ ابجد کی پھرکیوں کو جوڑنے سے قفل کھلتا ہے۔ اس قفلِ ابجد کو پہلے یوں کھول آئے ہیں۔

(غالبؔ) تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے
رشک آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

اہلِ زنداں کی آشفتہ خاطری ظاہر ہے۔ کہتے ہیں میں اپنی اس کمالِ آشفتگی کی کس سے

داد چاہوں کہ جس کے مقابلہ میں اب مجھے زندانیوں کی آسائش پر بھی رشک آتا ہے۔

(ذوقؔ) پابندِ جوں دُخاں ہیں پریشانیوں میں ہم
یارب ہیں کس کی زلف کے زندانیوں میں ہم

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں؟
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

میری کوئی آرزو بر نہیں آتی اس پر بھی آرزو کرتا ہوں اس کا سبب یہ نہیں کہ میں کسی آرزو برآری کے لئے آرزو کرتا ہوں بلکہ طبیعت لذتِ حسرت کی مشتاق ہے اس لئے شکستِ آرزو کے لئے آرزو کرتا ہوں کہ ہمیشہ لذتِ حسرت اُٹھاتا رہوں۔ دیکھئے اس کی شرح۔

(غالبؔ) نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

دل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

مرزا غالبؔ جو مجھے عشق بازی سے منع کرتے تھے وہ خود بھی دل لگا کر اسی دل لگی کے شکار ہو گئے۔

(۲۰۱)

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

دربارِ شاہی ایک چمن ہے جہاں کے بلبلانِ خوش نوا اہلِ سخن ہیں یہ درباری غزل ہے جہاں سخن سے تقابلِ سخن مدنظر تھا اسی قسم کا مصنف نے ایک دوسرا مطلع بھی لکھا ہے۔

(غالبؔ) بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

(217)

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

قیس و فرہاد کا مقام تو یہ ہے کہ ان کی آزمائش قد و گیسو کے عشق سے کی جاتی ہے لیکن ہم ایسے مقام پر ہیں جہاں یہی آزمائش دار و رسن سے ہوتی ہے۔

(ناطق) مبارک ہے انا الحق کو شکست اربع عناصر کی
مبارک دارو گیرِ شوق میں منصور ہو جانا

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

نیروئے تن طاقتِ جسمانی۔ فرہاد سے پہلے کوہکنی کا کام لیا گیا جسے نیروئے تن کی آزمائش کہتے ہیں اس کے بعد جاں بازی کے حوصلے کے امتحان کا وقت آئے گا یعنی جب جوئے شیر لانے کا کام ہو چکے گا تو پھر اس کی آزمائش کی جائے گی کہ شیریں کی خبرِ مرگ سن کر جان پر کھیلتا ہے یا نہیں۔

(غالب) تیشہ بیں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہی آشفتہ سروں وہ جواں پیر بھی تھا

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پاؤں
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی؟
اسے یوسفؑ کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

نسیم مصر جو حضرتِ یوسفؑ کی بوئے پیراہن کو حضرت یعقوبؑ تک لے چلی ہے اس سے کچھ یہ مطلب نہیں کہ وہ پیرِ کنعاں کی ہوا خواہ ہے بلکہ فی الحقیقت یوسفؑ کے بوئے پیراہن کی آزمائش کرنا منظور ہے اسے یہ دیکھنا ہے کہ یہ وہاں جا کر کیا گل کھلاتی ہے۔

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

اے اہلِ انجمن دیکھو ہوشیار ہو جاؤ وہ غارت گرِ صبر و شکیب محفل میں آ رہا ہے پھر ایسا نہ کہنا کہ کسی نے جتایا نہ تھا اور بے خبری میں لوٹ لے گیا۔

رہے دل ہی میں تیر اچھا جگر کے پار ہو بہتر
غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

ہمیں تو بتِ ناوک فگن کی نشانہ بازی دیکھنا ہے اس کی پرواہ نہیں کہ تیر جگر کو چھید ڈالے گا یا دل میں پیوست ہو جائے گا جو کچھ ہو جائے سب ٹھیک ہے۔

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

نہ تسبیح میں کچھ رکھا ہے نہ زنار میں اصلیت یہ ہے کہ ان ذرائع سے شیخ و برہمن کی وفاداری کی آزمائش کی جا رہی ہے۔ پہلے اسی مضمون کو یوں لکھ آئے ہیں۔

(غالب) وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

پڑا رہ اے دلِ وابستہ بے تابی سے کیا حاصل؟
مگر پھر تابِ زلفِ پرشکن کی آزمائش ہے

اے میرے پھنسے ہوئے دل تو نے بارہا زلف کے پھندے سے تڑپ کر نکلنے کی کوشش کی مگر کبھی کامیاب نہ ہوا اب کیا اس کی گرفت کی آزمائش کرتا ہے۔ چپ پڑا رہ۔

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو؟
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

گھبراتے کیوں ہو ابھی تو دہان و حلق ہی کی تلخی سے طاقتِ ضبط کی آزمائش ہو رہی ہے جب زہرِ غم رگ و پے میں اترے گا تو پھر کیسی حالت ہوگی۔

(ناطق) ابھی تو تلخیِ ایام پر ہم صبر کرتے ہیں
یہ کڑوے گھونٹ دیکھیں حلق کے کب تک اترتے ہیں

وہ آئیں گے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالبؔ
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

وہ آئیں گے مرے گھر استفہامِ انکاری ہے یعنی کیسا؟ وعدہ وہ میرے گھر کیا آئیں گے۔ اے غالب وہ تو اس وعدہ سے چرخِ کہن کی نئے فتنوں میں آزمائش کر رہے ہیں۔ انھیں دیکھنا یہ ہے کہ انتظار میں مجھے کن کن تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور فتنہ ایجاد چرخِ کہن جو دشمن عیش ہے اس خوشخبری سے چڑ کر میرے لئے کیسی کیسی نئی مصیبتوں کا سامان پیدا کرتا ہے۔

(۲۰۲)

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

اگر وہ کبھی میرے ساتھ بھلائی بھی کرنا چاہتا ہے تو سابقہ جفاؤں کی شرم آکر مانع ہو جاتی ہے۔

(ناطق) ستم ہے ستم اب جو یاد آ رہے ہیں
ملے ہیں تو مل کر وہ شرما رہے ہیں

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

یا اللہ جذبۂ دل کی بھی کیا تاثیر الٹی ہے کہ میں اسے جتنا کھینچتا ہوں اتنا ہی وہ مجھ سے کھنچتا جاتا ہے یعنی دور ہوتا جاتا ہے۔

وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

عبارت مختصر قصہ کوتاہ۔ کہتے ہیں وہ یعنی معشوق جس کو داستانِ عشق سنانا مقصود ہے ایسا بدخو ہے جسے دو باتیں سننے کی بھی تاب نہیں اور میری داستانِ عشق ایسی طولانی ہے جس کے سننے سے قصہ کوتاہ اور کوئی تو کیا قاصد بھی جو انھیں باتوں کے ٹکڑے کھاتا ہے گھبرا جاتا ہے تو اب خود اس سے اس کے سن لینے کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ یا مجھ سے میری پیغامبری سے۔ مطلب یہ کہ قاصد کو اس بات کا بھی علم ہے کہ معشوق بدخو ہے وہ یہ سب نہیں سنتا اور یہ بھی جانتا ہے کہ میری داستانِ عشق شیطان کی آنت ہے المختصر یہ کہ قاصد بھی میری پیغامبری کا نام سن کر گھبرا جاتا ہے اور جانے کو راضی نہیں ہوتا کہ اسے یہاں بک بک میں مغز کھپا کر بڑا اخفش بننا اور وہاں جا کر گالیاں کھانا منظور نہیں۔ خوب طرزِ ادا ہے۔

اُدھر وہ بدگمانی ہے اِدھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

انھیں وہ بدگمانی ہے کہ اسے گھمنڈ ہو گیا ہے بات نہیں کرتا اس لئے وہ میری بات پوچھنا نہیں چاہتے اور مجھے یہ ناتوانی ہے کہ منہ سے بول نکلنا دشوار ہے اس لئے خود عرضِ مدعا نہیں کرتا کیونکہ اپنی طرف سے بات چھیڑنے میں طولِ کلام اور حسنِ بیان کی ضرورت ہے جس کی یہاں طاقت نہیں اگر وہ خود پوچھ لیتے جو التفات کی علامت ہے تو دو باتوں میں کام چل جاتا اور یہی کہنا کافی ہوتا کہ "فرطِ الم سے ایسا ناتواں ہوں کہ بولا بھی نہیں جاتا۔

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

ناامیدی ترکِ آرزو کا سبب ہوتی ہے۔ زورِ ناامیدی نے انھیں بیکلی دی ہے جس میں یہ عالم ہے کہ حصولِ مدعا سے مایوس ہو جانے کے بعد یہاں تک نوبت آگئی

219

کہ خیالِ یار بھی دل کے ہاتھ سے نکلا جاتا ہے اس پر کہتے ہیں لے ناامیدی یہ کیا قیامت ہے ذرا تو سنبھلنے دے کہ اسے مضبوط پکڑ لوں چاہے میرا کوئی بھی حشر ہو لیکن خیالِ یار کا دامن ہاتھ سے نکل جانا مجھے گوارا نہیں۔

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

گو میں بھی نظارگی سہی لیکن بے تکلف کہتا ہوں یہ ظلم تو مجھ سے نہیں دیکھا جاتا کہ وہ رونمائی پہ مجبور کیا جائے اور اس کے گلِ رخسار پر بارِ نگاہ پڑے اس مضمون کے مصنف نے بہت شعر لکھے ہیں جنھیں دوہرایا بھی جا چکا ہے۔

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

لڑائی کا یہ عالم ہے کہ پاؤں اکھڑے جاتے ہیں اور پاؤں کا یہ حال ہے کہ پہلے وار میں بیکار ہو چکے۔

(غالب) زخمی ہوا ہے پاشنا پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نے اقامت کی تاب ہے

(ناطق) نہ غم سے جائے قرار حاصل نہ ہم کو راہِ فرار حاصل
نہ عزم کی ہمت نہ رم کی طاقت نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن

(ناطق) زندگی مجھ سے خفا موت کے دروازے بند
اب کہاں جاؤں کہ رستہ نہیں ملتا مجھ کو

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

جس کافر کو دمِ رخصت خدا حافظ کہنا بھی مجھے گوارا نہیں کیسے غضب کی بات ہے کہ وہ مدعی کا ہم سفر ہو اور مجھے اسے غیر کو سونپنا پڑے۔

(ناطق) مہرِ لب رشک ہے کیا کہیے مجھے رسمِ وداع اُن کو اللہ نگہبان کہوں یا نہ کہوں

(۲۰۳)

زبس کہ مشقِ تماشہ جنوں علامت ہے
کشاد و بستِ مژہ سیلی ندامت ہے

جنوں یہاں بمعنی لغویت ہے کسی نامعقول فعل کو کر کے جب ندامت ہوتی ہے تو اہلِ غیرت منہ پیٹ لیتے ہیں۔ کہتے ہیں مشق تماشائے عالم علامتِ جنوں ہے جس پر بہ عالم دید کشاد و بست مژہ کی سیلی ندامت یعنی طمانچے پہ طمانچے پڑ رہے ہیں۔

نہ جانوں کیوں کہ مٹے داغ طعنِ بد عہدی؟
تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

تجھ پر داغ طعنِ بد عہدی ہے کہ تو نے عہد الست کو توڑا اب جو تو اس کلنک کے ٹیکے کو مٹانے کے لئے آئینہ دیکھتا یعنی اپنی ہستی کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو پھر مقصدِ اصلی کو بھول کر خال و خد کی اصلاح میں مشغول ہو جاتا ہے جس کے سبب سے تو نے آئینہ کو بھی ورطۂ ملامت بنا لیا ہے کہ اس سے مزید بد عہدی کی طرف قدم اُٹھتا ہے خدا جانے بایں غفلت شعاری یہ داغ کیونکر مٹ سکے گا۔

(ناطق) جو خدا کی تجھکو نہیں خبر خودی جو خودی از رنگ میں مست ہے
اے خود پرست اسے بے حیا یہی عہدِ روزِ الست ہے

یا یہ کہ معشوق سے کہتے ہیں کہ طعنِ بد عہدی کا ٹیکہ تیرے ماتھے پر لگا ہوا ہے جسے مٹانے کے لئے تو آئینہ دیکھتا ہے مگر جب آئینہ دیکھتا ہے تو غرورِ حسن میں اور سرمست ہو جاتا ہے اور بد عہدی کی پرواہ نہیں رہتی گویا آئینہ کے ورطۂ ملامت میں غرق ہو جاتا ہے "کیونکہ" اب مستعمل نہیں ایسے مقام پر "کیونکر" بولا جاتا ہے نیز "نہ جانوں" اب بالکل متروک ہے "نہ جانے" بھی بہت کم بولا جاتا ہے اس معنی میں "کیا جانے" کا کچھ استعمال ہے مگر "نہ معلوم" آج کل کا فصیح لفظ ہے۔

یہ پیچ و تابِ ہوس سلکِ عافیت مت توڑ
نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

ہوس کے مروڑے دے کر آرام کی رسی کو نہ توڑ یعنی پریشانی میں نہ پڑ اس دارالمحن میں نگاہِ عجز یعنی بے بسی پر قناعت سلامتی کا سررشتہ ہے یعنی قناعت میں راحت ہے اور ہوس وجہ اضطراب۔

وفا مقابل و دعویٔ عشق بے بنیاد
جنونِ ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

مقابل یعنی معشوق یہاں مراد ہے معشوقِ حقیقی۔ کہتے ہیں وہ تو سراپا وفا ہے لیکن ہمارا دعویٔ عشق بے بنیاد بھلا جنونِ ساختہ میں فصلِ گل کا کیا لطف یہاں تو بے ساختگی ہونا چاہئے۔ یہ چاروں شعر ایک ہی رنگ میں خوب کہے ہیں۔

(۲۰۴)

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

مجھے بلانے میں تجھے طعن اقربا کا ڈر کیوں یہاں تو لاغری سے یہ حالت ہے کہ اگر میں ترے پہلو میں بیٹھا ہوں تو کوئی دیکھ کر بتا نہیں سکتا کہ کوئی ہے۔

(ناطق)
تن لاغر ہمارا سوزنِ گم گشتہ ہے گھر میں
وہ آئے ہیں تو آ کر ڈھونڈنے بیٹھے ہیں بستر میں

کسی شاعر نے اسی مضمون کو معشوق کے لئے یوں لکھا ہے۔

رشک آئینہ ہے اس رشکِ قمر کا پہلو
صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آ جائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہونچا دے مجھے

بایں حالِ تباہ کوئی وہاں تک مجھے کسی طرح پہونچا دے کیا تعجب ہے کہ اسے دیکھ کر رحم آ جائے۔

(ناطق)
نہ آئے گا اسے کیوں رحم مجھ پر رحم آئے گا
بایں صورت کوئی پہونچا تو آئے بزمِ دلبر میں

منہ نہ دکھلائے نہ دکھلا پر باندازِ عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

تو بوجہ ناراضی مجھے منہ دکھانا نہیں چاہتا تو اچھا نہ دکھا ناراض ہے تو ناراضی ہی بتا سامنے آ اور آنکھیں دکھا۔ آنکھیں دکھانا اظہارِ ناراضگی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زلف بن جاؤں تو وہ شانے میں الجھا دے مجھے

کسی کی زلف کا شانے میں الجھا ہوا ہونا اہلِ زلف کے لئے وجہ تکلیف بھی ہے اور زلف کی بدرونقی بھی۔ کہتے ہیں معشوق کو میری گرفتاری کی ایسی خوشی ہے کہ اگر میں اس کی زلف بھی بن جاؤں تو اپنی تکلیف و بدرونقی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مجھے شانے میں الجھا دے۔ یا یہ کہ زلف کی صفت ہوتی ہے پریشان جس سے اس کی شان ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ وہ میری گرفتاری کے لئے اس بات کی بھی پرواہ نہ کریگا کہ شان جاتی ہے۔

———

(۲۰۵)

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

دنیا کو میں لڑکوں کا کھیل تماشا جانتا ہوں یعنی اس کی کسی بات سے متاثر نہیں ہوتا۔

(ناطق) سامان ہے وحشت کا یہ بے سرو سامانی
دنیا کے تماشہ میں کس بات کی حیرانی

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

یہاں کے جاہ و جلال کو میں ایک کھیل سمجھتا ہوں اور یہاں کا کمال میرے نزدیک ایک معمولی سی بات ہے۔

(ناطق) کم ہے مری ہستی میں کم ہے مری مستی میں
اعجازِ مسیحائی اقبالِ سلیمانی

لفظ مسیحا کا استعمال اب بے ضرورتِ ندا جائز نہیں مگر جہاں ضرورتِ ندا ہو وہاں میرے نزدیک مسیحا اور مسیحا دونوں جائز ہیں آج کل کے بعض بے مایہ شعرا نے کسی سے سن لیا ہوگا کہ مسیحا کا استعمال جائز نہیں اس پر ضرورتِ ندا میں بھی اسے ناجائز سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ان کی کم فہمی ہے۔

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

میرے نزدیک ہستیِ اشیا کا وجود وہمی ہے اور عالم کا نام ہی نام ہے۔

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

صحرا اگرچہ مقامِ وحشت ہے لیکن میری وحشت سے گرد ہو جاتا ہے اور دریا لاکھ دریا ہے مگر میری دریا دلی سے اسے سرنگوں ہونا پڑتا ہے۔

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

تو کیسے کیسے رعنائی اور دلربائی کے انداز مجھے دکھاتا ہے ان سے سمجھ جا کہ فراق میں تیری یاد بایں ہمہ دلجوئی مجھ پر کیا ستم ڈھاتی ہوگی۔ یا یہ کہ جب تیرے رہتے ہوئے بھی بیقراری کا یہ عالم ہے کہ تو بھی اس سے متاثر ہوتا ہے تو فراق میں میرا کیا حال ہوتا ہوگا۔ یہاں یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا ہے کہ تو مجھے دیکھ کر متوحش ہوتا ہے کیونکہ حال پرسی اس کے منافی ہے۔ پہلے مصرعہ کے طرزِ کلام میں اب "کیا حال ہے" بولنا درست نہ سمجھا جائے گا اس کی جگہ "کیا حال ہوتا ہے یا رہتا ہے" کہیں گے اس طرزِ خطاب سے فائدہ اٹھا کر میرے ایک مرحوم ہم وطن منشی شمس الحق صاحب خیال جن کی عمر کا بیشتر حصہ رام پور میں گزرا تھا مجھ سے کہنے لگے کہ غالب کے اس شعر میں ذم کا بدترین پہلو نکلتا ہے میں نے کہا "ہوگا" "ہر کس بر خیالِ خویش خبطے دارد" آخر غالب سے نواب یوسف علی خاں مشورہ فرماتے ہی تھے اور ان کا رام پور میں جانا آنا تھا ہی۔

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں؟
بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے

محض آئینہ سامنے رکھنے کی غرض خود بینی و خود آرائی ہوتی ہے پھر میرے سامنے تو بتِ آئینہ سیما بیٹھا ہوا ہے میں کیوں نہ خود بین و خود آرا ہوں۔

(ناطق) وہ صاحبِ عالم ہے ہو تیری نظر جس پر
ہے آئینہ رو تجھ سے آئینِ جہاں بانی

پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

میں وہ بلبلِ خوش نوا ہوں کہ اس پھول کو دیکھ کر چہچہاتا ہوں۔

(ناطقؔ) یہ باتیں تری کس کے دم سے ہیں واعظ
یہ مَے ہے کہ کیا ہے یہ میں ہوں کہ تو ہے

نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا
کیونکر کہوں لو نام نہ اس کا مرے آگے

رشک اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کے نام سے بھی کسی کے لب آشنا نہ ہوں لیکن مجبوری یہ آپڑی کہ اگر میں کہوں کہ کوئی مرے سامنے اس کا نام نہ لے تو اس میں نفرت کا گمان ہوتا ہے یہ بات معشوق کو معلوم ہوگی تو خدا جانے مجھ پر کیا آفت آئے اس لئے ایسے رشک سے باز آئے۔

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

کعبہ پیچھے سے میرا دامنگیر ہوکر روکے ہوئے ہے اور کلیسا سامنے سے گریباں پکڑ کر کھینچتا ہے یعنی دونوں کو میں عزیز ہوں کہ میرا ایمان کافرِ عشق ہے اور میرا کفر عین ایمان۔ طرزِ بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ میں ہوں تو مقامِ ایماں میں جو مجھے روکے ہوئے ہے جانے نہیں دیتا لیکن کفر کو بھی میں عزیز ہوں اور وہ مجھے کھینچے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

میں عاشق تو ہوں لیکن معشوق فریب یعنی معشوقوں کو بہلا لینا میرا کام ہے لیلیٰ مجھے مجنوں سے اچھا بتاتی ہے۔

(ناطقؔ) مجنوں کو مرے آگے دیوانہ بتاتی ہے
اس طرزِ محبت کی لیلیٰ بھی ہے دیوانی

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

شبِ ہجراں میں جو موت کی تمنا کی تھی اور مرنے کی دعائیں مانگی تھیں وہ شبِ وصل مرے آگے آئیں کہ ان کی قبولیت کا اثر آج ہوا اور میں مر گیا ورنہ وصل کی خوشی سب کو ہوتی ہے اس طرح کوئی شادی مرگ نہیں ہونا چاہیے میں ہو گیا۔ یا یہ کہ شبِ ہجراں میں جو تمنائے دوست تھی اس نے وصل میں شادیِ فراواں کی شکل اختیار کی اور میں مر گیا ورنہ وصل کی خوشی کسے نہیں ہوتی۔ یا یہ کہ شبِ ہجراں میں یہ تمنا کی تھی کہ یا اللہ مجھے موت بھی آئے تو آغوشِ یار میں آئے وہ آج میرے آگے آ گئی۔ نہایت گرانمایہ شعر ہے۔

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

خونِ تمنا سے ایک قلزمِ خوں موجزن ہے کاش اسی پر مصیبت کا خاتمہ ہو جاتا مگر ڈھنگ کچھ اچھے نظر نہیں آتے۔ ابھی دیکھئے اور کیا کیا دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہاتھ پاؤں کا دم نکل چکا ہے دوست اس خیال سے ساغر و مینا اٹھا رہے ہیں کہ یہ اب گلاس اٹھا کر لبوں سے نہیں لگا سکتے یہ کہتے ہیں ابھی میری آنکھوں میں تو دم ہے انھیں دیکھ تو رہا ہوں ان کی دید ہی سے سیراب ہوتا ہوں ساغر و مینا کو مرے آگے رہنے دو میری تمنا ہے کہ دورِ ساغر ہی کے خیال میں آنکھ بھی پھرے۔ بڑا اچھا شعر ہے۔

(ناطقؔ) ہاں جی تو نہ جاؤں گا نظّارۂ ساغر سے
مرنے میں تو کچھ مجھ کو ہو جائے گی آسانی

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

تم کہتے ہو کہ غالب دیوانہ ہے کیونکہ وہ شاعر ہے۔ غالب بیہودہ ہے کیونکہ وہ شرابی ہے غالب نادان ہے کیونکہ وہ بیوقوفوں کا دوست ہے تو یہ سب بالواسطہ میرے سامنے مجھے برا کہنا ہو گیا کیونکہ وہ شاعری میں میرا ہم پیشہ ہے مے پرستی میں میرا ہم مشرب ہے اور میرا دوست بھی ہے تو اس پر مجھے برا ماننا ہی چاہئے کہ آپ اسے میرے سامنے برا کہہ کر مجھے برا کہہ رہے ہیں۔

(۲۰۶)

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہئے
تمہی کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہئے

میں جب حال کہنے بیٹھتا ہوں تو کہتے ہو کہ کہو کیا مطلب ہے تو جب اس طرح پتے ہی سے بات کاٹ دیتے ہیں تو مجھے آگے کہنے کی کیا ہمت ہو سکتی ہے۔

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے

تمہیں جب یہ بات معلوم ہے کہ مجھے تمہاری ہر بات پر بجا درست کہنے کی عادت ہے تو پھر طعن سے تم نے میرے سامنے کہا کیوں کہ ہم ستمگر ہیں نہ تم کہتے نہ میں بجا کہہ کر تمہارے ستمگر ہونے کی تصدیق کرتا اس پر بگڑتے کیوں ہو آگے کو احتیاط کرنا۔

(ناطق) دمِ خلوت نہیں کی تو نہیں کا ذکر کا رکھی ناطق
ہوا جاتا ہے اب خونِ تمناہاں میں ہاں کب تک

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے
نگاہِ یار کو پھر کیوں نہ آشنا کہئے

نگاہِ یار نیشتر ہو کر موجبِ آزار ہے لیکن جب اس نے دل میں اتر کر گھر کر لیا ہے تو پھر اسے ناآشنا کہنے کی کیا وجہ۔

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہئے

جراحتِ پیکاں سے دل کشائی نہیں ہوتی کیونکہ وہ صرف ایک سوراخ کر کے نکل جاتا ہے البتہ تلوار کا زخم ایسی چیز ہے جو دروازہ کھول دیتا ہے اور جس سے انشراحِ خاطر ہوتا ہے یہی راحتِ عشق ہے۔

جو مدعی بنے اُس کے نہ مدعی بنئے
جو ناسزا کہے اُس کو نہ ناسزا کہئے

بُرے کے ساتھ بُرے بن گئے دشمن سے دشمنی کی اور بدزبان سے بدزبانی تو اپنی بھلائی کیا رہی۔ یہاں بعض لوگ لفظ مدعی بنئے کے استعمال کو اچھا نہیں سمجھتے ان کے خیال کے مطابق یہ ذم کا پہلو ہے اور چونکہ لین دین میں اکثر مدعی بن کر بنئے عدالت میں جاتے ہیں اس لحاظ سے معترضین کہتے ہیں یہ لین دین کے مدعی مدعا علیہ کا سوال ہے حالانکہ پورا مصرعہ مدعی بنئے کو عدالت سے بہت دور کھینچ کر لے جاتا ہے اور ذم کا کوئی پہلو باقی نہیں رہتا۔ ذم کا پہلو اُسے کہتے ہیں کہ پورا شعر پڑھنے پر بھی شعر دوسرے پہلو سے معنی دے جائے مثلاً

(جلال) تیرے سب ناز ہیں "گو زندہ" ہی کرنے والے
ڈھونڈھ لیتے ہیں بہانہ کوئی مرنے والے

اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ترے سب ناز محض دھمکیاں ہیں اور "گو زندہ ہی" کر کے چھوڑ دیتے ہیں مگر اس کا کیا علاج کہ مرنے والے اسی دھمکی کو بہانہ بنا کر مر جاتے ہیں یا امانت کا یہ شعر

امانت کوہ پر پہونچا تو یوں فرہاد چلایا
لبوں پر جانِ شیریں ہے اب اے استاد کیا کیجے

یہاں بھی پورے شعر میں بے تکلف شاگرد استاد کو ابے کہہ سکتا ہے۔

ہمارے خیال میں مدعی بنئے کے جیسے الفاظ سے ذم کا پہلو نکالنا اور شعر کے طرز بیان کو اس سے علیحدہ رکھ دینا حرف گیری کی کوتاہ فہمی سے زیادہ نہیں کہ پورے شعر سے قطع نظر کر کے ایک لفظ کا جدا مطلب نکالا جائے۔ ایسا کرنے والا لاتقربوا الصلوٰۃ سے کام نکالنے والا ملحد ہی ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے عیوب سے بچنا ناممکن ہے تلاش کیجئے تو ہر شاعر کے کلام میں یہ عیب نکلے گا اور اگر اب بھی عمر بھر خیال رکھ کر کوئی شخص شاعری کرے تو کہیں نہ کہیں دھوکہ ضرور کھائے گا۔ افسوس ہے کہ جہاں دنیا بھر کی زبانیں شاعر کے لئے آسانیاں مہیا کرتی ہیں عربی میں ضرورت شعری سب کچھ کرا دیتی ہے انگریزی میں شاعر کے پاس ادبی لیسنس ہوتا ہے وہاں بد نصیبی دیکھئے کہ اہل اردو دور از کار پابندیاں لگا کر شعر کو بدنامی کا گھر بناتے جاتے ہیں۔

کہیں حقیقتِ جاں کاہیِ مرض لکھئے
کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہئے؟

یہ تین شعر ایک قطع کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں دنیائے پرمحن کی زندگی کا دکھڑا روتے ہیں کہ مرض میں مبتلا ہیں بڑی تکلیف ہے کیا کیا دوائیں نہ کیں کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ آگے چلئے۔

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے
کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہئے؟

کبھی یہ کہئے کہ بڑی مصیبتوں میں رہتے ہیں جن سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ چلئے۔

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہئے؟

زبردست کا ٹھینگا بہرحال سر پر ہے جبر پر صبر کرنا پڑتا ہے اور ظالم کی ستائش کے بغیر چارہ نہیں جو ظلم کو احسان سمجھ کر اس کا داد خواہ و اُجرت طلب ہوتا ہے۔

نہیں نگار کو الفت نہ ہو۔ نگار تو ہے
روانیِ روش و مستیِ ادا کہئے؟

یہ دونوں شعر بھی مل کر قطع ہے۔ کہتے ہیں اگر معشوق کو الفت نہیں تو نہ ہو معشوق تو ہے اس کے حسن خداداد کی تعریف کرنا ہی چاہئے۔ چلئے آگے چلئے۔

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہئے؟

اگر بہار کو قیام نہیں تو نہ ہو مگر جو کچھ ہے اس میں رنگینیِ چمن و خوبیِ ہوا کی داد دینا چاہئے۔ حاصل یہ کہ خذ ما صفا ودع ما کدر بری باتوں کو چھوڑئے خوبیوں کو لیجئے کہ ان کا ذکر بھی بیان کرنے کے لئے کچھ کم نہیں۔

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے؟

جب برا وقت ہی نکل گیا تو اب کسی کی برائی کا کیا گلہ کیجئے۔

(۲۷)

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

عشق میں اتنے روئے کہ ہماری شرم دھلتے دھلتے صاف دھل گئی اور اس جھگڑے سے پاک ہو گئے۔

(ناطق) صورت مرے رونے سے ہنسنے کی ہوئی پیدا
سب ڈھل گیا ڈھلکے کہ آنکھوں کا جو تھا پانی

صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ میکشی
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

گھر کا صرف اتنا حساب تھا کہ جام و سبو کی گنتی رکھنی پڑتی تھی اور یا ہر کا یہ کہ شراب کے دام باقی تھے اور کلال کا تقاضا تھا دونوں کا جھگڑا یوں پاک کیا کہ آلاتِ میکشی کلال کی طرف لگا دیئے اب کوئی حساب باقی نہ رہا۔ یا یہ کہ انھیں بیچ کر شراب پی لی۔ چلو حساب پاک ہوا۔

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے ہم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

یارانِ ہم مشرب کو تسلی دیتے ہیں کہ آوارگی سے بدنامی ہوئی تو ہونے دو اس طرح ہمیں چالاکی تو آ گئی آدمی کچھ کھو کر ہی سیکھتا ہے۔

(داغ) تو مری نعش کو ٹھکرا کے چل اے مستِ شباب
ٹھوکریں کھاتے ہیں انسان سنبھلنے کے لئے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر؟
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

باغ میں پھولوں کا کھلنا کیا ہے نالۂ بلبل کے اثر سے در پردہ لاکھ جگر کا چاک ہونا اب کیونکر کہئے کہ نالۂ بلبل بے اثر ہے۔

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

اہلِ شوق جنھوں نے اپنے وجود کو آتشِ شوق کا ایندھن بنا دیا ان کے وجود و عدم کا کیا کہنا یعنی ان کا وجود رشکِ وجود ہے اور ان کا عدم رشکِ عدم کہ وہ باقی باللہ اور فانی اللہ ہیں۔ یا یہ کہ اہلِ شوق کا وجود کیا اور عدم کیا یہ تو وہ لوگ ہیں جو آتشِ شوق کے خس و خاشاک ہو کر جل بجھے ہیں اور کہیں کے نہیں رہے۔

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلا
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

تغافل کی شکایت سُن کر جو وہ ہماری طرف ملتفت ہوئے تو یہاں ایک ہی نگاہ میں کام تمام تھا۔

(ناطق) اُس نگہ سے ہاں بجا ہوگا تغافل کا گلا
ہے اگر تجھ میں دلِ بیتاب تابِ التفات

اس رنگ سے اُٹھائی کل اس نے اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

ایسے فرطِ غم سے نعش اُٹھائی یا اس بے توقیری سے مردہ اُٹھوا دیا کہ جس کو دیکھکر دشمنوں کو بھی صدمہ ہوا۔

(۲۰۸)

نشّہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب
شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

بزمِ عیش کا نقشہ کھینچے ہیں جہاں کیفِ مے سرود کا یہ عالم ہے کہ ساز کی مستی طرب افزا ہے اور شراب کا شیشہ نغمہ کی نہرِ رواں کے کنارے کا سر سبز سرو بنا ہوا ہے اور نشے رنگِ بزم سے شاداب ہیں یا یہ کہ نغمہ کو بہ لحاظِ روانی و لطافت جوئبار یعنی آبِ رواں سے تعبیر کیا جس کی آبیاری سے نشے شاداب ہو کر رنگ لا رہے ہیں اور ساز اس کی روانی سے مستِ طرب ہیں نیز شیشۂ مے اس آبِ رواں کے کنارے کا سروِ سبز ہے۔

(زیب النساء) چہار چیز ز دل غم برد کدام چہار
شراب و سبزہ و آبِ رواں و روئے نگار

ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

دوست کی بزمِ عیش میں اے ہم نشیں تو مجھے نالہ کشی سے منع کیوں کرتا ہے اس سے وہ محفل برہم نہیں ہو سکتی کہ جہاں میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے یعنی وہاں تو یہ حال ہے کہ وہ بیدرد میرے نالے سے بھی ایسی ہی دلبستگی رکھتا ہے جیسے کہ اہلِ عیش کو نغمہ سے ہونا چاہیے یعنی وہاں میرا نالہ بھی ایک نغمہ ہی ہوتا ہے۔

(غالب) چشمِ بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہے گر نالہ بھی میرا جائے ہے

(۲۰۹)

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے
دعویٔ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

دانت جنھیں بلحاظِ اجتماع بزمِ احباب سے تعبیر کرتے ہیں ان کی شوخی کا اظہارِ نازِ ہنسی کے لئے ہے۔ یہاں لفظِ خنداں سے دو مطلب نکلے یعنی یہ کہ شوخیِ دنداں خندۂ دنداں نما سے مخصوص ہے اور یہ بھی کہ وہ تضحیک ہے کیونکہ یہ جمعیت محض عارضی ہے اسے مثالاً بیان کر کے کہتے ہیں کہ مجمعِ احباب کی خوش وقتی پر بھی ہنسی آتی ہے کہ یہ انجامِ جمعیت سے غافل ہیں اِنَّا آخِرَ الصُّحْبَتِ الفِرَاق۔

(ناطق) مٹتے جاتے ہیں راہِ عمر میں دوست
مِل رہے ہیں نشانِ منزل کے

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل
یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

زانو تامل سر بزانوئے تامل۔ یک جہاں بیانِ مبالغہ جیسے یک بیاباں ماندگی پہلے لکھ آئے ہیں۔ غنچہ جو محوِ عبرتِ انجامِ گل ہے عدم میں ہے یعنی انجام کی فکر میں محو ہے جو عدم ہے۔

کہتے ہیں غنچہ اُس عدم کے خیال سے جو اسے بعد از خندۂ گل حاصل ہوگا یعنی جو پریشانی اور فنا کہ گل ہونے کے بعد اس کے لئے لابد ہے محوِ عبرت ہے اور قبل از خندہ انجامِ خندہ کے خیال سے بڑے سوچ میں پڑ گیا ہے کہ کھلوں یا نہ کھلوں۔

کلفتِ افسردگی کو عیشِ بے تابی حرام
ورنہ دنداں در دلِ افشردن بنائے خندہ ہے

افسردگی ایسی کلفت ہے جو بربنائے یاس ہوتی ہے جس کا لازمہ ہے دل تنگی۔

(داغ) تنگ ہے دل وسعتِ دامانِ محشر دیکھ کر
اے جنوں ہم پاؤں پھیلاتے ہیں چادر دیکھ کر

افسردگی کے مقابلے میں بیتابی راحت ہے کیونکہ بے تابی جستجو اور امید کا نتیجہ ہوتی ہے دنداں در دل افشردن "مصائب پر صبر کرنا" لیکن معنیِ لفظی سے چاب ڈالنے کی صورت بھی پیدا ہوتی ہے۔ کہتے ہیں افسردگی نے ہم پر بے تابی حرام کر دی ہے ورنہ یہ عالم بے تابی احباب سے دنداں در دل افشردن کی صلاح یا نباہنے لے بہانہ ہو جاتا اس طرح ہم دل کو چاب ڈالتے جس سے خواہ مخواہ دل شگفتگی کی صورت نکل آتی جو علامتِ خندہ بھی ہے اور وجہ خندہ بھی۔

شورشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

آشنا شناور یعنی تیرنے والا۔ محیط دریا یعنی فارسی۔ کہتے ہیں میرے خندۂ ظاہر کو دیکھ کر احباب شورشِ باطن کا یقین نہیں کرتے ورنہ اصل حال یہ ہے کہ دل گریہ کا ایک سمندر ہے جس میں لب بوضع خندہ تیراکی کر رہے ہیں۔

(۲۱۰)

حسنِ بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

اختراع ایجاد۔ موجد کے لئے ایجاد میں فکر کی ضرورت ہے اور فکر کے لئے سر بزانو ہونا استعمال ہوتا ہے۔ .... زانو کو آئینے سے مشابہ کرتے ہیں یہاں شاعر نے آئینہ کو زانو بنایا ہے حسنِ بے پروا طنزاً بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ پہلے لکھ آئے ہیں۔

(غالب) پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن
ہاتھ مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا

اور یہ بھی کہ وہ حسن جس کی شانِ بے نیازی ولاپرواہی ہے۔ کہتے ہیں کہ حسن بے پرواہ بھی متاعِ جلوہ آرائی کا خریدار یعنی متمنی ہے چنانچہ دیدِ آئینہ جس سے دمِ آرائش تزئینِ حسن برائے جلوہ ہوتی ہے اختراعِ جلوہ کے لئے زانوئے فکر ہے یعنی حسینوں کا دمِ آرائش آئینہ دیکھنا اختراعِ جلوہ کے لئے سر بہ زانوئے فکر ہوتا ہے یا ملاحظہ ہو اس شعر کی شرح

(غالب) آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن؟
چشمِ واگردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

اے آگہی تو کب تک رنگِ تماشا کے کھیل میں اوقات گنوائے گی خیال رکھ کہ چشمِ واگشتہ جو بہر تماشا کشادہ ہے یہ خود آغوشِ وداعِ جلوہ ہے۔ حاصل یہ کہ بہارِ عالم ایسی بے ثبات چیز ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے فنا ہوجاتی ہے اے دلِ آگاہ تو اس کھیل تماشے میں کب تک رہے گا اسی مضمون کا ایک شعر یوں لکھا ہے۔

(غالب) آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

(۲۱۱)

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

دہانِ زخم پیدا کئے بغیر تجھ سے ہمکلام ہونے کا راستہ نہیں نکلتا یعنی زخمِ عشق کھانے کے بغیر معشوق منہ نہیں لگاتا۔

(ناطق) وہاں لعل و گہر سنگ و صدف رہ جائیں گے بن کر
دلِ صد چاک ہی تحفہ ہے نذرِ یار کے قابل

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

غبار اور زلف دونوں کو پریشان باندھتے ہیں لیکن غبار سے وحشت ہوتی ہے اور زلف سے دل بستگی۔ کہتے ہیں کہ عالمِ پریشاں ہے کب تک دل لگی رکھے یہ تو سراسر وحشت کا گھر ہے۔

افسردگی نہیں طرب انشائے التفات
ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

افسردگی یا لاپرواہی التفات کی خوشی کو پیدا نہیں کرتے یعنی افسردہ خاطری ایسی چیز نہیں جس پر معشوق التفات کرے اس کے دل میں گھر کرنا ہو تو سراپا درد بن جائے یا یہ کہ افسردہ دلوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتا البتہ اہلِ درد جن کا شیوہ ہمدردی ہے سب کے دل میں گھر کرتے ہیں اور ہر کوئی ان کی طرف التفات یا ان کی تمنا کرتا ہے۔

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

میری ساری عمر دل تنگی میں گزر گئی اور معشوق نے کبھی میری دلجوئی کا خیال نہیں کیا تو اب اے ندیم اگر بہ عالمِ بے بسی گھبرا کر میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تو اس پر ملامت کرنا تجھے زیبا نہیں۔

چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

کسمپرسی کی دنیا ہے اس میں جب چاکِ جگر ہی پر کسی نے التفات نہیں کیا تو گریباں کو کس فائدے کی اُمید میں کوئی چاک کرے مفت کی رسوائی اٹھانے سے کیا فائدہ۔

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل
تا چند؟ باغبانیِ صحرا کرے کوئی

صحرا کی بے سود باغبانی کب تک کہ رگِ ہر خار کو ایک لختِ جگر سے شاخِ گل بنا رکھا ہے یعنی ہر کانٹے کی نوک پہ جگر کا ایک ٹکڑا چسپاں کر دیا ہے ان رنگ آمیزیوں کا یہاں کیا لطف اگر کوئے یار میں لے جا کر ایسے پھول بکھیر دیتے تو البتہ کچھ بہار آتی۔

ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

ناکامی ناکام رکھنے والی۔ کہتے ہیں کہ تجھے کوئی دیکھ نہیں سکتا کیونکہ دم دیدِ تابِ رخ کی برقِ نظارہ سوز آنکھوں کو بند کر دیتی ہے یا چکا چوند میں کچھ نظر نہیں آتا یہی مضمون پہلے لکھ آئے ہیں۔

(غالب) جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست
نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

گوہرِ شکست گوہرِ بے بہا جس کے معاملہ میں رنگ قیمت شکست ہو جائے مصنف نے یہاں شکستِ کاسۂ سر کو گوہرِ شکست سے تعبیر کیا۔ کہتے ہیں کہ اگر کوئی جنون سے سودا کرے تو اس میں نقصان نہیں رہتا کیونکہ ہر سنگِ طفلاں جو سر پہ

پڑ کر اسے پھوڑتا ہے ایک صدف ہے جس سے گوہرِ شکست نکلتا ہے۔

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

فرصت سے مراد ہے فرصتِ زیست۔ کہتے ہیں عمرِ جہانِ فانی تیرے وعدۂ صبر آزما سے عہدہ بر آ نہیں ہو سکی کوئی ایسی سخت جانی اور طولِ حیات کہاں سے لائے کہ تیری تمنا میں وعدۂ صبر آزما کے لئے جہاں خدا جانے کتنا عرصہ درکار ہے جیتا رہے عمرِ انساں یا عمرِ طبعی یا عمرِ جہاں تو اس کے لئے کافی نہیں۔

ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز
یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

ایجاد کو ایک درد سے تعبیر کیا کہ فکرِ ایجاد بہ لحاظ عام ہو یا بہ لحاظِ سخن ایک دردِ سر ہے اور درد کا بمعنی محبت بھی استعمال ہے۔ کہتے ہیں کہ طبیعتِ ایجاد کی وحشت یعنی طبیعتِ ایجاد سے وحشت یاس خیز یعنی مایوس کن ہے کیونکہ یہ درد تو ایسا نہیں جو پیدا کرنے کے لائق نہ ہو حاصل یہ کہ فکرِ ایجاد کی طرف جسے رغبت نہ ہو اس سے نا امید ہو جانا چاہیے کہ وہ کسی کام کا آدمی نہیں کیونکہ یہ تو ایسی چیز ہے جس کی طرف انسان کو رغبت ہونا ہی چاہیے۔

بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

جنوں کا شغل کیا ہے جیب و دامن کو پھاڑنا انھیں یہ موقع باقی نہیں رہا کیونکہ اُن کا خاتمہ ہو چکا ہے صلاح یہ ہے کہ سر پیٹ کر اب جی بہلائیے۔ بیشک یہ ایک شغل بیکاری ہے جس پر مجبوری اور بے کسی کا اظہار کرتے ہیں کہ اس کا بھی محل نہیں رہا کیونکہ ہاتھ بھی ٹوٹ چکے ہیں اب کیا کریں۔ یا یہ کہ ابھی تو بیکاریِ جنوں کے لئے آپ نے سر پیٹنے کا شغل بتا دیا جو ہم کریں گے مگر یہ بھی بتاتے جائیے کہ جب سر پیٹتے پیٹتے ہاتھ ٹوٹ جائیں تو اس وقت ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

شمع کو اس وقت تک فروغ نہیں ہوتا اور اس میں خوبصورتی نہیں آتی جب تک کہ موم بتی میں گداز شروع نہ ہو جائے یعنی وہ پگھل کر شعلے کو تیل یا موم نہ دینے لگے۔ شعر وہی چمکتا ہے جس میں اثر ہو اور اثر کے لئے اہلِ سخن کے دل میں گداز کی ضرورت ہے۔ کہتے ہیں کہ جب تک دل میں گداز نہ ہو اس وقت تک شمعِ سخن کو فروغ نہیں ہو سکتا۔

(۲۱۲)

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

ابنِ مریم حضرت عیسٰی علیہ السلام جن کا معجزہ ہے سخت ترین امراض کے مریضوں کو اچھا کرنا اور مردوں کو زندہ کرنا۔ کہتے ہیں اگر دنیا میں کوئی مسیحا نفس ہے تو ہوا کرے میرے کس کام کا ہے۔ میں تو جب جانوں جب کوئی میرے دُکھ کی دوا کرے۔

شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

اگر مدارِ عالم شریعت اور قانون پر ہو کہ قاتل کی سزا قصاص ہے تو سہی لیکن اس سے ایسے قاتل کا کوئی کیا کر سکتا ہے جو تیرِ غمزہ و تیغِ نظر سے کام لے یا تیغِ تغافل سے ہلاک کر ڈالے کیونکہ ایسے قاتل پر نہ شریعت مواخذہ کرتی ہے نہ قانون۔

چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

کسی کے دل میں گھر کرنے کے لئے اُس کے ملنے ٹھہرنے بولنے بتانے کی ضرورت ہے اب جو ایسی چال سے نکل جاتا ہو جیسے کڑی کمان کا تیر ایسے کے دل میں گھر کرنے کا کوئی راستہ نکالے۔

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

یہ نظم بہترین بیانِ نثر ہے جسے سہلِ ممتنع کہتے ہیں آج کل عام طور پر جب ایسا موقع ہو کہ وہاں تو یہ بات ہے کہ چپ بیٹھے سُنے جاؤ بات کرو تو زبان کاٹی جاتی ہے اس شعر کو بے تکلفی پڑھ دیا جاتا ہے کہ بات پر زبان کٹتی ہے۔ ایک محاورہ ہے جو بات پر گرفت ہوتی ہے کی جگہ بولتے ہیں یہ بھی مشہور ہے کہ نا مطبوع گفتگو پر پہلے دربارِ شاہی میں زبان کاٹ لی جاتی ہے۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

حالتِ جنوں میں کیسی کیسی راز کی باتیں مرے منہ سے نکل رہی ہیں خدا کرے انھیں دیوانے کی بڑ سے زیادہ کوئی کچھ نہ سمجھے۔ یہ شعر بھی سہلِ ممتنع ہے اور بہت پڑھا جاتا ہے۔

(غالبؔ) تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

اگر کوئی بُرا کہے تو اس کی شکایت نہ کرو اور اگر کسی کو بُرا کرتے دیکھو تو چشم پوشی سے کام لو اور اس کا چرچا نہ کرو یہ شعر بھی سہلِ ممتنع ہے مگر اب ردیف کا بلا قافیہ کے پہلے مصرعہ میں لانا عیبِ تغزل ہے۔

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

اگر کسی کو غلط راستے پر چلتا ہوا دیکھو تو روکو اور گڑھے میں گرنے سے بچاؤ

اور اگر کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو معاف کر دو آخر انسان ہی سے تو غلطی ہوتی ہے یہ شعر بھی سہلِ ممتنع ہے۔

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

دنیا میں تو سب ہی حاجت مند ہیں کیونکہ انسان مختار نہیں مجبور ہے جو حالت حاجت روائی کے منافی ہے یہاں کون کسی کی حاجت روائی کر سکتا ہے حاجت روا تو صرف اللہ کی ذات ہے اور بس۔ یہ شعر بھی سہلِ ممتنع ہے اور مشہور بھی بہت ہے۔ اسی مضمون کو مصنف نے یوں بھی لکھا ہے۔

(غالب) ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

کیا کیا خضر نے سکندر سے؟
اب کسے رہنما کرے کوئی

حضرت خضر اور سکندر ذوالقرنین کا قصہ مشہور ہے کہ آپ سکندر کو آبِ حیات تک لے جانے کے لئے رہنما ہوئے تھے مگر بد قسمتی سے سکندر کو نامراد واپس آنا پڑا حضرت خضر کی رہنمائی ضرب المثل ہے اسی لئے سچے رہنما کو خضرِ راہ بھی کہتے ہیں اور شیخ کامل کے لئے خضرِ راہِ طریقت مستعمل ہے۔ کہتے ہیں جب خضر سا رہنما بھی سکندر کے کام نہ آیا تو راہنمائی کے بارے میں کون کس پہ بھروسہ کرے یہ شعر بھی سہلِ ممتنع ہے۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیا کسی کا گلہ کرے کوئی

شکایت اس سے کی جاتی ہے جس سے کوئی امید ہو اور جب امید ہی نہیں رہی تو شکایت کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی ایسی حالت میں کوئی کسی کا کیا گلہ کرے۔ یہ شعر بھی سہلِ ممتنع ہے مصنف نے یہ پوری غزل اس انداز میں لکھی ہے کہ عالی خیالی

کے ساتھ اس کا تقریباً ہر شعر سہلِ ممتنع ہے یہی بات ہے جس پر اہلِ نظر نے غالب کو غالب مانا ہے یہ قادر الکلام استادِ سخن گو اغلاق کے لئے مشہور ہے اور ناسمجھ لوگ کسی کا مہمل یا مغلق شعر سن کر اسے غالبیت کہہ دیتے ہیں حالانکہ غالبیت اس شانِ تغزل کا نام ہے جو اس غزل میں موجود ہے یا اسی رنگ کے مصنف نے دوسرے بہت سے اشعار لکھے ہیں حقیقت یہ ہے کہ غالب کو ایسی ہی شاعری نے غالب بنایا ہے اور غالب کی پیروی کرنے والے کو یہی طرزِ نظم اختیار کرنا چاہیئے ورنہ غالب جب تک اغلاق کی شاعری کرتے رہے دنیا نے شاعری میں کہیں کے نہ تھے چنانچہ خود مصنف نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے جو ہم پیچھے نقل کر چکے ہیں۔

(۲۱۴)

باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

خفقانی کو ہر چیز سے وحشت ہوتی ہے اور سیر باغ وجہ دل بستگی ہے جس کی رونق خود گل سے ہے۔ کہتے ہیں میرے خفقان کو دیکھ کر باغ بھی مجھے ایسا ڈراتا ہے کہ شاخِ گل کا سایہ تک مجھے کالا ناگ نظر آتا ہے دوسری جگہ اسی مضمون کو یوں لکھ آئے ہیں۔

(غالب) ترکی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

جوہرِ تیغ بہ سرچشمۂ دیگر معلوم
ہوں میں وہ سبزہ کہ زہرآب اگاتا ہے مجھے

جس طرح جوہرِ تیغ زہرآب میں بجھانے کے سوا کسی پانی سے پیدا نہیں ہوتا اسی طرح میرے جوہرِ تیغ کی بھی بجز زہرآبِ غم کے آبیاری نہیں ہوتی یعنی صرف غمِ عشق میں میرے جوہرِ کمال کا راز ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ اہلِ درد کی باتیں موثر ہوتی ہیں۔ یا یہ کہ جس طرح جوہرِ تیغ بجز زہرآب کے پیدا نہیں ہوتا اسی طرح میرا جوہرِ کمال بھی تلخیٔ مصائب سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسری جگہ اسی مضمون کو یوں لکھا ہے۔

(غالب) غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

جگہ اسی مضمون کو یوں لکھا ہے۔

(غالب) کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

جیتے جی تو مجھے یہ شرف حاصل تھا کہ جب میں ان کی محفل میں جا بیٹھتا تھا تو ارے تو کہاں آمرا کہہ کر وہ خود اٹھا دیا کرتے تھے اب جو میں محفل میں آکر سچ مچ مر گیا ہوں تو یہ دیکھنا ہے کہ وہی سنتِ دیرینہ قائم رہتی ہے یا نہیں اور وہ کہاں تک اپنی وضع کی پابندی کرتے ہیں۔

(۲۱۴)

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی
اترائے کیوں نہ خاک سرِ رہ گزار کی

رہ گزر کی خاک کا اترانا حق بہ جانب ہے کہ اسے بادشاہ کے باڈی گارڈ کے گھوڑوں نے ـــ روندا ہے ـــ "کوکبہ" فارسی کا لفظ بھی ہے اور اردو کا بھی لیکن وقت کی بات کہ اب انگریزی لفظ باڈی گارڈ اردو روزمرہ میں اس کی جگہ زیادہ مستعمل ہے۔

جب اس کے دیکھنے کے لئے آئیں بادشاہ
لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی

لالہ زار پر جب خود شاہِ والاجاہ کی نگاہِ لطف ہے تو وہ لوگوں کا منظورِ نظر کیوں نہ ہو۔

بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے
کیونکر نہ کھایئے کہ ہوا ہے بہار کی

(231)

مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے
آئینہ خانہ میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

چونکہ حصولِ مدعا میری قسمت میں نہیں اس لئے بہ عالمِ ناکامی وجودِ مدعا سے میری دل شکنی ہونا ضروری ہے۔ اب جو مدعا نے میرے دل کا رخ کیا تو اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ محوِ تماشائے شکستِ دل ہے۔ دوسرے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ دل آئینہ ہے جب وہ ٹوٹے گا تو اس کے ٹکڑوں سے بہت سے آئینے بن کر میرا سینہ آئینہ خانہ بن جائے گا گویا میرا وجود آئینہ خانے میں منتقل ہو جائے گا تو یہ سمجھئے کہ مدعا کا میرے دل میں آنا مجھے آئینہ خانہ بنانا ہی جس میں وہ شکستِ دل کا تماشا دیکھنا چاہتا ہے۔ یا یہ کہ مدعا نے جو میرے دل کو توڑا ہے اب وہ اس کا ہجومِ نظارہ کے ساتھ تماشا دیکھنا چاہتا ہے اور گویا کشاں کشاں کوئی مجھے آئینہ خانہ میں لئے جا رہا ہے جہاں اسے اپنی کارگزاری کا تماشا دکھائی دے گا۔ یا یہ کہ مدعا محو اضافت مقلوب یعنی محوِ مدعا تماشا بمعنی ذوقِ تماشا۔ کوئی لئے جاتا ہے مجھے یعنی میں اس طرح کھنچا چلا جا رہا ہوں جیسے کوئی پکڑ کر لے جاتا ہو۔ مطلب یہ کہ شوقِ تماشائے شکستِ دل محوِ دعا ہو کر مجھے اس طرح آئینہ خانہ میں لئے جا رہا ہے جیسے کوئی پکڑ کر لئے جاتا ہو کہ وہاں جا کر ذوقِ تماشا مجھے شکستِ دل کا تماشا دکھانا چاہتا ہے کہ وہاں مجھے اپنے ٹوٹے ہوئے دل کے ہم رنگ بہت سے آئینے لگے ہوئے نظر آئیں گے۔

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک
آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

نالہ گریہ کا شور و پکار۔ سرمایہ۔ پونجی۔ آسماں کو بیضۂ قمری اس لئے بھی مشابہ کیا کہ اس کا رنگ خاکستری ہے اور اس لئے بھی کہ گول ہے یہ بیان تحقیر کے لئے ہے دوسری وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جب عالم کفِ خاک ہے تو آسمان جس چیز کو محیط ہے وہ پُر از نالہ ہونے کے ساتھ خاک یا خاکستری بھی ہے یعنی مادہ ہوا قمری کا جس میں یہ دونوں اوصاف ہیں جس کے لئے بیضۂ قمری کہا۔ کہتے ہیں عالم کا سرمایہ نالہ ہے اور خود عالم اپنی وسعت میں کفِ خاک سے زیادہ نہیں ایسی حالت میں میری ہمتِ عالی کے لئے آسماں کیا ہے ایک قمری کا انڈا جو خاکستر و نالہ کو محیط ہے اور یہ دونوں قمری کی خصوصیات ہیں دوسری

سیرِ گلستاں کے تو ہم کچھ بھوکے نہیں لیکن اس لئے ادھر بھی آ نکلتے ہیں کہ آخر بہار کی ہوا کھانا تو چاہئے۔

(۲۱۵)

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے؟
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے؟

ساقیِ کوثر پیغمبر اسلام جو حوضِ کوثر پر ساقی ہوں گے مصنف اعتقاداً شیعہ نہیں تو تفضیلیہ ضرور رکھتے اہلِ تشیع کا یہ اعتقاد ہے کہ ساقیِ کوثر حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہوں گے چونکہ غالب نے پیغمبر اسلام کی نسبت حضرت علیؓ کی طرف زیادہ رجحان عقیدت کا اظہار کیا ہے مثلاً ؎

مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان ناف زمین ہے نکہ نافِ غزال ہے

اس لئے میرا خیال ہے کہ یہاں ساقیِ کوثر سے مصنف کی مراد حضرت علیؓ ہیں پیغمبر اسلام نہیں۔ شراب غم غلط کرنے کا ذریعہ ہے۔ گیتی زمین جس سے یہاں مراد ہے عالم۔ کہتے ہیں غمِ دنیا اگر بہت ہے تو اسے مٹانے کے لئے شراب کی بھی تو افراط ہے کیونکہ میں ساقیِ کوثر کا غلام یعنی ان کے بادۂ شوق میں سرمست ہوں مجھے کس بات کا غم ہو سکتا ہے۔

تمہاری طرزِ روش جانتے ہیں ہم کیا ہے؟
رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے؟

کہتے ہو کسی پر ظلم کرنا ہمارا شیوہ نہیں جی ہاں ہم آپ کی طرزِ روش کو خوب جانتے ہیں بھلا یہ تو بتائیے آپ جو حسبِ عادت رقیب پر لطف کرتے اگر یہ بھی لطف کہلائے تو پھر ہمارے لئے اور کون سا ظلم ہو گا۔

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے؟

ہمیں بھی اس بات کا یقین ہے کہ غالب بڑا اگرما گرم مضامین لکھنے والا شاعر ہے

لیکن اب تو بوڑھا ہو گیا ہے اس میں وہ دم خم کہاں باقی ہے۔

(ناطق)
مردہ دل کیا زندگی کا دیں گے اے ناطق ثبوت
شعر میں کیا جان ہو گی جب ہمی میں دم نہیں

(۲۱۶)

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

میرے ارمان اگرچہ بہت نکلے مگر دفورِ حسرت کے مقابلے میں دیکھا جائے تو پھر بھی کم نکلے کیونکہ ہزاروں ایسی خواہشیں ہیں جن کے لئے مرا جاتا ہوں۔

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہے گا اسکی گردن پر؟
وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دم بدم نکلے

میرا خون جو ایسا ارزاں ہے کہ ساری عمر آنکھوں سے بہہ کر نکلتا رہا اس کے لئے میرے قاتل کو ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ یہ اس کی گردن پر نہیں رہ سکتا اگر قتل کر کے نہ بہا دیتا تو یوں بھی آنکھ سے بہہ بہہ کر نکل جاتا۔ یا یہ کہ وہ خون جو ایسا بہنے والا ہے کہ جگر یا دل سے آنکھوں میں بھی آ کر نہیں ٹھہرتا۔ اور کہیں نہیں رکتا تو گردن پر کیونکر ٹھہرے گا۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

آدم کا خلد سے نکلنا ایک بے آبروئی کی بات ہے لیکن یہ کسی کا دیکھا ہوا نہیں ایک سنی سنائی بات ہے مگر جس بے آبروئی کے ساتھ ترے کوچے سے ہم نکلے وہ آپ بیتی ہے اس کا اس سے کیا مقابلہ یا اس پر اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پر پیچ وخم کا پیچ وخم نکلے

تیری زلف گرہگیر اگر ذرا پاؤں پھیلائے تو قدِ بالا کی درازی سے بہت دور نکل جائے۔ میں نے اس مضمون کو دوسرے پہلو سے یوں لکھا ہے۔

(ناطق) کچھ سے کچھ ہو گی پہونچ کر پاؤں تک
زلف اُترتی جائے چڑھتی جائے گی

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہم روز علی الصباح گھر سے کان پر قلم رکھ کر اس خیال سے نکلتے ہیں کہ شاید کوئی شخص خط لکھوائے اور ہم کاتب ہوں تو راقم الحروف کا سلام لکھنے کا موقع مل جائے جو نامہ نویسی کی قدیم رسم ہے۔ یا یہ معلوم ہو کہ انہیں کون کیا لکھتا ہے۔

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

جمشید کی بادہ آشامی اس کے عالی مرتبت بادشاہ ہونے کی وجہ سے جامِ جہاں نما کی ایجاد کا باعث ہوئی جو جمشید کے بعد نابود ہو گیا کیونکہ کسی میں اس کی قابلیت نہ تھی اب چونکہ مجھ سا عالی ظرف بادہ نوش پیدا ہوا ہے اس لئے پھر وہ زمانہ آ گیا کہ جامِ جہاں نما کا استعمال ہو بعض لوگ غالب کا نسب بھی جمشید سے وابستہ بتاتے ہیں اور ثبوت میں ان کا یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

درمن ہوسِ بادہ طبیعت کہ غالب
پیمانہ بہ جمشید رساند نسبم را

غالب مغل تھے اور بمبئی میں مسلم ایرانیوں کو مغل کہتے ہیں۔

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

اس دار المحن میں جس کے پاس اپنی مصائب کا دکھڑا رونے کے لئے جائیے وہ اپنی سُناتا ہے اور ایسی ایسی تکالیف کا بیان کرتا ہے جنھیں سن کر ہم اپنی کہانی بھول جاتے ہیں پیچھے لکھ آئے ہیں۔

(غالب) کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

تم پر مرتے ہیں اور تمہیں دیکھ کر جیتے ہیں دونوں اردو کے محاورے ہیں اور دونوں کا استعمال صورتاً ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوصف محبت کرنے کے ایک ہی معنی میں ہوتا ہے۔ کہتے ہیں محبت نے مرنے اور جینے کے فرق کو اٹھا دیا ہے۔ پہلے بھی ایسا ایک شعر لکھ آئے ہیں۔

(غالب) پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

(ناطق) دل گرفتوں کی دل لگی تو ہے
مرنے والوں کی زندگی تو ہے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

یہ کہنے کی تو ہمت نہیں ہوتی کہ حضرت بھی درِ پیرِ مغاں کی آستاں بوسی فرماتے ہیں کیونکہ ایسی بات واعظ کی شان سے بعید ہے لیکن اتنا معلوم ہے کہ کل جب ہم وہاں سے پی کر نکل رہے تھے تو وہ جاتے ہوئے ملے اب کیا کہیں کہ ان کو وہاں کیا کام تھا۔

(داغ)　میخانہ کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت یہاں کہاں

(ناطق)　واعظ شراب خانہ تک آ کر نکل گیا
آیا ہوا شکار رہم آئے تو کل گیا

(۲۱۷)

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جایئے
بے تکلف اے شرارِ خستہ! کیا ہو جایئے

آواز بوجہ لطافت ہمدوش ہوا ہوتی ہے اس کے متعلق خیال ہوتا تھا کہ کسی پر بار نہ ہو گی لیکن دیکھتا ہوں کہ آواز باوجود لطافت کوہِ گراں پر پہونچ کر اس کی گراں گوشی کے لئے گراں ہو جاتی ہے کہ پہاڑ سے ٹکرانے کے بعد آواز کو واپس ہونا پڑتا ہے جسے صوت رجعی کہتے ہیں گویا پہاڑ نے اسے قبول نہ کیا اور بارِ خاطر سمجھ کر پلٹا دیا تو اب اگر بخیالِ لطافت صدا ہو جاؤں تو پہاڑ کی ہستی پر گراں ہوتا ہوں اس لئے اے شرارِ خستہ یعنی اے شوقِ سبک باری تو ہی بتا کہ اب بے تکلفی کی فنا کے سوا اور ایسی کون صورت ہے کہ کسی کے لئے بارِ خاطر نہ ہوں یعنی اپنی گرمیِ تمنا سے درخواست کرتے ہیں کہ تو مجھے جلا کر خاک کر دے کیونکہ دنیا میں سبک روا ور سبک بار ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ دنیا کی زندگی ہمیشہ خود اپنے لئے بھی بار ہے اور دوسروں کے لئے بھی۔

بیضہ آسا ننگ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جایئے

بیضہ کے اندر جو جانور رہتا ہے وہ اگرچہ زندہ ہوتا ہے لیکن قفسِ بیضہ میں رہنا اس کے لئے ننگ ہے کہ بال و پر نہیں نکال سکتا اس کی نئی زندگی جب شروع ہوتی ہے جب انڈے سے نکل کر باہر آئے۔ یہ کہتے ہیں میرا قفسِ جسمانی یا بیضۂ آسمان میری پروازِ ہمت کے لئے بیضہ آسا ننگ ہے اگر اس سے رہائی پاؤں

تو نئی زندگی ہو جائے۔ میں نے ایک نوحہ میں ایسا ہی شعر لکھا ہے۔

(ناطق)　روح بے تاب تھی دنیا میں اسی دن کے لئے
قید خانے سے رہائی ہے یہ مومن کے لئے

(۲۱۸)

مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے
موجِ شراب یک مژۂ خوابناک ہے

مستی بمعنی نشہ یا مے پرستی جس کا اُن معانی میں استعمال بلا ترکیب فارسی کے اب اردو میں جائز نہیں۔ کہتے ہیں کہ ساقی کے ذوقِ غفلت میں یعنی ساقی کی لاپروائی سے رنگِ مے پرستی کی موت ہو گئی چنانچہ اب موجِ شراب میں بھی مژۂ خوابناک کا عالم ہے یعنی ہر طرف ایسی اداسی اور سستی پھیلی ہوئی ہے کہ شراب بھی شیشوں میں اونگھ رہی ہے۔

جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو
جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

تری دست درازی سے گریبانِ خیال بھی چاک ہے کہ دل میں تیغِ ناز کے زخم کے سوا کوئی آرزو نہیں یعنی کسوتِ خیال میں بھی تمنائے چاکِ جگر کے سوا تیری چاہ نے کچھ باقی نہیں رکھا۔

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ
صحرا ہماری آنکھ میں یک مشتِ خاک ہے

ہماری چشمِ جنوں آلودہ نظر میں بجز وحشتِ ہستی کو لئے ہوئے ہے کوئی چیز نہیں سمائی یا عالم کی کوئی ہستی نظر نہیں آتی چنانچہ صحرائے وجود جس کا نام جنونِ ہستی بھی ہے ہماری نگاہ میں مشتِ خاک سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

(۲۱۹)

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی گہوارہ جنبانی
قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

بچے کی نیند اچاٹ ہونے لگے تو گہوارہ جنبانی کر کے اسے پھر گہری کیا جاتا ہے۔ خوابِ سنگیں خوابِ گراں۔ لبِ لعلِ معشوقاں کو جاں بخش باندھتے ہیں۔ جیسے لبِ جاں بخش سلادے اُس کی میٹھی نیند کا کیا کہنا۔ کہتے ہیں کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ گرانِ عدم بھی کس قیامت کا ہے کہ اسے لبِ عیسیٰ کی جنبش قم جو جاں بخشی کے لئے ہے گہوارہ جنبانی کا کام دیتی ہے اور اس کی نیند گہری ہو جاتی ہے گویا لبِ عیسیٰ کی جنبشِ حیات بخش اس کی نیند میں نئی جان ڈال دیتی ہے۔

(بیاں میرٹھی) ترے کشتے کو محشر خوابِ آسائش کا ساماں تھا
کہ صورِ افسانہ گو تھا زلزلہ گہوارہ جنباں تھا

(۲۲۰)

آمدِ طوفانِ سیلاب صدائے آب ہے
نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

جوشِ جنونِ عشق کو گریہ دریا باد اور صحرا نوردی لازم ہے "جادہ" سے مراد ہے "جادۂ دشتِ جنوں" جادہ کو بہ لحاظِ درازی و باریکی انگلی سے تعبیر کیا نقشِ پا کو شعراء صورتِ گوش سے مشابہ مانتے ہیں۔ یہ جوشِ جنوں میں صحرا نوردی کرتے ہوئے رکے ہیں اور سیلابِ گریہ نے آلیا ایسی حالت میں نقشِ قدم پر نگاہ پڑی جو کان میں انگشتِ جادہ رکھے ہوئے ہے اس کی وجہ سوچتے ہیں اور سوچ کر نکالتے ہیں کہ نقشِ پا نے جس طوفان سے انگشتِ جادہ اپنے کان میں رکھی ہے وہ یہ ہے کہ گریۂ دریا بار کے خوفناک طوفان کی آمد آمد ہے جس سے یہ ڈر گیا ہے۔ ایک تکلف ہے۔

(ناطق) ہوا ہی جادہ گم گشتہ یکسر مانعِ وحشت نکال اے دشت یہ کانٹا کفِ پائے مغیلاں کا

بزمِ مے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا
شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

شراب کو پری باندھتے ہیں پری کو انسان سے وحشت ہوتی ہے یہاں اس وحشت کو نبضِ پری کہہ کر اور بڑھایا کہ نبض کا کودنا بھی وحشت کی ایک شکل ہے۔ موج یا موجِ بادہ کو نبض یا رگ سے مشابہ کرنا مصنف کا معمول ہے۔ کہتے ہیں کہ بہ عالمِ فراق بزمِ مے کشی کی چشمِ مست کی یاد سے سرتاپا وحشت بنی ہوئی ہے کہ موجِ بادہ بھی نبضِ پری کی وحشت دکھا رہی ہے۔

(۲۲۱)

ہوں میں بھی تماشائیٔ نیرنگِ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

تمنا سے مطلب بر آری نہیں ہوتی تو نہ سہی مجھے بھی اس سے کچھ مطلب نہیں۔ یہاں تو نیرنگِ تمنا کا تماشا دیکھنا ہے کہ اس میں کیسی کیسی بازی گری دکھائی جاتی ہے۔ اس مضمون کو تھوڑے سے ردّ و بدل کے ساتھ مصنف نے کئی جگہ لکھا ہے۔

(۲۲۲)

سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

دمِ تحریر کاغذ پر سیاہی گر جانے سے لکھا ہوا مٹ کر سیاہ ہو جاتا ہے اور پھر ایک سیاہ داغ کے مفہوم کے سوا اور کچھ پڑھنے کے لائق نہیں رہتا۔ کہتے ہیں شب ہائے ہجراں نے جو میری قسمت میں نمایاں طور پر لکھی ہوئی ہیں میرے نوشتۂ تقدیر کو بالکل سیاہ کر رکھا ہے کہ اب ایک شب ہائے ہجراں کے سوا اس میں اور کوئی دیکھنے اور پڑھنے کی بات موجود نہیں اس طرح میں سیاہ بخت ہو کر رہ گیا ہوں۔

(۲۲۳)

ہجومِ نالہ حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے
خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

میں مبتلائے حیرت ہوں جس کا یہ زور ہے کہ اُس نے دل کے ہجومِ نالہ کو ایسا عاجز کر دیا ہے کہ ایک فغاں بھی نہیں نکل سکتی اور میری خاموشی جو اظہارِ عاجزی کے لئے میں نے اختیار کر رکھی ہے وہ ریشۂ نیستاں سے خس بدنداں ہے یعنی اس خاموشی نے مجھے سراپا نالۂ غم بنا رکھا ہے۔

(غالب) نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

(اقبال) نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

(ناطق) ہوئی جاتی ہے نذرِ ضبط جانِ ناتواں میری
برنگِ آتشِ خاموش رہتی ہے فغاں میری

(ولہ فارسی) نگاہم وقفِ حیرت گشت و کارِ نالہ مشکل شد
بہ مہرِ آئینہ سربند کردی شورِ دریا را

تکلف برطرف ہے جاں ستاں تر لطفِ بدخویاں
نگاہِ بے حجابِ ناز تیغِ تیزِ عریاں ہے

صاف بات ہے کہ معشوقانِ بدخو کی نمائشی مہربانی اور بھی زیادہ جان لیوا ہے کہ ان کی نگاہِ ناز بہ عالمِ بے حجابی ننگی اور تیز تلوار کا کام کرتی ہے۔

(غالب) کرنے گئے تھے اُن سے تغافل کا ہم گِلا
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

(امیر مینائی) خیر ہم کو آپ کی اللہ سلامت رکھے
شوخیوں نے تو مجھے مار ہی ڈالا ہوتا

حضرت امیر کا شعر نہایت بے تکلفانہ اور خوب ہے لیکن "اللہ سلامت رکھے" شرفاء کی زبان نہیں وہ ایسے موقع پر "خدا عمر دراز کرے" کہتے ہیں۔

(آتش) اسی کے سایہ میں ہوتی ہے میرے دل کی بسر
خدا دراز کرے عمر زلفِ پیچاں کی

اکثر الفاظ کا محل استعمال ایسا ہوتا ہے کہ اس میں عام و خاص کے محاورے کے مطابق فرق لازم ہے حضرت استاد کے مندرجہ ذیل شعر میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

(داغ) سخنِ شاہ و گدا خیر سے خالی نہ سُنا
یہ دعا کرتے ہیں سب کو وہ دعا کہتے ہیں

مطلب یہ کہ لفظ "دعا" اگر شاہی استعمال میں آئے تو کہیں گے کہ "جہاں پناہ دعا کہتے ہیں" اور اگر فقیروں کی زبان میں آئے گا تو بولیں گے کہ "جان و مال کو دعا کرتے ہیں۔

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی
کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

لذتِ غم نے میرے دل سے رنگِ شادمانی کو ایسا کھویا ہے کہ طلوعِ صبحِ عید بھی چاکِ گریبانِ غم سے بدتر نظر آتا ہے۔

دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دست گرداں ہے

بازارِ عشق میں ساغرِ الفت ادھار نہیں ملتا اگر ساقی سے معاملہ کرنا ہو تو نقدِ دل و دیں کو پہلے گرہ سے کھولنا پڑتا ہے۔

غمِ آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

مرجاں کو بہ لحاظِ سرخی و تابش کے چراغ سے تعبیر کیا۔ شاخِ مرجاں بحر میں پرورش

(237)

پالتی ہے یعنی مرجاں امواجِ قلزم میں اپنا چراغ جلاتا ہے صرصر یعنی تند ہوا سے چراغ گل ہو جاتا ہے نیز بلائے غم سے انسان کی شمعِ حیات بجھ جاتی ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی کا چراغ روشن قلزمِ صرصرِ غم کا مرجاں ہے کہ اس سے اس کی ضیا باری ہے۔ اور اسی میں پیدا ہوتا ہے یعنی بحر و مرجاں کی طرح آغوشِ بلا ہی میں عاشق کی پرورش ہوتی ہے اور اس کی زندگی کا اسی روغن سے چراغ جلتا ہے۔

(ناطق) غمِ جاں گداز ہی نہ ہوں جو ہمارے دل کی لگی نہ ہو
کہ ضیاءِ نورِ حیات ہے پئے شمع سوز و گداز میں

(۲۲۴)

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے
نگاہ دل سے تری سرمہ سا نکلتی ہے

سرمہ کھانے سے آواز بیٹھ جاتی ہے کسی شخص کو بے محل خاموشی اختیار کرنے پر کہتے ہیں کہ انھوں نے سرمہ کھایا ہے۔ نگاہ کا سرمہ سا ہونا وجہ زینت ہے۔ نگاہِ معشوق کو چشمِ سخن گو باندھتے ہیں یہاں خاموشی کو سرمہ سے تعبیر کیا ہے۔ کہتے ہیں تری خاموشیوں میں بھی کیا پیاری ادا نکلتی ہے کہ نگاہِ چشمِ سخن گو دل ہی سے سرمہ آلود ہو کر باہر آتی ہے۔

فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے

شبنم کو عرقِ انفعال سے تعبیر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ صبا اگر کبھی غنچے کی خلوت میں جا نکلتی ہے تو وہ اسے اس زور سے آغوش میں دباتا ہے کہ شرم سے آب آب ہو کر شبنم بن جاتی ہے۔ یا یہ کہ تنگیِ غنچہ اس طرح دبا کر نچوڑتی ہے کہ صبا ہمہ تن آبِ شبنم ہو جاتی ہے۔

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ
کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

آبِ تیغِ نگاہ تیزیِ تیغِ نگاہ۔ ہوا اسی روزن سے نکلتی ہے جو آر پار ہو۔ زخمِ تیغ کے متعلق مصنف نے لکھا ہے کہ "وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے" کہ یہ ایک دروازہ سا کھول دیتا ہے۔ کہتے ہیں سینۂ عاشق کے ساتھ آبِ تیغِ نگاہ نے کیا کیا اس کا حال کچھ نہ پوچھ کہ ایک دروازہ آر پار کھل گیا ہے جس میں سے بے تکلف ہوا نکلتی ہے۔ یا یہ کہ ایسا زخم لگا ہے کہ سینہ سے ہوا کا اخراج ہوتا ہے اور جب زخمِ صدر سے ہوا کا اخراج ہو تو وہ مہلک ہوتا ہے۔ یا ہوا بمعنی خواہش و تمنا ہے۔ حسرتِ دل سے کہتے ہیں تو نے سینہ میں جو زخم کھول دیا ہے اس سے ہوا یعنی تمنا نکلی جا رہی ہے اب کیا پوچھنا ہے جب ہوا ہی نہیں رہے گی تو اس کا پانی کیا رہے گا۔ یا ہوا جس انداز سے نکل رہی ہے اس کا اثر یہ ہوگا کہ سارا پانی خشک ہو جائے گا یا اڑ جائے گا۔

(۲۲۵)

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے
نافہ دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے

معشوق کو ترک باندھتے ہیں اور ترکانِ تاتار مشہور ہیں۔ مشک نیپال میں بھی ہوتا ہے اور تاتار میں بھی لیکن مشک ختن مشہور ہے جو شہر ختن کے نواح میں نکالا جاتا ہے اور اچھا ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ تاتار کے اس حصہ میں جہاں نسیم زلفِ یار کی شانہ کشی کرتی اور اس کی خوشبو سے معطر ہو کر شامہ نوازی کرتی ہے وہاں آہوئے دشتِ تاتار کا دماغ بھی مشک بن جاتا ہے۔ مشک کی خوشبو نافہ آہو سے ہے جو تاتار کے ہرن کی ناف سے نکلتا ہے لیکن زلفِ مشکیں کی خوشبو دماغِ آہو کو بھی نافہ بنا دیتی ہے۔

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
آئینہ فرشِ شش جہت انتظار ہے

یا اللہ حیرت کس کے جلوے کے سراغ میں ہے کہ شش جہتِ انتظار کا فرش آئینہ بنا ہوا ہے یعنی ہر چیز ایک آئینۂ حیرت ہے تیرے جلوۂ ذات کا نظارہ تو دور رہا انتظارِ جلوہ ہی نے شش جہتِ عالم کو آئینہ بنا رکھا ہے۔ یہاں "کس کا" سے مراد ہے "سوائے ترے اور کس کا"

(ناطق) عقل گم ہے مری آئینۂ عرفاں ہوں میں
فرق سے تا بہ قدم دیدۂ حیراں ہوں میں

ہے ذرہ ذرہ تنگیِ جا سے غبارِ شوق
گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

موجودات کا ہر ذرہ عالمِ وجود کی تنگی سے حسبِ خواہش ہاتھ پاؤں پھیلانے کی تمنا پوری نہ ہونے پر ایک غبارِ شوق بنا ہوا ہے اگر ہر طرف یہی دامِ آرزو ہے تو صحرائے وجود کی وسعت اسیرِ تمنا ہو کر رہ جائے گی۔ یا یہ کہ غبارِ شوق تنگیِ جا سے پھیلنے کی جگہ نہ پا کر ذرہ ذرہ ہو کر بکھرا جا رہا ہے اگر یہ دامِ شوق بصورتِ ذرات اسی طرح بچھا تو وسعتِ صحرا کو شکار کرے گا یعنی اس پر حاوی ہو کر سارے صحرائے وجود کو گرد کر دے گا۔

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

نظارہ کا مقدمہ جس میں پہلے نگاہِ ناز پر دعویٰ کر کے ہار چکے ہیں اب پھر چلا ہے اس وقت دل نے چشمِ شوق پر دعویٰ کیا ہے کہ اس نے مجھے تباہ کیا اس سے پہلے ایک غزل میں "پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز" زلف کی پھر سرشتہ داری ہو" لکھ کر کئی شعر مقدمہ بازی کی اصطلاح کے لکھ آئے ہیں۔

چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پہ آب
اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے

جس طرح ہندوستان میں فرقۂ امامیہ کے خاندان وقتِ وداع جانے والے کے بازو پر امام ضامن کا حسبِ حیثیت روپیہ یا پیسہ باندھتے ہیں اسی طرح ایران میں رسم تھی کہ بوقتِ رخصت جانے والے کے عزیز آئینہ پر سبز پتے رکھ کر پانی چھڑکتے اور اس میں اس کا منہ دیکھتے تھے جسے صحیح سلامت اور بامراد واپس آنے کا شگون جانتے تھے۔ یہ آمدِ بہار کی خبر سن کر سیرِ گلستاں کو گئے ہیں اور پھولوں کو شبنم سے تر پا کر کہتے ہیں کہ صبحِ بہار ہی وداعِ بہار کا وقت ہے اے عندلیب دیکھ لے کہ شبنم آئینۂ برگِ گل پر پانی چھڑک رہی ہے اس مضمون کے کئی شعر اور لکھے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔

(غالب) آغوشِ گل کشادہ برائے وداع ہے
اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

نچ آپڑی ہے وعدۂ دیدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

معشوق نے آنے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اس کا انتظار کر رہے ہیں کوئی کہتا ہے میاں کیوں پاگل بنے ہو کبھی اس نے وعدہ پورا کیا ہے جواب کرے گا اس کا اس شعر میں جواب دیتے ہیں۔

بے پردہ سوئے وادیِ مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرے کے نقاب میں دل بے قرار ہے

دشتِ مجنوں کا ہر ذرہ شوقِ مجنوں کے اثر سے در پردہ ایک دلِ بے قرار بنا ہوا ہے اس لئے اے لیلیٰ یا اے رشکِ لیلیٰ دشتِ مجنوں میں بے پردہ نہ جا کہ لاکھوں دیوانگانِ شوق دامنگیر ہوں گے یا صحرائے وجود کو مقامِ عشق ہونے کے لحاظ سے وادیِ مجنوں کہا۔ کہتے ہیں اے حسنِ ذات صحرائے وجود کا ہر ذرہ

اضطرابِ عشق کا مادہ ہے تو یہاں پردہٗ مجاز کو اتار کر نہ آنا کہ اس طرح ہر طرف آگ لگ جائے گی جس کے ثبوت میں تجلّی طور موجود ہے۔

(ناطق) گردِ ہر محمل غبارِ دشتِ مجنوں سے ہے رواں
اب تک اپنی دشمن کی دیوانی ہے دیوانے کی خاک

اے عندلیب یک کفِ خس بہر آشیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

اے عندلیب آشیانہ کے لئے مٹھی بھر تنکے اٹھا کر رکھ کہ فصلِ بہار کی آمد آمد کا طوفان مچا ہوا ہے دیکھ پھر ہر طرف سبزہ و گل کے سوا کچھ نہ ملے گا اور تو آشیانہ نہ بنا سکے گا۔

دل مت گنواں خبر نہ سہی سیر ہی سہی
اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے

آئینہ اسکندری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ واقعاتِ عالم کی خبر دیتا تھا آئینۂ دل کو تمثال دار آرزو باندھتے ہیں۔ سیر بمعنی تماشا کہتے ہیں اے بے دماغ آئینۂ دل اگر آئینۂ اسکندری کا کام نہیں دیتا تو بھی اسے ضائع نہ کر کیونکہ تمثال دار آرزو ہے اگر اس سے کوئی خبر نہیں ملتی تو عالمِ آرزو کی تصویروں کی بہار ہی سہی۔ یا یہ کہ اگر دل حقیقت سے بے خبر ہے تو بھی بے کار نہیں اس سے آرزو ہی کا لطف اٹھا۔ یہاں لفظِ "خبر" اور "سیر" میں محدثین کی خبر اور سِیَر سے ایہام کیا ہے کہ سِیَر اخبار کے بعد واجب العمل ہوتی ہیں۔

خبر حدیثِ نبوی کو کہتے ہیں جس میں پیغمبرِ اسلام کا کوئی حکم یا عمل ہو یا کسی کے عمل پر آپ نے سکوت اختیار کر کے اسے برقرار رکھا ہو اور سِیَر انھیں باتوں کے ساتھ پیغمبرِ اسلام سے نہیں بلکہ ان کے صحابیوں سے جو کچھ منسوب ہوا سے کہا جاتا ہے آئینہ تمثال دار ہے یعنی آئینۂ صحابہ میں پرتوِ رسول موجود ہے یعنی یہ کہ بیگانۂ مذہب ہو کر دل مت گنواں یعنی گمراہ نہ ہو اگر کوئی حدیثِ رسول تجھے پیروی کے لئے نہیں ملتی تو سیرِ صحابہ سے مدد لے حدیث میں آتا ہے کہ میرے صحابی نجوم درخشندہ کے مانند

ہیں تم جس کی پیروی کرو گے ہدایت حاصل کر لو گے۔ مگر یہاں لفظ سیر بسکون یا ہے اور سِیَر میں سین بالکسر ہے اور یا مفتوح۔ بے دماغ ناسمجھ۔

غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط
اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

غفلت نے ساری عمر کا ذمہ لے لیا اور غالبؔ صاحب عیش و عشرت کے ضمانت دار ہو گئے یعنی زندگی کو سپردِ غفلت کر کے غالبؔ محوِ نشاط ہو گیا ہے اس حالت کو کیا کہیں گے ننگِ وجود جس سے موت بہتر ہے کیونکہ انسانی ہستی تو پاسِ انفاس اور دردِ عشق کے لئے ہے اس لئے کہتے ہیں کہ اے مرگِ ناگہاں ایسی بے کار ہستی کو مٹانے میں تجھے کس بات کا انتظار ہے یہ تو نے کیوں دیر لگا رکھی ہے۔ یہ جتنا اچھا شعر ہے اتنا ہی مشہور بھی ہے۔

(ناطق) بھولا ہوا پھرتا ہے دل اپنی حقیقت کو
لے اے غمِ ہستی لے اک محوِ مجاز آیا

(۲۲۶)

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

معشوق کو دعویٰ ہے کہ ہم سا کوئی ہو تو لا کر بتاؤ یہ آئینہ پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے یہ کیا تماشا۔ تو جواب میں شعر پڑھتے ہیں۔

حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں
گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

خیالِ نظر یا حسرتِ دید کو مصنف نے نگاہ سے تعبیر کیا ہے۔ ؏
نگاہ دل سے ترے سرمہ سا نکلتی ہے

معشوق کی بزمِ خیال دلِ عاشق جس میں ہر طرف اس کا نقشِ آرزو ہے۔ کہتے ہیں

سویدا اسے دل نگاہ کے گلِ نرگس کا ایک گلدستہ ہے جسے حسرتِ دید نے تری بزمِ خیال
یعنی میرے دل میں رکھ دیا ہے۔

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا!
افسونِ انتظار تمنّا کہیں جسے

اہلِ محبت اہلِ تمنا ہوتے ہیں اور تمنا کا لازمہ یا دوسرا نام ہے انتظار۔ کہتے ہیں
اللہ اہلِ محبت کے ساتھ تمنا بھی آپ ہی آپ پیدا ہو جاتی ہے اور اہلِ محبت
سراپا انتظار بن جاتے ہیں گویا کوئی ان کے کان میں تمنا کا جادو پھونک دیتا ہے۔

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالئے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

یہاں درد بمعنی غم ہے۔ غریبی مبدۂ ذات جدائی۔

(مولانا روم) بشنو از نے چوں حکایت میکند
از جدائی ہا شکایت میکند

اہلِ ماتم سر پر خاک ڈالتے ہیں۔ ان کی عالی ہمتی کے لئے صحرا ایک مشتِ خاک
ہے۔ وطن کی محبت میں انسان دنیا کو یا مبدۂ ذات کے خیال میں صوفی عالم
کو ہیچ سمجھتا ہے اور ہیچ کے لئے خاک کا بھی استعمال ہے چنانچہ کچھ نہیں کی جگہ خاک
رکھا ہے بولتے ہیں۔ صحرا سے مراد ہے صحرائے وجود۔ کہتے ہیں رنج غریب الوطنی میں
سر پر وہ مشتِ خاک ڈالئے جس کا نام صحرائے وجود ہے۔ حاصل یہ کہ مبدۂ
ذات سے علحدگی کا غم ایسا نہیں کہ انسان عالمِ وجود کو خاک نہ کر ڈالے اور یہ
خاک اپنے سر پر نہ ڈال لے یعنی خود خاک نہ ہو جائے۔

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

شوقِ عناں گسیختہ بے اختیار اشک باری۔ اشک باری کی روانی کے لئے انھوں
نے ایک شعر لکھا ہے جو اس دیوان میں موجود نہیں۔

(غالب) آنسو کہوں کہ آہ سوارِ ہوا کہوں
ایسا عناں گسیختہ آیا کہ کیا کہوں

کہتے ہیں حسرتِ دیدار نے آنکھوں میں دریا باری کا جذبۂ بے اختیار پیدا کر دیا
ہے جو روکے نہیں رکتا۔

درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو
صبحِ بہار پنبۂ مینا کہیں جسے

جس طرح پہلے مصنف نے بیامن پنبہ کو شبِ ماہ بنایا ہے اسی طرح اسے یہاں
بہ لحاظِ سفیدی بہار کی صبحِ نور سے مشابہ کیا ہے یوں بھی اصطلاحِ عوام میں روئی
کو نور کہتے ہیں۔ مجھے یہاں اپنا ایک شعر یاد آیا ؎

(ناطق) کہے واعظ بھی ہاں نورٌ علیٰ نور اس کو کہتے ہیں
جو دیکھے پنبۂ مینا پہ عالم ریشِ قاضی کا

جس طرح گلہائے باغ کو کھلنے کے لئے صبحِ بہار کی ضرورت ہے اسی طرح گلہائے
عیش کے کھلنے کے واسطے وہ صبحِ بہار درکار جسے پنبۂ مینا کہتے ہیں یعنی شراب کے
بغیر عیش کی گل کاریاں نہیں ہو سکتیں۔ بعض شعراء کا فتویٰ ہے کہ شراب کے
بغیر شاعری بھی نہیں ہو سکتی۔ اور آج کل کا رجحان عام یہی بتا رہا ہے کہ عورت
اور شراب ہی حاصل خیال و غزل ہیں۔

غالبؔ برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچھا کہیں جسے

اے غالبؔ دنیا میں ایسا تو کوئی نہیں جسے سب اچھا کہتے ہوں پھر تجھی کو اگر ایک
واعظ برا کہتا ہے تو اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے رند تو سارے ترے
مدّاح ہیں۔

———٭———

(۲۲۷)

شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی زِ ادا ہے
داغِ دلِ بیدرد نظر گاہِ حیا ہے

قطراتِ شبنم کو عرقِ ندامت سے تعبیر کیا۔ لالہ کا داغ مشہور ہے لیکن اس میں درد نہیں۔ کہتے ہیں گلِ لالہ پہ قطراتِ شبنم اس خاص انداز سے خالی نہیں کہ جس دل میں داغ ہو اور درد نہ ہو وہ ایک بے شرمی کا مظاہرہ ہے۔

(آتش) دعویٰ کیا تھا گل نے اس بت سے رنگ و بو کا
ماریں صبا نے دھولیں شبنم نے منہ میں تھوکا

دل خوں شدہ کشمکشِ حسرتِ دیدار
آئینہ بدستِ بُتِ بدمستِ حنا ہے

معشوق بدمستِ حنا ہے کہ پاؤں کی مہندی کے شوق میں جس نے پیدا ہو کر حسرتِ دیدار نکالنے سے باز رکھا اور دل کا کشمکشِ حسرتِ دیدار میں خون کیا ہے۔ کہتے ہیں دل میں جو کشمکشِ حسرتِ دیدار میں خون ہوا اس کی حالت بُتِ بدمستِ حنا کے ہاتھ سے آئینہ ہے یعنی ظاہر ہے یعنی دستِ حنا آلود میں دلِ خون گشتہ کا نظارہ ہے جیسے وہ بُتِ بدمست دیکھ کر نازاں ہوتا ہے۔

شعلہ سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے

ہوس کا استعمال یہاں بمعنی آرزو ہے۔ شعلہ سے مراد ہے آتشِ عشق۔ جو بات ناگوارِ خاطر ہو تو اس کے لئے کہتے ہیں کہ اس سے جی جل گیا یا جی جل کر کباب ہوگیا کہتے ہیں آرزو تو یہ تھی کہ آتشِ شوق جلاتی لیکن بوجہ افسردہ خاطری یہ بات میسر نہ ہوئی تو اس پر ایسا جی جلا ہے کہ اگر آتشِ عشق بھی میرے خرمنِ وجود کو جلاتی تو شاید اتنا نہ جلاتی۔

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
آئینہ بہ اندازِ گل آغوشِ کشا ہے

نسیمِ سحر کو شوخ باندھتے ہیں جس کے لئے شوقِ گل آغوش کشائی کرتا ہے۔

(غالب) گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے
ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

تمثال سے یہاں مراد ہے عکسِ جلوہ جلوۂ معشوق کو بہ لحاظ روح پرور ہونے کے نسیمِ جلوہ بھی کہتے ہیں۔ کہتے دم جلوہ تیرا عکس ایسی شوخی دکھاتا ہے کہ جس کے لئے آئینہ بھی باندازِ گل کشائی کرتا ہے یعنی یہ آتا ہے اور شوخی سے نکل جاتا ہے آئینہ کی یہ حالت ہے کہ وہ باندازِ گل آغوش کشا ہو کر رہ گیا ہے اس سے بہ عالمِ حیرت یہ بھی نہیں ہوتا کہ آغوش میں لے لے اور جانے نہ دے۔

(داغ) ہٹ گئی پڑ کے آئینہ پہ وہ آنکھ
عکس کا انتظار کون کرے

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

نالہ کشی نے تین کو جلا کر خاک کر دیا ہے۔ ایک قمری دوسری بلبل تیسرا ان کا جگر۔ دیکھتے ہیں کہ کفِ خاکستر سے قمری کا نشان ملتا ہے اسی طرح پابندیِ رنگ سے بلبل کا خیال آجاتا ہے تو یہ دونوں ان دو مرحومین کے نشان اور ان کی یادگار ہوئے اب جو خیال کرتے ہیں تو تیسرے جگرِ سوختہ کا نشان انہیں کچھ نہیں ملتا اس لئے نالہ سے دریافت کرتے ہیں اور اس سوال کا مطلب یہ ہے کہ تو نے ہمارے جگر کو تو ایسا جلایا کہ اس کا نام و نمود کچھ باقی نہ رکھا میرابائی کا ایک مشہور دوہا ہے۔

لکڑی جل کوئلہ بھئی کوئلہ جل بھئی راکھ
میں پاپن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ

یا یہ کہ انہیں بہ لحاظِ نالہ کشی اپنے دل سوختہ کے نشان نالہ کی طرف سے قمری اور بلبل بتائے جاتے ہیں یہ کہتے ہیں کہ ان دونوں میں کیا رکھا ہے ایک کفِ خاکستر ہے

اور دوسرا قفسِ رنگ ان میں کون سی ایسی بات ہے جسے میں اپنے جگرِ سوختہ کا نشان سمجھوں۔ خود مصنف نے اس شعر کا مطلب یہ بتایا ہے کہ قمری جو ایک کفِ خاکستر اور بلبل جو ایک قفسِ عنصری سے زیادہ نہیں ان دونوں کے جگر سوختہ ہونے کا ثبوت صرف ان کے چہکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔ اگر مصنف نے یہاں "اے" کی جگہ "ہے" یا "جز" استعمال کیا ہوتا تو یہ مطلب صاف ہو جاتا۔

خو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو
معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

وحشتِ دل سے مراد ہے جنونِ عشق۔ کہتے ہیں تجھ میں جو تیرِ غمزہ و تیغِ نظر کے وار کرنے کا حوصلہ نہیں اس سے میری وحشتِ دل افسردہ ہو گئی معشوق ہو کر تیری ایسی بجھی ہوئی طبیعت جس میں شوخیوں کا نام نہیں اور ان باتوں سے ڈرنے کی عادت اک عجب بلا ہے۔ یا یہ کہ تو جو التفات سے جھجکتا ہے اور میری طرف بڑھنے کا حوصلہ نہیں کرتا تیری اس خشک عادت نے میری طبیعت کو افسردہ کر دیا۔

مجبوری و دعوائے گرفتاریِ الفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

کسی سے پیماں باندھنے کے لئے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں اس میں ایک ہاتھ نیچے آتا ہے۔ پتھر کے نیچے جو ہاتھ دب جائے اسے پیمانِ وفا کہنا بہ عالمِ مجبوری بات بنانا ہوا۔ کہتے ہیں اگر کوئی کسی وجہ سے دب گیا ہے اور اظہارِ عشق پر مجبور ہے تو اس کے دعوائے گرفتاریِ الفت کی مثال ایسی ہے جیسے دستِ تہِ سنگ آمدہ کو پیمانِ وفا ٹھہرائیں۔

معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ
تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے

تیری تیغِ ستم ایک آئینۂ تصویر نما ہے کہ اس کی صفائیوں کو دیکھ کر شہیدانِ گزشتہ کا حال معلوم ہو گیا اور یہ ہم سمجھ گئے کہ ان غریبوں پر کیسی کیسی مصیبتیں گزری ہوں گی۔

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب اِدھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

وقت پڑنا مصیبت میں گرفتار ہونا یا واماندہ ہونا۔ سائے کی افتادگی کو وقت پڑنے سے تعبیر کرنا مصنف کی جدت ہے۔ پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب سے مراد ہے نورِ ذات کی تجلی۔ سائے کا وجود محض ایک جسمِ حائل سے ہوتا ہے جسے سائے اور روشنی کے درمیان پردہ کہئے۔ کہتے ہیں اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب پردۂ حائل کی صفائی نے ہم پر سائے کی طرح عجب وقت لا کر ڈالا ہے تیری اک جھلک ادھر بھی ہو جائے تو کام بن جاتا ہے۔ یا یہ کہ جس طرح روشنی کے آجانے سے سایہ فنا ہو جاتا ہے اسی طرح تیرا پرتو مجھے فنا کے درجے تک پہونچا دے گا پہلے لکھ آئے ہیں۔ (غالب)

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

مصنف کا یہ شعر بہت مقبول ہے۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

یا الٰہ العالمین اگر مرے کئے ہوئے گناہوں پر مجھے سزا دی جاتی ہے تو جن گناہوں کو میں بوجہ مجبوری نہ کر سکا اور جن کی حسرت میں مرا ہوں ان کا بھی تو کچھ انصاف ہونا چاہئے۔ حاصل یہ کہ جیتے جی جو بے تعداد گناہوں کی آرزو میں داغِ حسرت کی سزا مجھے دی گئی وہی کیا کم تھی کہ اب میں تھوڑے سے گناہوں کے لئے قابلِ عقوبت ٹھہرایا جاتا ہوں۔ اس مضمون کے جو اور شعر مصنف نے لکھے ہیں وہ بھی ملاحظہ ہوں۔

(۱) آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

(۲) دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

(۳) بہ قدرِ حسرتِ دل چاہیئے ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

(ناطق) ضامن ہے بے بسی مرے حالِ تباہ کی
ہے حسرتِ گناہ سزا کس گناہ کی

بے گانگیٔ خلق سے بے دل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

اے غالب اگر تیرا کوئی نہیں تو خدا ہے پھر دنیا کی بیگانگی سے بے دل کیوں ہوتا ہے۔ بے کسی اور بے بسی کے وقت کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہمارا بھی اللہ مالک ہے یا خدا مالک ہے۔ فارسی میں بھی مصنف نے یہ مضمون لکھا ہے۔

(غالب) جہانیاں نہ تو برگشتہ اند اگر غالب
ترا چہ باک خدائے کہ داشتی داری

میری جان کا استعمال آج کل کی شاعری روا نہیں رکھتی۔ مگر اس شعر میں خاص لطف یہی ہے اور اچھا بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنی جان یعنی خود سے مخاطب ہے۔

(۲۲۸)

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

تیرے قد و رخ کا وجود کیا ہوا کہ اس کی قسمت کھل گئی کیونکہ تجلی نور ذات اپنے ظہور کے لئے ایسی ہی پیاری صورت کی متمنی تھی۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ۔

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ ترے شہیدوں پہ حور کی

حور کی عفت ضرب المثل ہے۔ قرآن میں حوروں کے لئے قاصرات الطرف آیا ہے۔ آنکھ پڑنا نظر انتخاب سے دیکھنا۔ کہتے ہیں تیرے شہیدانِ ناز کے ایک خوں چکاں کفن میں کروڑوں ایسے ایسے بناؤ ہیں کہ ان پر حوروں کی بھی نظرِ انتخاب پڑتی ہے اور وہ بھی للچائی ہوئی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ بزرگانِ دین کے قصوں میں لکھا ہے کہ شہید کی روح کو لینے کے واسطے حوریں آتی ہے یعنی انتخاب کرتی ہیں اور لینے کو دوڑتی ہیں۔

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

اے واعظ شرابِ طہور جسے تم لوگ اپنی میراث سمجھتے ہو اور جس کی اتنی لمبی چوڑی تعریفیں بیان ہوتی ہیں اس کی بھی کیا بات ہے کہ نہ تو تم ہی کو میسر آتی ہے اور نہ کسی کو اس کا مزا چکھا کر قائل کر سکتے ہو۔

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

حشر اجساد سے قاتل کو انکار تو نہیں لیکن ایسا غفلت کا متوالا ہے کہ اسے صدائے صور کی بھی خبر نہیں۔ یا یہ کہ اپنی صفائی پر حشر میں پردہ ڈالنا منظور ہے اس لئے صدائے صور سے اغماض کرتا اور مجھے دھمکا کر کہتا ہے کہ ابھی سو۔

آمد بہار کی ہے کہ بلبل ہے نغمہ سنج
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

گو بلبل کی نغمہ سنجی سے بہار کی آمد کا پتہ چلتا ہے لیکن یہ ایک اڑتی ہوئی سی خبر ہے وہ طیور کی زبانی یعنی کوئی بھروسہ کی بات نہیں یہ تو چڑیوں کے ہاتھ سندیسا ہے۔ یا یہ کہ طیور کی زبانی بہار کی آمد کی ایک اڑتی ہوئی خبر آج سنی ہے وہ کیا بلبل کی نغمہ سنجی۔ یہاں مصنف کی جدت خیال نے زمینِ شعر کو اڑا دیا ہے۔

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

گو بت اب کعبے میں نہیں لیکن کبھی وہاں رہتے تو تھے وہاں سے نکالے ہوئے ہیں تو آخر انھیں کعبے کے ساتھ نسبت تو ہے چاہے دور ہی کی کیوں نہ ہو کعبے میں رہنے سے ان کے لئے صورتِ احترام تو پیدا ہو گئی۔

(ناطق) یہ خدا کی شان تو دیکھئے کہ خدا کا نام ہی رہ گیا
مجھے تازہ یادِ بتاں ہوئی جو حرم سے شورِ اذاں اٹھا

(سعدی) صحبت نہ کند ادب فراموش

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

حضرت موسیٰ سے جو لنترانی ہوئی ممکن ہے کہ ہم سے نہ ہو۔ کلُّ یومٍ ہُوَ فِی شَان۔ اس لئے آؤ نہ ہم بھی قسمت آزمائی کر دیکھیں۔ ع

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

معشوقوں کی باتوں میں گرمی ہوتی ہے تو سہی لیکن ایسا کہیں نہیں دیکھا جیسا آپ کا طرزِ خطاب ہے کہ کسی سے سیدھی بات ہی نہیں کی جاتی ہیں تے اس مضمون کو دشمن کے سر مار کر یوں لکھا ہے۔

(ناطق) بدلا ہے ورنہ کیوں یہ طریقہ خطاب کا
تو نے عدو سے بات مگر لاکلام کی

لفظ لاکلام کا استعمال گالی گلوچ کے لئے ہوتا ہے۔

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

حضور سے مراد ہے کوئی اہلِ دولت یا نواب یوسف علی خاں ناظم فرماں روائے رام پور جو سفرِ حج کو جا رہے ہیں۔ کہتے ہیں اے غالب اگر وہ مجھے اپنے ساتھ لے چلیں تو ثوابِ حج کو حضور کی نذر کر دوں گا کسی کو حج کرانے سے حج کا ثواب ہوتا ہے۔ یا یہ کہ انھیں ممدوح کے ساتھ سفر میں جانے کی ایسی تمنا ہے کہ اگر وہ سفرِ حج میں انھیں اپنے ساتھ لے جائیں وہ حج کا ثواب اُنھیں دینے کے لئے آمادہ ہیں۔ یا یہ کہ انھیں ہم سفری کی تمنا ہے ثوابِ حج کی پرواہ نہیں اسے تو وہ ہیں حضور کی نذر کر آئیں گے یا کہ ممدوح اگر انھیں بھی سفرِ حج میں ساتھ لے چلیں گے تو ایک حج کا ثواب ملے گا۔ ؎ دل بدست آور کہ حجِ اکبر است

(۲۲۹)

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے

بودا۔ پست ہمت۔ کہتے ہیں غم کے معاملے میں دلِ ناکام بڑا ہی پست ہمت ہے اسے تو یہ تھوڑا سا غم بھی بہت ہو گیا کہ مئے گلفام ذرا سی کم ہے۔

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

میں رندِ قانع ہوں اس لئے دردِ تہِ جام بھی مل جاتی تو میرے لئے کافی ہوتی جو لے دے کر ایسے وقت میں ساقی کے پاس باقی ہے جب میں پہونچا ہوں یا جب تک میرے پاس دورِ جام آیا ہے لیکن ساقی اس خیال سے پس و پیش کر رہا ہے کہ یہ کیا دوں اور مجھے بھی مانگتے ہوئے شرم آتی ہے کہ اب کیا مانگوں کیوں کیونکہ ایسی چیز مانگنا خودداری کے خلاف ہے۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

مرغ گرفتار اپنے دل کو سمجھا رہا ہے کہ کنجِ قفس بڑی بے فکری کی جگہ ہے جہاں صیاد کے تیر جاں ستاں کا ڈر نہیں۔ یا اپنی اسیری کو پسند کرتے ہیں کہ گوشۂ زنداں میں کوئی ستانے کو نہیں آتا۔

کیا زُہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

زہد کو کیا مانئے کہ اگر اس میں ریا بھی نہ ہو تو ثواب کی آرزوئے خام خلوص کو غارت کرنے کے لئے کافی ہے۔ اسی مضمون کو پہلے یوں لکھ آئے ہیں۔

(غالب) طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

اہل خرد اپنے آپ کو طبقۂ عوام سے بالاتر سمجھتے ہیں تو ان کی کوئی روش خاص ہونی چاہئے تھی لیکن جب یہ لوگ راہ و رسمِ عام کی سختی سے پابندی کرتے ہیں تو پھر ان کے لئے کون سی بات وجہ ناز ہوئی۔ حاصل یہ کہ تقاضائے خرد یہ ہے کہ انسان کو پابندی رسم و راہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی روشِ خاص جو سب سے بالاتر ہو پیدا کرے یہ نہیں تو عقلمندی کا ثبوت کیا۔

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے؟
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

جامۂ احرام پاک ہو جائے گا جب ہی تو میں طوافِ حرم کے قابل ہوں گا کیونکہ شراب نجس ہے۔

(سعدی) مرد دامن آلودہ در جائے پاک

کسی نے اس شعر پر یہ اعتراض کیا تھا کہ ردیف میں بہت بیکار ہے حالاں کہ "بہت ہے" کا جملہ بہت صاف ہے یعنی جامۂ احرام اتنا مے آلود ہے کہ چھپ نہیں سکتا۔ چند قطرے ہوتے تو ان کی اور بات تھی۔

ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ اُن کو
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

ابرام اصرار اس کا مفرد استعمال اب اردو میں درست نہیں۔ یہ روزمرہ کے استعمال کا لفظ نہیں۔ کہتے ہیں اُنھیں انکار نہیں اور مجھے بہت اصرار ہے اس وقت بھی اگر مدعا برآری کا موقع نہ نکلے تو قہر کی بات ہے۔

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

میں یہاں یعنی دنیا میں کارِ عشق کے لئے آیا تھا جس کا بڑا حصہ جگر کو خون کر کے آنکھ سے بہا دینا ہے یہ ابھی تک ہوا نہیں یعنی بہت کام باقی رہ گیا اب جو موت لے چلنے کے لئے آئی ہے تو یہ آنا بے محل ہوا اس لئے کہتے ہیں کہ مجھے ابھی یہاں رہنے دے کہ اگر یہ کام پورا کئے بغیر مر جاؤں گا تو تکمیلِ فرض نہ ہو گی جس کے لئے میں یہاں آیا تھا ایسی حالت میں وہاں جا کر کیا جواب دوں گا۔

(ناطق) تاپنا تھا مجھے غم عمر کے پیمانے سے
رہ گیا کام ادھورا میرے مر جانے سے

ہو گا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

یہ تو بات ضرور ہے کہ غالبؔ اچھا شاعر ہے لیکن بدنام بھی بہت ہے کہ ایسا کوئی نہیں جو اسے نہ جانتا ہو اور یہ بات مسلمہ ہے کہ جسے زیادہ لوگ جانتے ہیں اس کے بدگو بھی زیادہ ہوتے ہیں اس لئے اس کا جانا جانا غالب کی وجہ بدنامی

ہے۔ یا یہ کہ اس میں مے نوشی کی ایسی بدعادت ہے کہ ہر شخص اُسے جانتا ہے اور ہر محفل میں اس کی بدنامی ہے۔

(۲۳۰)

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

آبِ آتشیں کو چراغ سے تعبیر کیا۔ کہتے ہیں بہت دنوں سے ہماری بزم کو جوشِ قدح سے چراغاں ہونے کی نوبت نہیں آئی اور ہوتی بھی کہاں سے یار ہی مہمان نہیں ہوا جس کے ساتھ لطفِ مے نوشی ہے اور جس کی تاب رخ سے نور ساغر ہوتا ہے۔ میری ایک غزل اس زمین میں موجود ہے جو ایک دوست کی فرمائش پر مصنف کے قوافیہ میں لکھی گئی تھی جس کے بعض اشعار جو یاد آئے نقل کئے جاتے ہیں۔

(ناطقؔ) بیٹھا ہوں برقِ طور کو مہماں کئے ہوئے
ذروں کو دشتِ غم کے چراغاں کئے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

پہلی دعوتِ مژگاں میں جو جگر چھلنی ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہوا اور بکھر گیا تھا اسے اب پھر جمع کر رہا ہوں کہ اس کی مہمانی کا دوبارہ لطف اٹھاؤں۔

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

دم رکنا سانس گھٹنا گھبرانا الجھن ہونا پریشاں ہونا۔ کہتے ہیں چاک گریباں کی بہار دیکھتے ہوئے مدت ہوگئی اس لئے وضعِ احتیاط سے جو اس سے بغض رکھتی ہے پھر دم رکنے لگا ہے اب مجھے مجبور ہو کر گریباں دری کرنی پڑے گی۔

(ناطقؔ) دیوانہ دار چرخ ہے گرداں بکوئے ناز
نورِ سحر سے چاک گریباں کئے ہوئے

پھر گرم نالہ ہائے شرربار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے

دل چاہتا ہے کہ نالۂ شرربار کی جو سیر دیکھ چکے ہیں جس سے ہر طرف آگ لگ گئی تھی اسے پھر دیکھیں اس لئے نفس پھر سرگرم نالہ ہائے شرربار ہے۔

(ناطقؔ) ہے تابِ حسن باعثِ سوزِ دل و جگر
یہ گھر ہیں آپ ہی کے چراغاں کئے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

حضرتِ عشق پھر پورے سامان کے ساتھ زخمِ دل کی مزاج پرسی کو تشریف لارہے ہیں۔ سامانِ صد ہزار نمکداں یعنی ذوقِ حسنِ ملیح۔

(ناطقؔ) مہمانِ غم ہوں ذوق ہے حسنِ ملیح کا
بیٹھا ہوں زخمِ دل کو نمکداں کئے ہوئے

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کئے ہوئے

پھر دامن پر گل بوٹے بنانے کا ارادہ ہے اس لئے اپنے خامۂ مژگاں کو خونِ دل کی سیاہی سے بھر رہا ہوں اب دیکھنا اس کی تراوش سے کیسی کیسی گلکاریاں ہوتی ہیں۔

(ناطقؔ) کس شان سے چلی ہے براتِ جنونِ عشق
دامن کو جیب جیب کو داماں کئے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

دل کو اسے آغوشِ تصور میں لینے کا خیال ہے اور آنکھ کو آغوشِ نظارہ میں

لینے کا اس سامان سے دونوں میں پھر رقابت کی صورت پیدا ہوگئی اس خیال کو مصنف نے بار بار باندھا ہے چنانچہ ایک شعر یہ ہے۔

(غالبؔ) نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

(ناطقؔ) ہے ہر نفس یہاں دمِ شمشیر کا جواب
جیتے بھی ہیں تو موت کا ساماں کئے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

پندار خودداری کے لئے بھی آتا ہے اور خودی کے لئے بھی یہاں مصنف نے خودی کے خیال سے لکھا ہے جو صنم کدہ شرک ہے کہ اسے خود پرستی کہتے ہیں۔ کوئے ملامت کوئے عشق۔ حدیث میں آتا ہے کہ خدا کی اس طرح عبادت کر اور یہاں تک عبادت کر کہ لوگ تجھے دیوانہ کہنے لگیں۔ کہتے ہیں کہ صنم کدۂ پندار کو ویران کر کے جس نے اسے پہلے راہِ سلوک سے روکا تھا دل پھر کوئے ملامت کے طواف کو روانہ ہو رہا ہے یعنی خودی پر خاک ڈال دی اور خدا یاد آگیا۔

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

پھر سودائے عشق سوار ہوا ہے اور بازارِ محبت میں اس سامان کی دکان لگا کر بیٹھے ہیں جسے عقل دل اور جان کہتے ہیں کہ کوئی اہلِ ناز و غمزہ ان کی قیمت لگانے کے لئے خریدار مل جائے تو دام کھرے کر لیں۔

(ناطقؔ) اللہ رے ذوقِ لذتِ غم جس کے فیض سے
رکھتے ہیں جان و دل کو دل و جاں کئے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

نگاہ کو بصد رنگ گلستاں بنانے کا سامان ہے اس لئے پھر ہر گل و لالہ کے نظارہ کی طرف خیال دوڑ رہا ہے۔

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دل فریبیِ عنواں کئے ہوئے

پھر مجھے تمنا ہے کہ نامۂ دلدار کھولنے کا موقع ملے یعنی اس کا خط آئے اور میں جان کو عنوانِ دل فریب کی نذر کرتے ہوئے کھولوں۔

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

تمنا ہے کہ کسی کا نظارۂ جمال پھر لبِ بام ہو اور اب کی مرتبہ رُخ پر زلفِ سیاہ کو چہرے پر پریشاں کئے ہوئے آئے۔

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

آرزو یہ چاہتی ہے کہ معشوق پھر سامنے آئے مگر اب کے دشنۂ مژگاں کو سرمے سے آب دے کر آئے کہ میرا کام تمام ہو جائے۔

اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

نگاہ ایک نو بہارِ ناز کی تاک میں ہے کہ پھر کسی طرح بہارِ نظارہ کی رُت آئے اور وہ سرو لے مے سے باغ باغ دکھائی دے۔

(ناطقؔ) محوِ نظارہ دیدۂ نرگس سے ہے بہار
ہر گل کو نو بہارِ گلستاں کئے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

پھر جی چاہتا ہے کہ معشوق کے دروازہ پڑے رہیں اور اب کے ایسا شوق دامنگیر ہے کہ درباں کا احسان اُٹھانا جو پہلے عار تھا۔ وہ بھی منظور ہے۔

(ناطق)
ہے تم کو گھر پہ ناز مصیبت کی بات ہے
جا دادِ بد مزاجی درباں کئے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

دل پہلے کی فرصت کو ڈھونڈتا ہے کہ جب تصورِ جاناں میں بیٹھنے کا لطف تھا۔ یا یہ کہ ان فرصت کے شب و روز کو جو میسر نہیں دل پھر ڈھونڈتا ہے جب تصورِ یار میں بیٹھے رہتے تھے۔ بڑا اچھا شعر ہے بہت مشہور ہے اور ایک متبزل قافیہ کو بڑے کمال سے نظم کیا ہے۔

(ناطق)
تصدیق ہے یہ خلوتِ آئینہ خامشی
تصویر ہے تصورِ جاناں کئے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

غالب ہم نے جوشِ اشک سے پھر طوفان برپا کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے اگر تو اس وقت چھیڑے گا تو مصیبت آجائے گی۔

(۲۳۱)

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

دوست نے مجھ پر ہر ممکن طریقے سے جفا کر لی اس لئے آسمان کے لئے کوئی نئی طرزِ ستم باقی نہیں رہی کیونکہ وہ بھی سوچتا ہے کہ اب اس پر جفا بھی کروں تو کیا کروں اور اس طرح بیدادِ دوست میرے لئے نویدِ امن ہو گئی کہ اب آسمان کے لئے کوئی جفا نے تو باقی نہیں رہی اور وہ مجھ پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونچکاں کیلئے

اگر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے تو ہو میں اس کی پرواہ کر کے سارا ہی خونِ جگر تو اس کی نذر نہیں کر سکتا آخر اپنی مژگانِ خونچکاں کے لئے بھی تو اس کی ضرورت ہے اسے بھی تو بے رونق نہیں رکھا جاتا۔

(غالب)
دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ و لیکن ناچار
پاسِ بے رونقیِ دیدہ اہم ہے ہم کو

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

اے حضرت خضر ایک ہماری چند روزہ زندگی ہے کہ ہم لوگوں سے روشناس ہوتے ہوئے ہنس بول کر اس کا لطف اُٹھاتے ہیں اور ایک تمہاری حیاتِ جاوید کہ تمہیں کسی سے ملنے کی بھی چوری ہو گئی۔

(ناطق)
پھرے جاؤ خضر تم منہ چھپائے رہتی دنیا تک
جیو اور لطفِ عمرِ جاودانی دیکھتے جاؤ

لفظ خضر بکسرِ خاد سکونِ ض بھی درست ہے اور بہ فتح ض بھی یہ اردو کا استعمال ہے لیکن عربی میں اس کا صحیح لفظ بہ فتح خاد کسرِ ض ہے

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے

تیری ادا اک بلا ہے جو میرے ساتھ سارے جہاں پر نازل ہوتی ہے اس لئے

میں بلا میں بھی مبتلائے آفتِ رشک ہوں کہ اس میں میری تخصیص نہیں پہلے لکھ آئے ہیں۔

(غالب) قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو — کاش کے تم میرے لئے ہوتے

(داغ) شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری
غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
دراز دستیِ قاتل کے امتحاں کے لئے

مصنف نے یہاں درازدستی سے دوری کو پیدا کیا ہے کہ اس کی دست درازی دور رہ کر بھی ان تک پہونچ جاتی ہے دست درازی کے اصل معنی ہیں زیادتی ظلم۔ کہتے ہیں اے آسمان اگر تجھے قاتل کی درازدستی کا امتحان کرنا ہے تو کیا اس کے لئے ایک میں ہی رہ گیا ہوں آخر اوروں کو بھی دعوائے جاں نثاری ہے یہ امتحان انھیں دور رکھ کر کیوں نہیں لیا جاتا۔ میری تو یہ تمنا ہے کہ میں اس سے قریب ہوں اور وہ بالمقابل مجھ پر ظلم کرے کہ یوں لطفِ ستم کشی ہے۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

میری سعیِ بے محل یا سعیِ غلط کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مرغ اسیر قفس میں آشیانہ بنانے کے لئے تنکے فراہم کرے۔ حاصل یہ کہ قفس عنصری کو گھر سمجھنا یا قید خانۂ عالم میں گھر بنانے کی فکر کرنا بے محل بھی ہے اور قابلِ رحم بھی۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

درِ دوست پر جو میں بحالِ تباہ جا بیٹھا تو دربان نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی کیونکہ وہ سمجھا کہ کوئی سائل ہے۔ لیکن میری جو شامت آئی تو اس کی خاموشی کو بربنائے رحم سمجھ کر اٹھا اور اٹھ کے پاؤں پڑنے لگا اور خوشامد کی کہ اندر

جانے کی اجازت دیدے۔ بس پھر کیا تھا غضب ہی تو آ گیا۔ بہ ہزار ذلت اس نے مجھے دھکے دے کر دور کر دیا۔

بہ قدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

تنگنائے تنگ گلی۔ کہتے ہیں غزل کا دائرہ محدود ہے اور میرا شوق وسیع اس لئے اب اپنے بیاں کو آگے بڑھاتا ہوں اور دوسرے رنگ میں چلتا ہوں۔

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

جس وقت یہ غزل لکھی گئی ہے اس وقت تجمل حسین خاں فرخ آباد کے نواب تھے جنھوں نے انھیں اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی تھی لیکن یہ نہ جا سکے اس لئے اشعارِ مدح غزل میں شامل کر انھیں بھیج دیئے تھے۔ مطلب یہ کہ عیش کو خدا نے میرے ممدوح کے لئے خصوصیت سے بنایا ہے اور خلق کو جو کچھ حصہ اس میں سے مل گیا ہے وہ صرف نظر گزر کا ہے۔ یہ رسم ہے کہ امیروں کے دسترخوان پر جو کھانے چنے جاتے ہیں ان میں سے تھوڑا تھوڑا نکال کر کسی کو دیدینے کے لئے علیحدہ رکھ دیا کرتے ہیں جسے حق الناظرین کہتے ہیں

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا؟
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

یا اللہ زبان پر یہ کس کا ذکرِ شیریں یعنی پیارا نام آیا کہ میری قوتِ ناطقہ نے میری زباں کے بوسے لے لئے یعنی میرے منہ کو چوم لیا مصنف کا یہ شعر بہت مشہور ہے اور بوقتِ مدح بہت پڑھا جاتا ہے۔

نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک
بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لئے

پہلے مصرعہ میں نواب تجمل حسین خاں کے خطاب نصیر الدولہ معین الملک کی طرف اشارہ ہے ۔ دین و ملت کو برائے بیت یہاں لائے گئے لیکن حسنِ بیان میں اضافہ بھی ہو گیا ۔ دوسرے مصرعہ میں ممدوح کی علوِ مرتبت کو بیان کرتے ہیں کہ عرشِ بریں کی ساخت اس کا آستانہ بننے کے لئے ہے ۔

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

کیونکہ ممدوح کا نام تجمل ہے اس لئے اس کے عہد میں زمانہ بھی محوِ آرائش ہے ۔ اس وقت آسمان کے پرانے ستارے نکال کر نئے ستاروں سے اس کی از سرِ نو زینت آ جائے گی ۔

غالبؔ کے متعلق ایسی روایت ہے کہ ایک روز رات کے وقت چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے تو آسمان کی طرف دیکھ کر کہا کہ جو کام بغیر صلاح مشورہ کے ہوتا ہے وہ بے ترتیب ہی رہتا ہے ۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ اللہ میاں نے جو ستارے لگائے ہیں وہ کیسے بے ترتیب واقع ہوئے ہیں ۔ اگر کسی سے مشورہ کر لیتے تو ستاروں کو کسی ترتیب کے ساتھ لگاتے ۔ غالباً اسی خیال کے ماتحت وہ کہتے ہیں کہ تجمل حسین خاں کی بدولت زمانہ اپنی آرائش کر رہا ہے تو ستارے بھی آسماں کے لئے اور بنائے جائیں گے یا انھیں درست کر کے ترتیب کے ساتھ لگایا جائے گا جس سے رونق میں زیادتی پیدا ہو جائے گی ۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحرِ بے کراں کے لئے

سفینہ دیوان کو بھی کہتے ہیں اور کشتی کو بھی ۔ ورق تمام ہوا اور مدح پوری نہ ہو سکی ۔ بھلا ایک ایک ورق میں اس کا بیان کیونکر ہو سکتا جو ایک دریائے ناپید اکنار ہے ۔ اس کے لئے تو سفینہ کی ضرورت ہے ۔

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

غالبؔ نے غزل سے مدح کی طرف گریز کر کے نکتہ سرائی کی ادائے خاص پیدا کر دی ہے کہ یہاں قصیدہ خوانی نہیں کرنی پڑتی ۔ چند اشعار میں مطلب نکل جاتا ہے اور چونکہ یہ ایک کام کی بات ہے اس لئے یارانِ نکتہ داں کے لئے صلائے عام ہے ۔

تمام شد

ہماری مطبوعات ایک نظر میں

کتاب	مصنف	قیمت
ارمغان نعت	ساجد صدیقی	۳/۰
مقبول سلام	والی آسی	۲/۲۵
سرور جاوداں	بیکل اُتساہی	۲/۲۵
نور کی برکھا	〃	۰/۶۰
گلبانگ حرم	زائرِ حرم حمید صدیقی	۴/۰
نسیم طیبہ	جنگ بہادر خاں تابش	۲/۵۰
مدینے سے اجمیر تک	علامہ انور صابری	۲/۵۰
صدائے عارف	مولانا ابوالوفا عارف	۰/۶۰
ترانۂ نعت	عمر انصاری	۰/۶۰
موج طہور	بہزاد لکھنوی	۰/۶۰
ظہور قدسی	مولانا ماہر القادری	۰/۶۰
نوائے ایمان	نازش پرتابگڈھی	۰/۶۰
انتخاب اعلیٰ حضرتؒ	مولانا احمد رضا خاں	۰/۶۰
شمع ازل	عزیز سلونوی	۰/۶۰
گل افشانیاں	ڈاکٹر خوشتر کھنڈوی	۰/۶۰
آئینہ انوار	مولانا ضیاء القادری	۰/۶۰
منتخب سلام	ساجد صدیقی	۰/۶۰
صہبائے حرم	〃	۱/۵۰
رہبر ایشیا	〃	۳/۰
لعل و جواہر	〃	۲/۵۰
تقویۃ الایمان	مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی	۲/۰
ماثر دلاوری	مولانا ابرار فاروقی	۱۲/۰
تنقیدی مطالعے	انور سیوانی	۳/۰
تذکرۂ میر	ایم۔ کے۔ فاطمی	۴/۰
نکات الشعراء کی اہمیت	〃	۴/۰
تذکرہ گلشن گفتار	〃	۲/۰
مطالعہ مثنوی گلزار نسیم	مظفر احمد لاری	۲/۵۰
غالب کی شوخیاں	مولانا عبدالباری آسی	۴/۰
رباعیات عمر خیام پر ایک تحقیقی نظر	〃	۳/۵۰
غالب کچھ جائزے	اوصاف احمد	۲/۵۰
افکار خوشتر	ڈاکٹر خوشتر کھنڈوی	۱۰/۵۰
شام بہاراں	دَیا بریلوی	۳/۵۰
نگارخانے	زیب بریلوی	۳/۵۰
اردو کے چار مزاحیہ شاعر	احمد جمال پاشا	۳/۵۰
ملا نصر الدین کے لطیفے	〃	۴/
فن لطیفہ گوئی	〃	۳/۵۰
ہجویات میر	〃	۳/۰
شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت	〃	۳/۰
ستم ایجاد	〃	۴/۵۰
سازِ بےخودی	عمر انصاری	۶/۰

اس مختصر فہرست کے علاوہ ہر ادارہ کی مذہبی، علمی اور ادبی کتابیں ہم سے طلب فرمائیں

مکتبہ دین و ادب۔ کچّا احاطہ۔ لکھنؤ ۱